

تالیف  
شیخ محمد باقر  
میرزا محمد باقر

مفاتیح  
العرفان

(جلد پنجم)

تالیف  
شیخ محمد باقر

میرزا محمد باقر

- \*سورہ ہود  
\*مضامین اور فضیلت  
\*اس سورہ کی معنوی تاثیر  
\*دعوت انبیاء کے چار اہم اصول  
\*دین و دنیا کا رشتہ  
\*شان نزول  
\*سب اسی کے مہمان ہیں  
\*چند اہم نکات  
\*تقسیم رزق اور زندگی کے لئے سعی و کوشش  
\*مقصد خلقت  
\*مومن عالی ظرف اور بے ایمان کم ظرف ہوتے ہیں  
\*چند توجہ طلب نکات  
\*۱۔ امت معدودہ اور یاران مہدی علیہ السلام:  
\*۲۔ کوتاہ فکری کے چار مظاہر  
\*۳۔ کم ظرفی کی انتہ  
\*۴۔ تمام نعمات عطیہ و بخشش ہیں  
\*۵۔ اعمال نیک کے اثرات  
\*قرآن ایک معجزہ جادواں  
\*چند اہم نکات  
\*۱۔ آیت ”لعل“ کا مفہوم:  
\*۲۔ آیات الہی کی تبلیغ میں تاخیر؟  
\*۳۔ آیت میں ”ام“ کا معنی:  
\*۴۔ معجزہ طلبی کا جواب:  
\*۵۔ قرآن کا چیلنج  
\*۶۔ پورا قرآن، دس سورتیں یا ایک سورت :  
\*۷۔ ”اِنَّ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ“ کے مخاطب:  
\*تفسیر  
\*۱۔ ایک اشکال کی وضاحت:  
\*۲۔ دنیا کی زینتیں  
\*۳۔ ”حبط“ کے بعد لفظ ”باطل“  
\*۴۔ ایک حدیث:  
\*تفسیر  
\*۱۔ آیت میں ”شاهد“ سے مراد  
\*۲۔ صرف تورات کی طرف اشارہ کیوں؟  
\*۳۔ ”فَلَا تَكُنْ فِي مَرِيَّةٍ“ میں مخاطب:  
\*سب سے زیادہ زیاں کار  
\*تفسیر  
\*دو قابل توجہ نکات  
\*۱۔ تین مربوط حقائق:  
\*۲۔ ”أَخْبَثُوا“ کا مفہوم :

\*حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم کی بلا دینے والی سرگزشت

\*انبیاء کے لفظ ”نذیر“

\*حضرت نوح کے جوابات

\*صاحب ایمان افراد کو دھتکارا نہیں جاسکتا

\*چند قابل توجہ نکات

\*۱۔ علم غیب اور خدا کے خاص بندے

\*۲۔ معیار فضیلت

\*۳۔ ایک اشکال کی وضاحت

\*کہاں ہے عذاب؟

\*ایک سوال اور اس کا جواب

\*۱۔ ”اِجْرَام“ کا مفہوم:

\*۲۔ آخری آیت کس کے بارے میں ہے؟

\*۳۔ ایک وضاحت:

\*معاشرے کو پاک کرنے کا مرحلہ

\*چند قابل توجہ نکات

\*۱۔ معاشرے کی پاکیزگی نہ کہ انتقام:

\*متکبرین کی نشانیاں:

\*۳۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کی کشتی:

\*آغاز طوفان

\*چند اہم نکات

\*۱۔ کیا طوفان نوح عالمگیر تھا:

\*۲۔ کیا نزول عذاب کے بعد توبہ ممکن ہے؟

\*۳۔ طوفان نوح میں عبرت کے درس

\*ایک داستان کا اختتام

\*پیسر نوح کا دردناک انجام

\*چند قابل توجہ نکات

\*۱۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کا بیٹا کیوں ”عمل غیر صالح“ تھا؟

\*۲۔ حضرت نوح (علیہ السلام) اپنے بیٹے کے بارے میں کیوں کر متوجہ نہ تھے؟

\*۳۔ جہاں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے

\*حضرت نوح (علیہ السلام) باسلامت اُتر آئے

\*چند اہم نکات

\*۱۔ انبیاء کے سچے واقعات

\*بہادر بت شکن

\*۱۔ تمام انبیاء کی دعوت کا خمیر توحید ہے

\*۲۔ سچے رہبر اپنے پیروکاروں سے جدا نہیں جاتے

\*۳۔ گناہ معاشرے کی تباہی

\*۴۔ ”یزدکم قوۃ الی قوتکم“ سے کیا مراد ہے؟

\*حضرت بود (علیہ السلام) کی قوی منطق

\*دو اہم نکات

\*اس ظالم قوم پر۔ ابدی لعنت

\*۱۔ قوم عاد تاریخ کی نگاہ میں

\*قوم ثمود کی داستان شروع ہوتی ہے

\*تفسیر

- \* مکتب کا رشتہ
- \* قوم نمود کا انجام
- \* چند اہم نکات
- \* ابراہیم بت شکن کی زندگی کے کچھ حالات
- \* تفسیر
- \* قوم لوط کی شرمناک زندگی
- \* چند قابل توجہ نکات
- \* ظالموں کی زندگی کا اختتام
- \* چند قابل توجہ نکات
- \* ہم جنس پرستی کی حرمت کا فلسفہ
- \* قوم لوط کا اخلاق
- \* حضرت شعیب (علیہ السلام) کی سرزمین۔ مدین
- \* بٹ دھرموں کی بے بنیاد منطق
- \* ایک دوسرے کو دھمکیاں
- \* مدین کے تباہ کاروں کا انجام
- \* فرعون کے ساتھ زبردست مقابلہ
- \* تفسیر
- \* سعادت مند و شقاوت مندیہ مشکلات؟
- \* چند قابل توجہ نکات
- \* استقامت کا دامن تھامے رکھو
- \* ظالموں پر بھروسہ نہ کرو
- \* نماز اور صبر
- \* نماز کی انتہائی اہمیت
- \* معاشروں کی تباہی کا سبب
- \* تفسیر
- \* چند نکات
- \* گزشتگان کے واقعات کے مطالعہ کے جار اثرات
- \* چند قابل توجہ نکات
- \* سورہ یوسف
- \* چند ضروری امور
- \* یہ داستان، ”احسن القصص“ ہے
- \* امید کی کرن اور مشکلات کی ابتدا
- \* اہم نکات
- \* چند خواب
- \* بہانیوں کی سازش
- \* چند نکات
- \* منحوس سازش
- \* رُسوا کُن جھوٹ
- \* چند اہم نکات
- \* ۱۔ ایک ترک اولیٰ کے بدلے
- \* ۲۔ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی دلکش دُعا
- \* ۳۔ ”واجمعوا ان يجعلوه فی غیابت الجب“ کا مفہوم
- \* ۴۔ تسویل نفس سے کیا مراد ہے؟

- \*۵۔ دروغ گو حافظہ ندارد
- \*۶۔ صبر جمیل کیا ہے؟
- \*سرزمین مصر کی جانب
- \*مصر کے محل میں
- \*چند اہم نکات
- \*مصر کی بیوی کا عشق سوزاں
- \*بربان پروردگار سے کیا مراد ہے؟
- \*چند اہم نکات
- \*نفس سے جہاد:
- \*۲۔ اخلاص کی جز
- \*۳۔ متین و پاکیزہ کلام
- \*زوجہ مصر کی رسوائی
- \*چند اہم نکات
- \*زوجہ مصر کی ایک اور سازش
- \*چند اہم نکات
- \*بے گناہی کے پاداش میں قید
- \*قید خانہ یا مرکزِ تربیت
- \*چند اہم نکات
- \*غیر خدا کی طرف توجہ
- \*بادشاہ مصر کا خواب
- \*چند اہم نکات
- \*یوسف پر الزام سے بری ہوگئے
- \*چند اہم نکات

#### تفسیر نمونہ جلد 09

تفسیر نمونہ ، آیہ اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) کی 15 سالہ زحمات کا نتیجہ ہے جس کو معظم لہ نے اہل قلم کی ایک جماعت کی مدد سے فارسی زبان میں تحریر فرمایا ، اس کا اردو اور عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شایع ہو چکا ہے۔

تعداد جلد: 15 جلد

زبان: اردو

مترجم : مولانا سید صفدر حسین نجفی (رح)

تعداد صفحات: 710

تاریخ اشاعت: ربیع الثانی 1417 ہجری



سورہ ہود

مضامین اور فضیلت

مفسرین میں مشہور ہے کہ تمام سورہ مگہ میں نازل ہوئی۔ ”تاریخ القرآن“ کے مطابق یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی انجاسویں سورت ہے۔ بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق یہ سورۃ ان آخری سالوں میں نازل ہوئی جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں تھے۔ یعنی حضرت ابوطالب (علیہ السلام) اور حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد لہذا فطرتاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ایک سخت ترین دور تھا اس بنا پر اس کہ اس زمانے میں دشمن کا دباؤ اور اس کا زہریلا پروپیگنڈا ہر دور سے زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ اس سورۃ کی ابتدا میں ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی دل جوئی اور تسلی کا پہلو رکھتی ہیں۔

اس سورۃ کی آیات کا اہم اور بیشتر حصہ گزشتہ انبیاء خصوصاً حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت جہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے لیے تسلی اور سکون قلب کا باعث تھا وہاں ان کے طاقتور دشمنوں کے لیے درس عبرت بھی تھا۔

اس سورۃ کی آیات باقی مکی سورتوں کی طرح معارف اسلامی کے اصولوں خصوصاً شرک و بت پرستی سے مبارزہ، بعد از موت کے معاملات اور دعوت پیغمبر اسلام کی صداقت کی تشریح پر مبنی ہیں۔ ان مباحث میں دشمنوں کو شدید انجام سے ڈرایا گیا ہے اور مومنین کو استقامت و پامردی کی تاکید کی گئی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے حالات اور دشمنوں سے نبرد آزمائی کی تفصیلات کے علاوہ حضرت ہود (علیہ السلام)، حضرت صالح (علیہ السلام)، حضرت ابراہیم (علیہ السلام)، حضرت لوط (علیہ السلام) اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی سرگزشت نیز شرک و کفر اور انحراف و ستم گری کے خلاف وسیع و طویل جنگ کی بابت اشارات بھی اس سورۃ میں موجود ہیں۔

اس سورۃ نے مجھے بوڑھا کر دیا

اس سورۃ کی آیات وضاحت کے ساتھ اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ مسلمانوں کو کبھی دشمنوں کی کثرت اور ان کے شدید حملوں کی وجہ سے میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہیئے بلکہ ہر لمحہ ان کی استقامت و پامردی میں اضافہ ہونا چاہیئے۔

اسی بنا پر ایک مشہور حدیث میں مذکور ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:  
شبیبتنی سورۃ ہود

سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ (۱)

یا جس وقت آپ کے صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ کے چہرہ انور پر بڑھاپے کے آثار زیادہ جلدی نمودار ہو گئے ہیں، تو فرمایا:

شبیبتنی ہود والواقعہ

سورۃ ہود اور سورۃ واقعہ نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ (۲)

اور بعض روایات میں سورۃ ”مرسلات، عم یتساء لون اور تکویر“ وغیرہ کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ (۳)  
ابن عباس سے اس حدیث کی تشریح میں منقول ہے:

رسول اللہ پر اس آیت سے زیادہ سخت اور دشوار کوئی اور آیت نازل نہیں ہوئی جس میں فرمایا گیا ہے:  
فَأَسْتَقِمَّ كَمَا أُمِرْتُ وَ مِنْ ثَابٍ مَعَكَ

یعنی تم اور تمہارے ساتھی اس طرح ثابت قدم رہیں جیسا کہ حکم دیا گیا۔ (۴)

بعض مفسرین سے منقول ہے کہ ایک عالم دین نے رسول اللہ کو خواب میں دیکھا تو آپ سے سوال کیا کہ یہ جو آپ سے مروی ہے کہ ”سورہ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا“ کیا اس کا سبب و علت گزشتہ امتوں کی سرگزشت اور ہلاکت بیان کرنا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس سبب ”فَأَسْتَقِمَّ كَمَا أُمِرْتُ“ والی آیت تھی۔ (۴)

بہر حال اس سورۃ میں علاوہ اس آیت کے، قیامت اور عدالتِ خداوندی میں باز پرس سے مربوط گزشتہ امتوں کی بلادینے والی سزاؤں سے متعلق اور فتنہ و فساد کے خلاف جنگ کے بارے میں احکام ہیں۔ یہ سب امور احساس مسئولیت پیدا کرتے ہیں۔ تعجب کی بات نہیں کہ ان ذمہ داریوں کے بارے میں غور و فکر انسان کو بوڑھا کر دے۔ ایک نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اس سورۃ کی بہت سی آیات ان مطالب کی تاکید کرتی ہیں، جو گزشتہ سورۃ یونس میں آچکے ہیں۔ خصوصاً اس کا آغاز بعینہ اس کے آغاز جیسا ہے اور بہت سے مواقع پر اس کا مقصد اور ماحول بھی انہی مسائل کی تاکید ہے۔

.....

۱. نور الثقلین جلد دوم، ص ۲۳۴۔
2. مجمع البیان اسی سورۃ کے آیت ۱۱۸ کے ذیل میں۔
3. روح المعانی جلد ۱۱، ص ۱۷۹۔
4. مجمع البیان اسی سورۃ کی آیت ۱۱۲ کے ذیل میں۔
5. روح المعانی جلد ۱۱، ص ۱۷۹۔

اس سورۃ کی معنوی تاثیر

اس سورۃ کی فضیلت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے آپ نے فرمایا: من قرء ہذہ السورہ اعطی من الاجر والثواب بعد من صدق ہوداً والانبیاء علیہم السلام، ومن کذب بہم، وکان یوم القیامۃ فی درجۃ الشهداء وحوسب حساباً یسیراً

جو شخص اس سورہ کی تلاوت کرے اس کی جزا اور ثواب ان اشخاص جیسا ہے جو حضرت ہود (علیہ السلام) اور باقی انبیاء پر ان کے جھٹلانے والوں اور منکرین کے مقابلے میں ایمان لائے۔ ایسا شخص قیامت کے دن شہداء میں سے قرار پائے گا اور اس کا حساب آسان و سہل ہوگا۔ (۱)

واضح ہے کہ خالی اور خشک تلاوت یہ اثر نہیں رکھتی بلکہ غور و فکر کے ساتھ کی گئی تلاوت ہی عمل کی جانب گامزن کرتی ہے اور یہ بات انسان کو مومنین ماسلف کے نزدیک اور منکرین انبیاء سے دور کر دیتی ہے۔ اسی بناء پر اسے ان میں سے ہر ایک کی تعداد کے برابر جزا ملے گی۔ فکر و معرفت کے ساتھ اس سورۃ کی تلاوت کرنے والا قاری چونکہ گزشتہ امتوں کے شہداء کے ساتھ ہم مقصد و یک ہدف ہوگا لہذا تعجب نہیں کہ وہ ان جیسا قرار پائے اور اس کا حساب کتاب (روزِ آخرت میں) آسان و سہل ہو جائے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

جو شخص یہ سورۃ اپنے پاس لکھ کر رکھے خدا اسے بے حد قوت و طاقت عطا فرمائے گا اور جس کے پاس یہ سورۃ تحریراً موجود ہو تو وہ جنگ میں دشمن پر غالب آئے گا یہاں تک کہ جو بھی اسے دیکھے گا اس سے خوف کھائے گا۔ (۲)

اگرچہ راحت طلب اور ظاہری مقاصد اخذ کرنے والے افراد اس قسم کی احادیث سے یہ مطلب نکالتے ہیں کہ صرف قرآن کی تحریر اور نقش کا ہمراہ ہونا ان مقاصد کے حصول کے لیے کافی ہے مگر درحقیقت ان کو اپنے پاس رکھنے سے مراد انہیں ایک دستور العمل اور زندگی کے پروگرام کے طور پر اپنے پاس رکھنا، اسے ہمیشہ پڑھتے رہنا اور بُوہُو اس کا اجرا کرنا ہے۔ لہذا یہ بات مسلم ہے کہ ایسا کرنے سے ہی نصرت و کامیابی کے آثار ظاہر ہوں گے، کیونکہ اس سورۃ میں استقامت و پامردی، فساد سے نفرت اور ہدف و مقصد سے ہم بستگی کا حکم اور گزشتہ اقوام کی تاریخ و تجربات کا بیشتر حصہ بیان کیا گیا ہے، ان میں سے ایک مذکورہ واقعہ دشمن پر کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کا درس دیتا ہے۔

.....

- ۱۔ تفسیر برہان جلد ۲، ص ۲۰۶۔
- ۲۔ تفسیر برہان جلد ۲، ص ۲۰۶۔

تفسیر نمونہ جلد 09

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
 ۱ اَلرَّ كِتَابُ اَحْكَمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ۔  
 ۲ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّیْ لَكُمْ مِنْهُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ۔

۳ وَأَنْ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ۔  
۴ إِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيرٌ۔

ترجمہ

”بخشنے والے مہربان خدا کے نام سے“

- ۱۔ یہ کتاب ہے کہ جس کی آیات مستحکم کی گئی ہیں پھر ان کی تشریح و تفصیل بیان کی گئی ہے، حکیم و آگاہ خدا کی طرف سے (یہ نازل ہوئی ہے)۔
- ۲۔ (میری دعوت یہ ہے کہ) خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو میں اس کی طرف سے تمہیں ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔
- ۳۔ اور یہ کہ اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو پھر اس کی طرف پلٹو تاکہ وہ اچھے طریقے سے تمہیں مدت معین تک (اس جہان کی نعمتوں سے) بہرہ مند کرے اور ہر صاحبِ فضیلت کو اس کی فضیلت کے مطابق عطا کرے اور اگر (اس فرمان سے) تم نے منہ موڑ لیا تو مجھے تمہارے لیے بہت بُرے دن کے عذاب کا خوف ہے۔
- ۴۔ (جان لو) تمہاری بازگشت اللہ کی طرف ہے اور وہ چیز پر قادر ہے۔

دعوت انبیاء کے چار اہم اصول

یہ سورۃ بھی گزشتہ سورۃ اور قرآن کی دیگر بہت سی سورتوں کی مانند اس عظیم آسمانی کتاب کی اہمیت کے بیان سے شروع ہو رہی ہے تاکہ لوگ اس کے مضامین کی طرف سے زیادہ متوجہ ہوں اور اسے زیادہ باریک بینی سے دیکھیں۔  
حروف مقطعات ”الر“ کا ذکر خود اس عظیم آسمانی کتاب کی اہمیت کی دلیل ہے، یہ کتاب باوجود اپنے اعجاز و عظمت کے معمولی حروف مقطعات جو کہ سب کے سامنے ہیں یعنی الف، لام، راء، سے تشکیل پائی ہے (الر)۔ (۱)  
حروف مقطعات کے بعد قرآن مجید کی ایک خصوصیت دو جملوں میں بیان کی گئی ہے، پہلی یہ کہ یہ ایسی کتاب ہے جس کی تمام آیات مستحکم ہیں (کِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ)۔ دوسری یہ کہ اس میں انسانی زندگی کی تمام انفرادی، اجتماعی، مساوی اور معنوی ضروریات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (ثُمَّ فَصَّلَتْ)۔  
یہ عظیم کتاب ان خصوصیات کے ساتھ اس خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو حکیم بھی ہے اور آگاہ بھی (مِنْ أُنْدُنْ حَكِيمٌ خَبِيرٌ)۔

اپنے حکیم ہونے کے تقاضے بناپہر اس نے آیاتِ قرآن کو محکم بیان کیا ہے اور خبیر و آگاہ ہونے کے تقاضے کے پیش نظر آیاتِ قرآنی کو انسانی ضروریات کے مطابق مختلف حصوں میں بیان فرمایا ہے۔ اس لئے کہ جب تک کوئی انسان کی تمام روحانی و جسمانی کی جزئیات سے باخبر نہ ہو وہ تکامل آفرین اور ارتقائی اہلیت کے حامل احکام صادر نہیں کر سکتا۔  
درحقیقت صفاتِ قرآن میں سے ایک، جو اس آیت میں آئی ہے، کا سرچشمہ خدا کی کوئی ایک صفت ہے، قرآن کا مستحکم ہونا خدا کی حکمت سے ہے اور اس کی تشریح و تفصیل اس کے باخبر ہونے کے باعث ہے۔  
”أُحْكِمَتْ“ اور ”فُصِّلَتْ“ میں فرق مفسرین قرآن نے ”أُحْكِمَتْ“ اور ”فُصِّلَتْ“ کے فرق میں بہت سی بحثیں کی ہیں اور کئی ایک احتمالات پیش کئے ہیں، لیکن مذکورہ آیت کے مفہوم سے نزدیک تر جو بحث سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے لفظ میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ قرآن ایک واحد مجموعہ ہے جو آپس میں پیوست ہے اور ایک محکم و استوار عمارت کی مانند ہے اور اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ خدا واحد و یکتا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس بناپہر اس کی آیات میں کسی قسم کا تضاد و اختلاف نظر نہیں آتا۔

دوسرا لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس کتاب میں باوجود وحدت و اکائی کے بہت سے شعبے اور شاخیں ہیں جو انسان کی تمام تر جسمانی و روحانی ضروریات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اسی بناپہر وحدت کے باوجود کثیر ہے اور کثرت کے باوصف واحد ہے۔

بعد والی آیت میں قرآن کا اہم ترین اور سب سے بنیادی موضوع یعنی توحید کا بیان اور شرک کا مقابلہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے ”أَلَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ“، یعنی میری پہلی دعوت یہ ہے کہ یکتا و یگانہ خدا کے کسی کی پرستش نہ کرو (2) یہ دراصل اس عظیم کتاب کے احکام کی پہلی تفسیر ہے۔

میری دعوت کا دوسرا پروگرام یہ ہے کہ: ”إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ“، یعنی میں تمہارے لئے اسی خدا کی طرف نذیر (ڈرانے والا) اور بشیر (خوشخبری دینے والا) ہوں، میں تمہیں نافرمانیوں، ظلم و فساد اور شرک و کفر کے بارے میں ڈراتا



ہوں اور تمہارے کرکوتوں کے عکس العمل اور خدائی عذاب و سزا سے خبردار کرتا ہوں، اطاعت و پاکیزگی اور تقویٰ کے بدلے میں تمہیں سعادت بخش زندگی کی بشارت دیت ہوں ( اِنِّیْ لَکُمْ مِنْهُ نَذِیْرٌ وَبَشِیْرٌ ) - میری تیسری دعوت یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے استغفار کرو اور اپنے کو آلودگیوں سے پاک و صاف رکھو (وَأَنْ اسْتَغْفِرُوا رَبَّکُمْ) -

میری چوتھی دعوت یہ ہے کہ اس کی طرف پلٹ آؤ اور استغفار کے نتیجہ میں گناہوں سے پاک ہو جانے کے بعد اپنے کو خدائی صفات سے آراستہ کرو کیونکہ اس کی جانب بازگشت اس کی صفات سے اپنے آپ کو مزین کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ( ثُمَّ تَوْبُوا إِلَیْهِ ) -

درحقیقت حق کی جانب دعوت دینے کے چار مراحل ان چار جملوں کے ذریعے بیان ہوئے ہیں کہ جن میں دو عقیدہ اور بنیاد سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے دو کا تعلق بنیاد کے اوپر والے حصے اور عمل سے ہے، حقیقی توحید قبول کرنا، شرک سے مبارزہ اور پیغمبر اکرم کی رسالت کو قبول کرنا اعتقادی اصول ہیں، اسی طرح اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کرنا اور صفات الہی کو اپنانا یعنی عملی لحاظ سے اپنی مکمل اصلاح کر لینا قرآن کے دو عملی احکام ہیں لہذا اگر صحیح معنوں میں غور و فکر کریں تو قرآن کے تمام موضوعات کا خلاصہ یہی چار اقسام و امور ہیں، یہی اس سورہ اور سارے قرآن کے موضوعات کی فہرست ہے، ان چار احکام کا ”موافقت“ یا ”مخالفت“ کی صورت میں عملی نتیجہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

جس وقت اس پرگرام کو عملی جامہ پہناؤ گے تو خدا تمہیں تمہاری عمر کے آخری لمحات تک اس دنیا کی سعادت بخش زندگی سے بہرہ ور کرے گا (يُمَتِّعُکُمْ مَّتَّاعًا حَسَنًا اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی) - اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر شخص کو اس کے عمل کے برابر بہرہ مند کرے گا اور ان چار اصولوں پر عمل کرنے کی کیفیت میں لوگوں کے فرق اور تفاوت کو کسی صورت نظر انداز نہیں کرے گا بلکہ ہر صاحبِ فضیلت کو اس کی فضیلت کے مطابق عطا کرے گا (وَيُؤْتِ کُلَّ ذِی فَضْلٍ فَضْلَهُ) -

لیکن اگر انسان نے راہِ مخالفت اختیار کی اور عقیدہ و عمل سے متعلق ان چار احکام کی نافرمانی کے راستے پر چلے تو میں تم پر اس عظیم دن (قیامت) کے عذاب سے ڈرتا ہوں، وہ دن کہ جس میں تم عدلِ الہی کی عظیم عدالت میں حاضر ہو گے (وَإِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ کَبِیْرٍ) - بہر حال جان لیجئے کہ تم جو کچھ بھی ہو اور جس مقام و منزلت پر فائز ہوں آخر کار تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے (اِلٰی اللّٰهِ مَرْجِعُکُمْ) - یہ جملہ قرآن کے تفصیلی اصولوں میں سے یعنی مسئلہ معاد و قیامت کی طرف اشارہ ہے -

لہذا یہ کبھی نہ سوچنا کہ تمہاری قوت خدا کی قوت و قدرت کے مقابلہ میں کوئی اہمیت رکھتی ہے یا سمجھنے لگو کہ تم اس کے فرمان اور اس کی عدالت کے کٹہرے سے فرار حاصل کر سکو گے، نیز یہ تصور بھی نہ کرنا کہ وہ تمہاری بوسیدہ ہڈیوں کو موت کے بعد جمع نہیں کر سکتا اور نئی حیات کا لباس پہنا سکتا، اس لئے کہ وہ تو ہر چیز پر قادر و توانا ہے (وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ)

- ۱۔ اس معنی کی تفصیل اور قرآن کے حروف مقطعات کی دیگر تفاسیر سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف کی ابتداء میں مذکورہ وچکی ہیں -
2. ”اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ“ کے بارے میں دو احتمال پیش کیے گئے ہیں پہلا یہ کہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ زبانِ پیغمبر سے ہے اور اس کی ترکیب یہ ہوگی: ”دعوتی وامری الاتعبدوا الا اللہ“ - دوسرا یہ کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: امرکم الا تعبدوا الا اللہ۔ لیکن جملہ ”اننی لکم منہ نذیر و بشیر“ (میں تمہیں ڈرانے اور خوشخبری سنانے والا ہوں) پہلے معنی سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے -

دین و دنیا کا رشتہ

ابھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو گمان کرتے ہیں کہ دینداری فقط آخرت کا گھر آباد کرنے اور بعد از موت راحت و سکون حاصل کرنے کے معنی میں ہے اسی طرح اعمال نیک آخرت کا ثمر اور زادراہ ہیں، ایسے لوگ اس جہان کی اصل زندگی میں ایک پاکیزہ اور حقیقی مذہب کے اثر سے بے اعتنا ہیں یا اس کے لئے کم اہمیت کے قائل ہیں حالانکہ مذہبِ آخرت کا گھر آباد کرنے سے پہلے دنیاوی گھر آباد کرنے والا ہے اور اصولاً جب تک مذہبِ اس زندگی میں اثر انداز نہ ہو اس زندگی کے لئے اس کی کوئی تاثیر نہ ہوگی -

قرآن صراحت کے ساتھ بہت سی آیات میں اس موضوع کو اپنا عنوان قرار دیا ہے، یہاں تک کہ بعض جزوی مسال کو بھی اہمیت دی ہے جیسا کہ سورہ نوح میں ہے کہ اس عظیم پیغمبر نے اپنی قوم سے یوں فرمایا:

اور اپنے گناہوں سے استغفار کرو اور توبہ کے پانی سے انہیں دھو ڈالو کہ خدا بخشنے والا ہے تاکہ وہ بے درپے تم پر آسمان کی برکتیں نازل کرے اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کرے اور سرسبز باغات کی اور پانی کی نہریں تمہارے قبضہ دے دے (نوح/۱۱، ۱۰، ۱۲)

بعض لوگ دینا کی ان مادی نعمات اور استغفار و گناہ سے پاک ہونے کے درمیان صرف ایک معنوی رتہ سمجھتے ہیں جو سمجھ نہیں آسکتا، حالانکہ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ ان امور کی ایسی تفسیر کی جائے جو سمجھ میں آنے والی نہ ہو، کون شخص اس حقیقت میں شک رکھتا ہے کہ حقیقی توحید کو قبول کرنے، انبیاء کی رہبری میں الہی معاشرے کا قیام، ماحول کو گناہوں سے پاک کرنے اور انسان قدروں سے آراستہ کرنے، (یعنی وہ چار اصول جن کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے) ان پر عمل پیرا ہونے سے معاشرہ تکامل اور ارتقاء کی جانب بڑھتا ہے اور امن و سلامتی اور صلح و صفا سے معمور ایک آباد و آزاد معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

اسی بناء پر مذکورہ بابا آیات میں ان چار اصولوں کے تذکرے کے بعد ہم پڑھتے ہیں:

اگر ان اصولوں پر کاربند ہو جاؤ تو آخری عمر تک شائستہ اور نیک طرز زندگی سے بہرہ مند رہو گے۔

#### تفسیر نمونہ جلد 09

۵ أَلَا إِنَّهُمْ يَبْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشَوْنَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ

ترجمہ

۵۔ آگاہ رہو کہ جب وہ (اپنے سروں کو ایک دوسرے کے نزدیک اور) سینوں کو ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو (اور اپنی باتوں کو) اس (پیغمبر) سے پوشیدہ رکھیں، آگاہ رہو کہ جب وہ اپنے لباس کو اپنے اوپر لپیٹ لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اس میں چھپ لیتے ہیں (خدا) ان کے ظاہر اور باطن سے باخبر ہے کیونکہ وہ سینوں کے اندر کے رازوں سے آگاہ ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین نے اس آیت کے لئے کئی شان نزول ذکر کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق منافق کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو نہایت شیرین زبان تھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دوستی اور محبت کا اظہار کرتا مگر باطن میں دشمنی اور عداوت رکھتا تھا۔

نیز جابر بن عبد اللہ نے امام باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ مشرکین کا ایک گروہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سے گزرتا تو اپنے سروں کو نیچے کر لیتا یہاں تک کہ اپنے سر کو لباس سے چھپالیتا تاکہ پیغمبر انہیں دیکھ نہ لیں، یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔

تفسیر

یہ آیت بطور کلی اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کے احمقانہ فعل کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اپنی نفاق آمیز اور حق سے گریزاں روش سے چاہتے تھے کہ اپنی ذات کو دوسرے کے نظروں سے پنہاں رکھیں تاکہ کہیں حق کی آواز نہ سن لیں، لہذا فرمایا گیا ہے: آگاہ رہو کہ وہ پیغمبر کی دشمنی کو دلوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں اور سروں کو نیچے کئے ہوئے سینوں کو آگے سے خم کرتے ہیں تاکہ خود کو آنحضرت کی نظر سے پوشیدہ رکھیں (أَلَا إِنَّهُمْ

يَتُّونَ صُدُورَهُمْ لَيَسْتَنْخَفُوا مِنْهُ) -

اس آیت کے معنی کو طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ لفظ ”يَتُّونَ“ کا مفہوم پورے طور پر واضح ہو، ”يَتُّونَ“ کا مادہ ”تتی“ (بروزن سنگ) ہے جو دراصل کسی چیز کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے نزدیک کرنے کے معنی میں آیا ہے مثلاً لباس تہ کرنے کے لئے ”تتی ثوبہ“ کہا جاتا ہے اور یہ افراد کو ”انسان“ کہا جاتا ہے اس بناء پر ہے کہ ہم ان میں سے ایک کو دوسرے کے پہلو میں قرار دیتے ہیں، مداحی اور قصیدہ گوئی کو ”تناخوانی“ بھی اس بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ ممدوح کی صفات برجستہ یکے بعد دیگرے شمار کی جاتی ہیں، نیز یہ مادہ خم ہونے اور جھکنے کے معنی میں بھی آیا ہے اس کے انسان اس کام سے اپنے بدن کے کچھ حصوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے، اسی طرح کینہ و عداوت رکھنے کے معنی میں بھی بیان کیا گیا ہے کیونکہ اس طرح انسان کبھی کسی شخص یا چیز کی دشمنی کو دل کے نزدیک کر لیتا ہے، یہ تعبیر بھی عربی ادب میں ملتی ہے -

”اثنونی صدره علی البغضاء“

اس نے میرا کینہ دل میں رکھا -

جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس پر توجہ دینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ممکن ہے مندرجہ بالا تفسیر دشمنان پیغمبر کی ظاہری و باطنی مخالفت اور ہر قسم کی خفیہ یا سازشوں کی طرف اشارہ ہو، اس لئے کہ ایک طرف تو دل میں بغض و کینہ اور دشمنی رکھنے کے باوجود ظاہراً شیرین زبان سے اظہار دوستی کرتے تھے اور دوسری جانب گفتگو کرتے وقت سروں کو ایک دوسرے کے قریب اور سینوں کو پیچھے کی طرف کئے ہوئے یہاں تک کہ اپنے لباسوں کو بھی سر پر لے لیتے ہیں، تاکہ اشارہ و کنایہ میں بدگوئیاں اور سازشیں کرسکیں اور کوئی شخص ان کے رازوں سے آگاہ نہ ہو، لہذا قرآن بلافاصلہ آگاہ کرتا ہے کہ ”آگاہ رہو جس وقت وہ اپنے آپ کو اپنے لباسوں میں چھپالیتے ہیں (الْأَجِينَ يَسْتَعْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسْرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ) - پروردگار ان کے ظاہر و پنهان سب کو جانتا ہے اس لئے کہ وہ ان کے سینوں (اندر) کے بھیدوں سے واقف ہے (إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ) -

۶ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ

ترجمہ

۶- اور زمین میں حرکت کرنے والی چیز نہیں مگر یہ کہ اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے اور وہ اس کی جائے قیام اور نقل و حرکت کے مقام کو جانتا ہے یہ سب کچھ واضح کتاب (علم خدا کی لوح محفوظ) میں ثبت شدہ ہے -

سب اسی کے مہمان ہیں

گزشتہ آیت میں پروردگار کے علم کی وسعت اور ہر آشکار و پنهان چیز پر اس کے احاطہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، زیر بحث آیت در حقیقت اس امر کی دلیل ہے کیونکہ اس میں تمام موجودات عالم کو خدا کی طرف سے روزی دینے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور یہ ایسا کام ہے جو تمام موجودات عالم کے کامل احاطہ علمی کے بغیر ممکن نہیں، اسی لئے خداوند عالم فرماتا ہے: رُوْرُے زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی روزی اس کے ذمہ نہ ہو وہ انسان کی جائے قرار کو جانتا ہے اور اپنی قار گاہ سے جن نقاط کی طرف منتقل ہوتا ہے اس سے بھی باخبر ہے، نیز ایک جاندار جہاں کہیں بھی ہو اس تک روزی پہنچاتا ہے (وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا) - یہ تمام حقائق اپنی تمام حدود و قیود کے ساتھ کتاب مبین اور علم خدا کی لوح محفوظ میں ثبت ہیں (كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ) -

چند اہم نکات

۱- ”دابہ“ لفظ دبیب سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ چلنا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانا لیکن لغوی مفہوم کے لحاظ سے ہر قسم کی حرکت اس میں شامل ہوتی ہے، کبھی کبھار ان معانی کا اطلاق گھوڑے یا سواری کے دیگر جانوروں پر بھی کیا جاتا ہے، چنانچہ واضح ہے کہ زیر بحث آیت میں تمام زندہ موجودات کو شامل کیا گیا ہے -

۲- ”رزق“ مسلسل عطا کے معنی میں آیا ہے اور چونکہ موجودات عالم کے لئے خدا کی دی ہوئی روزی اس کی طرف سے پائیدار اور مسلسل عطا ہے لہذا اسے ”رزق“ کہا جاتا ہے، اس نقطہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ عطا و بخشش کا مفہوم صرف مادی ضروریات پورا ہوجانے کے معنی میں مقید نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی مادی و معنوی عطا اس میں شامل ہے اسی لئے تو ہم کہتے ہیں:

”اللهم ارزقني علماً تاماً“  
خدایا! مجھے کامل علم عطا فرما۔

یا کہتے ہیں:  
”اللهم ارزقني شهادة في سبيلك“

خدایا! اپنی راہ مجھے شہادت نصیب فرما۔

البتہ ممکن ہے کہ زیر بحث آیت میں مادی رزق کو مدنظر رکھا گیا ہو اگرچہ اس کا عمومی مفہوم بھی زیادہ بعید نہیں ہے۔  
۳۔ ”مستقر“ در اصل قرار گاہ کے معنی میں ہے، کیونکہ اس لفظ کی بنیاد مادہ ”قر“ (بروزن حر) ہے جس کا مطلب ہے سخت سردی جو انسان اور دیگر موجودات زندہ کو خانہ نشین بنادیتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ سکون اور توقف کے معنی میں بھی آیا ہے۔

”مستودع“ اور ”ودیعہ“ ایک ہی مادہ سے ہیں جو درحقیقت کسی کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے، وہ تمام امور جو اپنی ناپائیداری سے اصلی اور پائیدار حالت کی طرف پلٹ جاتے ہیں ان کو ”مستودع“ کہا جاتا ہے اور ”ودیعہ“ بھی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آخر کار اسے اپنے موجودہ محل و مقام کو چھوڑ کر اپنے اصلی مالک کی طرف پلٹ جانا ہے۔  
حقیقت میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ تصور ہرگز نہ کیا جائے کہ خدا صرف ان حرکت کرنے والوں کو روزی دیتا ہے جو اپنی اصل پر برقرار ہیں اور اصطلاح کے مطابق ان کا حصہ ان کے گھروں میں لے آتے ہیں، بلکہ جہاں کہیں بھی ہوں اور جس کیفیت و حالت میں ہوں ان کی روزی اور رزق کا حصہ انہیں عطا کرتا ہے، اس لئے کہ وہ ان (موجودات) کی اصلی قرار گاہ کو بھی جانتا ہے اور جہاں جہاں وہ نقل مکانی کرتے ہیں ان تمام خطوں سے باخبر ہے اس نے غول پیکر دریائی جلانوروں سے لے کر بہت ہی باریک اور آنکھ سے نظر نہ آنے والے جانداروں کے لئے بھی ان کے مناسب رزق مقرر کر دیا ہے۔

یہ رزق اس قدر حساب شدہ اور موجودات کے مناسب حال ہے کہ ”مقدار“ اور ”کیفیت“ کے لحاظ سے کاملاً ان کی خواہشات و ضروریات کو پورا کرتا ہے یہاں تک کہ اس بچہ کی غذا کو شکم مادر میں ہے ہر ماہ ہر دن دوسرے مہینوں اور دنوں سے مختلف ہے اگرچہ ظاہری طور پر ای قسم کے خون سے زیادہ نہیں نیز بچہ شیرخواری کے زمانے میں باوجودیکہ ظاہراً بچے کے کئی ماہ تک اس کی ایک قسم کی غذا (دودھ) ہوتی ہے مگر اس دودھ کی ترکیب بھی پہلے دن سے مختلف ہوتی ہے۔

۴۔ ”کتاب مبین“ کا مطلب ہے کہ واضح و آشکار تحریر اور یہ اشارہ ہے پروردگار کے وسیع علم کے ایک مرحلہ کی جانب کہ جسے کبھی کبھی اپنی روزی حاصل کرنے کے سلسلے میں معمولی سے معمولی پریشانی بھی نہیں ہونی چاہیے اور وہ یہ تصور نہ کرے کہ اپنی روزی کا حصہ لینے میں کبھی اس کا نام درج ہونے سے رہ جائے گا، اس لئے کہ تمام موجودات اراضی و سماوی کے نام اس کتاب میں درج ہیں کہ جس میں اس کا نام سب کو شمار اور ضریحاً بیان کیا گیا ہے، اسی طرح جیسا کہ اگر ایک ادارہ میں کام کرنے والے تمام ملازمین کا نام ایک رجسٹر میں واضح طور پر درج کیا گیا ہو تو کیا ان کا قلم سے رہ جانے کا احتمال ہوسکتا ہے؟۔

تقسیم رزق اور زندگی کے لئے سعی و کوشش

رزق کے بارے میں بہت سی اہم بحثیں موجود ہیں جن میں سے ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ”رزق کے لغوی معنی استمراری اور دائمی بخشش کے ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ مادی یا روحانی و معنوی، بنا بریں ہر وہ منفعت جو خدا اپنے بندوں کو نصیب کرے، غذائی مواد، مکان اور لباس میں سے یا علم و عقل، فہم و ایمان اور اخلاص میں سے، ان سب کو رزق کہا جاتا ہے، جو لوگ اس مفہوم کو صرف مادی پہلو میں محدود کرتے ہیں انہوں نے اس کے استعمال کے مواقع کی طرف دقیق توجہ نہیں کی، قرآن مجید راہ حق میں شہید ہونے والوں کے بارے میں کہتا ہے:

وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق حاصل کرتے ہیں (آل عمران/۱۶۹)

واضح رہے کہ شہداء کی روزی اور وہ بھی عالم برزخ میں مادی نعمتیں نہیں بلکہ وہی روحانی و معنوی عنایات ہیں جن کا تصور کرنا ہمارے لئے اس مادی زندگی میں مشکل ہے۔

۲۔ زندہ موجودات کی ضروریات یا دوسرے لفظوں میں ان کا رزق مہیا کرنے کا معاملہ سب سے زیادہ توجہ طلب مسائل میں سے ہے اس کے اسرار سے وقت گزرنے اور سائنسی پیش رفت کے ساتھ ساتھ پردہ اٹھ رہا ہے، سائنس اس سلسلے

میں تعجب انگیز امور منکشف کر رہی ہے -

گزشتہ زمانے میں تمام سائنسدان اس فکر میں تھے کہ اگر سمندروں اور دریاؤں کی تہوں میں زندہ موجودات موجود ہیں تو ان کی غذا کس راستے سے ان تک پہنچتی ہوگی کیونکہ غذاؤں کی اصلی بنیاد تو نباتات ہیں جنہیں سورج کی روشنی کی ضرورت ہے جبکہ دریاؤں کی گہرائیوں میں ۷۰۰ میٹر سے آگے مطلقاً روشنی کا وجود نہیں اور اس سے آگے تو گویا ایک ابدی تاریک رات ہے لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ سورج کی روشنی نباتات اور سبزے کے باریک ذرات کی سطح آب اور موجوں کے بستر پر پرورش کرتی ہے اور جب وہ اپنے تکامل و ارتقاء کا مرحلہ طے کر لیتے ہیں تو پکے ہوئے پھل کی مانند دریاؤں کی گہرائیوں اور تہوں میں چلے جاتے ہیں اور وہاں زندہ موجودات کے لئے خوان نعمت ثابت ہوتے ہیں۔ دوسری طرف بہت سے پرندے دریائی مچھلیوں کو اپنی غذا بناتے ہیں حتیٰ کہ کئی قسم کے رات کو پرواز کرنے والے پرندے موجود ہیں جو رات کی تاریکی میں ایک ماہر غوطہ خور کی طرح اپنے شکار کو، جسے مخصوص امواج ریڈار کی طرح پہنچاتی ہیں اور اس کی نشاندہی کرتی ہیں، باہر لے آتے ہیں۔

بعض پرندوں کی روزی عظیم الجثہ دریائی جانوروں کے دانتوں کے اندر چھپی ہوتی ہے، یہ حیوانات دوسرے دریائی جانوروں کے بطور غذا کھانے کے بعد اپنے دانتوں میں ”طبیعی خلال“ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ساحل کی طرف آتے ہیں اور اپنے منہ کو جو ایک چھوٹی غار سے مشابہت رکھتا ہے کھلا چھوڑ دیتے ہیں وہ پرندے جن کی روزی خدا نے یہاں رکھی ہے بغیر کسی ڈر خوف کے اس غارنمار منہ میں داخل ہوجاتے ہیں، اور اس دیو پیکر جانور کے منہ سے اپنی روزی تلاش کر لیتے ہیں، اس تیار غذا سے جہاں پرندے شکم سیر ہوتے ہیں وہاں اس جانور کو بھس ضرر رساں مادوں سے نجات دلاتے ہیں، چنانچہ جب دونوں فریضوں کا مقصد پورا ہوجاتا ہے تو پرندے باہر پرواز کرجاتے ہیں اور وہ حیوان آرام و سکون کا احساس کرتے ہوئے اپنا منہ بند کر لیتا ہے اور واپس دریا کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے۔

مختلف موجودات کو روزی بہم پہنچانے کے لئے خداوندعالم کا طریقہ و تدبیر واقعاً حیرت انگیز ہے وہ نطفہ جو شکم مادر میں برقرار ہے، سے لے کر قسم قسم کے حشرات الارض تک، جو زمین کی تاریک گہرائیوں، پُرپیچ راستوں، درختوں کی چھالوں، پہاڑوں کی چوٹیوں اور دروں کی پہنائیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اس خداوندعظیم کے علم و بینش سے برگز مخفی نہیں ہیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے کہ خداوند ان کی قرار گاہ اور حقیقی مسکن سے بھی آگاہ ہے وہ ان کے چلنے پھرنے کی جگہ کو بھی جانتا ہے اور جہاں کہیں بھی ہوں ان کی روزی ان تک پہنچاتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر نظر آیت میں روزی حاصل کرنے والوں کے بارے میں بحث کے دروان انہیں ”دابۃ“ (پھرنے والے) اور ”جنیدہ“ (حرکت کرنے والے) سے تعبیر کیا گیا ہے جو ”توانائی“ (ENERGY) اور ”حرکت“ (MOTION) میں رابطہ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی حرکت وجود میں آتی ہے وہ توانائی پیدا کرنے والے مادہ کی محتاج ہوتی ہے یعنی وہ مادہ جو حرکت کا منشاء ہے، اسی لئے قرآن بھی زیر بحث آیات میں کہتا ہے کہ خدا تمام متحرک موجودات کو روزی دیتا ہے۔ اگر حرکت کی اس وسیع تر معنی میں تفسیر کریں تو پھر نباتات بھی اس میں شامل ہوں گے کیونکہ وہ بھی نشو و نما میں ایک دقیق و باریک حرکت رکھتے ہیں اسی بناء پر فلسفہ میں حرکت کی ایک قسم ”نمو“ بھی شمار کی گئی ہے۔

۳۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر شخص کی روزی اس کی ابتداء سے لے کر آخر عمر تک مقرر و معین ہے اور چاہتے نہ چاہتے اس تک پہنچے گی؟ یا یہ کہ اس کے پیچھے نکلنا چاہیے، بقول شاعر شرط عقل است جستن از درہایعنی عقل کے لئے شرط ہے کہ اس سے کے دروازوں سے ڈھونڈا جائے۔

بعض سست بے حال لوگ اس آیت کی مذکورہ تعبیر ان روایات کا سہارا لیتے ہوئے جو روزی کی مقدار اور اس کے تعین کے بارے میں کچھ بیان کرتی ہیں، یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ انسان تلاشِ معاش اور روزی مہیا کرنے کے لئے زیادہ سعی و کوشش کرے یا اس کی تلاش میں نکلے کیونکہ روزی انسان کا مقدر ہے اور وہ ہر حالت میں اس تک پہنچے گی اور کوئی بھی شخص روزی سے محروم نہیں رہے گا۔

اس طرح کے نادان افراد جن کو دین و مذہب کے بارے میں بہت کم معرفت ہوتی ہے، دشمنوں کو بہانہ پیدا کرنے کا موقع دیتے ہیں کہ مذہب اقتصادی کساد کا حامل ہے، جو زندگی میں شامل ہوتی تو بے چون و چرا مجھے مل جاتی، استثمار گروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ یہ ایک اچھا بہانہ لگا کہ جتنا ہوسکے محروم طبقوں کا خون چوشیں اور انہیں زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم رکھیں۔

حالانکہ قرآن اور احادیثِ اسلامی سے معمولی سی آشنائی بھی اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام ہر قسم کی مادی و معنوی منفعت کے حصول کے لئے کی جانے والی کوششوں کو مثبت شمار کرتا ہے، یہاں تک کہ قرآن کہتا ہے:

”لَیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى“

انسان کے لئے کچھ نہیں ماسوا اس کے جتنی اس نے کوشش کی۔ اس فرمان میں انسان کے فائدہ و منفعت کو اس کی کوشش اور کام میں قرار دیا گیا ہے، ہادیان اسلام دوسروں کے لئے نمونہ عمل مہیا کرنے کے لئے سخت محنت سے کام کرتے تھے، انبیاء ماسلف بھی اس کام سے مستثنیٰ نہ تھے انہوں نے چرواہوں کا کام کیا، کپڑے سینے، نیزہ زہ بنانے اور ہل چلانے تک کے طاقت آزما کام سرانجام دیئے، پس اگر خدا کی طرف سے رزق بہم پہنچانے کا ضامن ہونے سے مراد گھر بیٹھے رہنا اور روزی پہنچنے کا انتظار کرنا ہوتا تو انبیاء (علیہ السلام)، ائمہ (علیہ السلام) جو تمام انسانوں سے زیادہ عالم اور مفاہیم دین سے آشنا تھے تلاش رزق میں کوشش و جستجو نہ کرتے۔

بنابریں ہم یہ تو کہتے ہیں کہ ہر خص کی روزی مقدر اور مسلم ہے لیکن مشروط ہے اس کی تلاش و کوشش سے لہذا جہاں کہیں یہ شرط پوری نہیں ہوگی مشروط بھی دستیاب نہیں ہوگا، یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ ہر شخص کی ایک اجل ہے اور اس کی عمر کی مقدار معین ہے، واضح طور پر اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بدن ایک مناسب مدت تک باقی رہنے کی استعداد رکھتا ہے بشرطیکہ حفظان صحت کے اصولوں کا لحاظ رکھا جائے اور ضرر رساں اشیاء سے پرہیز کیا جائے نیز جو چیزیں موت کی جلدی کا سبب بنتی ہیں ان سے دور رہے۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ آیات و روایات جو روزی کے معین ہونے سے مربوط ہیں دراصل ایک ”بریک“ اور حد ہیں، ان حریص اور دنیا پرست لوگوں کے لئے جو زندگی گزارنے کے لئے ہر دروازہ کھٹکھٹاتے پھرتے ہیں اور ہر ظلم و ستم و بددیانتی کا ارتکاب کرتے ہیں اس گمان پر کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کی زندگی اچھی نہیں گزر سکتی، آیات قرآنی اور احادیث اسلامی ایسے افراد کو خبردار کرتی ہیں کہ بے کار ہاتھ پاؤں نہ ماریں اور روزی کمانے کے لئے غیر شرعی اور غیر معقول ذرائع استعمال نہ کریں، بلکہ شرعی طریقے سے سعی و کوشش کرتے ہوئے مطمئن رہیں کہ خدا اس راستے سے ان کی تمام حاجات پوری کر دے گا، وہ خدا کہ جس نے انہیں ظلمت کدہ رحم میں فراموش نہیں کیا اور وہ خدا کہ جس نے بچپن میں جب انسان اس دنیا کے موادِ غذائیہ کی تغذیہ کی توانائی نہیں رکھتا تھا اس کی مہربان ماں کے پستانوں میں اس کی روزی مہیا کی، وہ خدا جس نے شیر خواری کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی جبکہ انسان ناتواں تھا اس کی روزی اس کے مہربان باپ کے ہاتھ میں رکھی جو صبح و شام اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی خوش ہو کہ میں اپنی اولاد کو غذا مہیا کرنے کے لئے زحمت و مشقت اٹھاتا رہا۔

لہذا کس طرح ممکن ہے کہ جب انسان بڑا ہو جائے اور ہر قسم کے کام کی توانائی اور قدرت حاصل کر لے خدا اسے بہلا دے، کیا عقل و ایمان اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ انسان اس گمان پر کہ ممکن ہے اس روزی فراہم نہ ہو، گناہ، ظلم و ستم اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرے اور حریص بن کر مستضعفین اور کمزوروں کا حق غصب کرے۔

البتہ اس چیز کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رزق ایسے ہیں کہ انسان ان کے آگے پیچھے بھاگے یا نہ وہ اس کے پیچھے آتے ہیں مثلاً سورج کی روشنی جو ہماری تلاش و کوشش کے بغیر ہمیں میسر ہے اور ہمارے گھر روشن کرتی ہے، کیا اس کا انکار ممکن ہے کہ بارش اور ہوا بغیر ہماری جدوجہد اور کوشش کی ہماری تلاش میں آتی ہے کیا اس بات کا انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہ عقل و ہوش اور قوت و استعداد جو روزِ اول سے ہمارے وجود میں رکھ دی گئی تھی ہمیں اس کے لئے جستجو نہیں کرنا پڑی۔

لیکن اس طرح کی نعمتیں جو ہوا کے جھونکے کے ساتھ مل گئیں یا یہ کہ وہ نعمتیں جو کہ کوشش کے بغیر ہاتھ سے نکل جائیں گی یا بے اثر ہو کر رہ جائیں گی۔

حضرت علی علیہ السلام سے ایک مشہور حدیث نقل ہوئی ہے آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

”واعلموا یا بنی! ان الرزق ورزقان تطلبہ ورزق یطلبک“

اے فرزند جان لو! رزق دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ تو جس کی جستجو میں نکلے اور ایک وہ جو تجھے تلاش کرتے ہوئے تیرے پیچھے آئے۔ (۱)

امام علیہ السلام کا یہ فرمان بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اکثر اوقات انسان کسی نعمت یا ضرورت کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوتا مگر حادثات و اتفاقات کے ایک وسیع سلسلہ کے باعث کوئی نعمت اسے نصیب ہو جاتی ہے یہ حوادث اگرچہ ہماری نظر میں اچانک اور اتفاقیہ ہیں لیکن درحقیقت وہ صاحبِ تجلیق کے حساب و کتاب کے عین مطابق ہیں، بلاشبہ اس قسم کی روزی کا حساب اس روزی کی طرف اشارہ ہو۔

بہر حال نکتہ اساسی یہ ہے کہ تمام تعلیمات اسلامی میں ہمیں متوجہ کرتی ہیں کہ بہترین زندگی گزارنے کے لئے چاہے وہ مادی ہو یا معنوی زیادہ سے زیادہ کوشش و جستجو کرنی چاہیے اس لئے کہ کام سے فرار کا یہ جواز غلط ہے کہ روزی تو

مقسوم میں لکھی ہے اور مل کر رہے گی -

۴۔ زیر بحث آیات میں فقط ”رزق و روزی“ کی طرف اشارہ ہوا ہے حالانکہ بعد کی چند آیات میں جہاں پر توبہ کرنے والے بالایمان افراد کا ذکر ہے ”متاع حسن“ یعنی شائستہ و مناسب منفعت اور فائدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان دونوں کا مدمقابل ہونا ہمیں یہ بات سمجھاتا ہے کہ تمام حرکت کرنے والوں کے لئے وہ انسان ہوں یہ حیوان، حشرات الارض ہوں یا درندے، نیک ہوں یا بد سب کے لئے رزق کا حصہ معین ہے، لیکن متاع حسن اور شائستہ و گرانہا نعمتیں صرف صاحبان ایمان کے ساتھ مخصوص ہیں جنہوں نے خود کو آب توبہ سے ہر قسم کے گناہ اور آلودگی سے پاک کر لیا ہے اور جو خدائی نعمتوں کو اس کے احکامات کی اطاعت کے تابع رہ کر استعمال کرتے ہیں نہ کہ ہوا و بوس اور سرکشی کی راہ میں -

.....

۱۔ نہج البلاغہ، امام (علیہ السلام) کی اپنے فرزند امام حسن (علیہ السلام) کے نام وصیت۔

تفسیر نمونہ جلد 09

۷ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَلَئِنْ قُلْتُمْ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ

ترجمہ

۷۔ وہ ایسی ذات ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دنوں (چھ ادوار) میں خلق کئے اور اس کا عرش (قدرت) پانی پر ہے (اور یہ اس لئے پیدا کیا) تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کس کا عمل بہتر ہے اور اگر تم کہو کہ موت کے بعد دوبارہ مبعوث ہو گے (اور قبروں سے اٹھو گے) تو یقیناً کافر کہیں گے کہ یہ کھلا جادو ہے -

مقصدِ خلقت

اس آیت میں تین اساسی نکات پر بحث کی گئی ہے، اول جہان ہستی کی آفرینش، خصوصاً آغاز آفرینش کہ جو پروردگار کی قدرت کی نشانی اور اس کی عظمت کی دلیل ہے، ”وہ ایسی ذات ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا“ (وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ)۔

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہاں دن سے مراد چوبیس گھنٹے والا دن ہے اس لئے کہ جس زمانے کی بات ہو رہی ہے اس وقت زمین و آسمان وجود میں آئے تھے نہ کہ ارض تھا اور نہ ہی اس کی اپنے گرد چوبیس گھنٹوں کی گردش، بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس سے مراد ایک ”دورانیہ“ ہے اب خواہ یہ دورانیہ چھوٹا ہو یا بہت طویل اور کروڑوں سالوں پر مشتمل ہو، سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں اس بات کی جامع اور مفصل تشریح بیان کی جا چکی ہے لہذا تکرار کی ضرورت نہیں ہے - (۱)

نیز وہاں ہم نے یاد دہانی کروائی تھی کہ خدا قدرت و طاقت رکھتا تھا کہ تمام عالم کو ایک ہی لحظہ میں پیدا کرے لیکن متواتر اور پے درپے چھ ادوار میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ یہ تدریجی خلقت جو ہر وقت رنگ نو اور چہرہ تازہ دکھاتی ہے، قدرت و عظمتِ خداوندی کو بیشتر اور بہتر انداز میں متعارف کرواتے ہے -

خدا چاہتا تھا کہ اپنی قدرت کو ہزاروں رُخ میں نمایاں کرے ایک ہی رُخ میں نہیں اور اپنی قدرت و حکمت کی پہچان آسان تر اور زیادہ واضح ہو اور اس کی معرفت کے دلائل ماہ و سال صدیوں اور زمانوں کی تعداد کے برابر ہمارے پاس موجود ہیں -

پھر فرمایا کہ ”اس (خدا) کا عرش پانی پر تھا“ (وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ)۔ اس جملے کی تفسیر سمجھنے کے لئے ان دو الفاظ ”عرش“ اور ”ماء“ کے مفہوم سے آشنا ہونا چاہیے -

”عرش“ دراصل ”چھت“ یا ”چھت نما“ چیز کے معنی میں آیا ہے سلاطین گزشتہ کے بلند تختوں کو بھی عرش کہا جاتا

ہے، اسی طرح ان بلند دیواروں اور مقامات کو بھی عرش کہتے ہیں جن پر بیل دار پودوں کو چڑھایا جاتا ہے، نیز بعد میں یہ کلمہ ”قدرت“ کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا جیسا کہ لفظ تخت فارسی زبان میناسی استعمال ہوا ہے۔

عربی میں کہتے ہیں:

”فلان استوی علی عرشہ، أو، ثلّ عرشہ“

یعنی فلان آدمی تخت پر بیٹھا یا اس کا تخت گر گیا۔

عربی زبان کا یہ کنایہ کہ اسے اقتدار مل گیا یا اس کا اقتدار ختم ہو گیا فارسی زبان میں استعمال ہوتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلان شخص کو لوگوں نے تخت پر بٹھادیا ہے یا فلان کو تخت سے اتار دیا ہے۔ (۲)

اس نکتہ کی جانب توجہ رکھنا چاہیے کہ بعض اوقات عرش مجموعہ عالم ہستی کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ قدرت کا تخت اس پورے جہاں پر محیط ہے۔

باقی رہا لفظ ”ماء“ اس کا عام معنی تو پانی ہے لیکن بعض اوقات مائع اور بہنے والی اشیاء مثلاً بہنے والی دھاتوں کو بھی ”ماء“ کہا جاتا ہے۔

ان دو الفاظ کے تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء خلقت میں جہاں ہستی پگھلے ہوئے مادہ یا تہ بہ تہ بہنے والی گیس کی شکل میں تھا جس کے بعد اس مانند آب ٹکڑے میں سخت مدّ و جزر اور شکست و ریخت پیدا ہوئی اور اس کے بعض حصّے سطح سے باہر اُڑے، اتصال، پیوستگی اور جدائی کا عمل شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے سیارے، ستارے اور منظومے (SILAR SYSTEMS) تشکیل پانے لگے، اس لئے جہاں ہستی اور قدرت کا تخت سب سے پہلے پانی کی مانند (مثل آبگینہ) اس عظیم مادّہ پر قرار پایا۔

سورہ انبیاء کی آیت ۳۰ میں بھی اسی طرف اشارہ ہوا ہے:

”کیا وہ جو خدا کا انکار کرتے ہیں علم و دانش کی آنکھ سے اس حقیقت کو نہیں دیکھتے کہ آسمان و زمین ابتدا میں ایک دوسرے سے پیوست تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور ہر زندہ موجود کو ہم نے پانی سے خلق کیا“

نہج البلاغہ کے خطبہ اول میں بھی اسی معنی کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔

دوسرا مطلب جس کی طرف مندرجہ بالا آیت اشارہ کرتی ہے، وہ جہاں ہستی اور عالم وجود کی خلقت کا ہدف و مقصد ہے، وہی ہدف کہ جس کا اہم ترین حصّہ اس جہاں کا گل سرسید یعنی انسان ہے، وہ انسان کہ جسے تعلیم و تربیت کی راہ اپنانا اور تکامل و ارتقاء کی طرف بڑھنا چاہیے تاکہ وہ ہر لمحہ خدا کے قریب ہوتا جائے۔

خداوند عالم فرماتا ہے، باعظمت خلقت اس لئے معرض وجود میں آئی تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور دیکھے کہ تم میں سے کون اعمالِ حسنہ انجام دیتا ہے (لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا)۔

”لِيَبْلُوَكُمْ“ مادہ ”بلا و ابتلاء“ سے آزمائش کے معنی میں ہے، جیسا کہ قبل ازیں اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے آزمائش کشفِ احوال اور لوگوں کی داخلی، روحانی اور فکری وضعیت و کیفیت معلوم کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ پرورش اور تربیت کرنے کے لئے ہے (اس موضوع کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے)

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں انسان کی قدر و قیمت کو اس کے ”حسنِ عمل“ سے مربوط کیا گیا ہے نہ کہ اس کے کثرتِ عمل سے، یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام ہر جگہ کیفیتِ عمل پر نظر رکھتا ہے کثرت و کمیت اور مقدار پر نہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اسی سلسلہ میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

لیس یعنی اکثر عملاً ولكن أصوبكم عملاً، وإنما الاصابة خشية الله، والنية الصادقة، ثم قال الابقاء على العمل حتى يخلص اشد من العمل، والعمل الخالص، الذي لا تريد أن يحمدك عليه أحد إلا الله عزوجل.

خدا کثرتِ عمل نہیں چاہتا بلکہ عمل کی درستی چاہتا ہے اور درستی عمل خدا ترسی اور نیک نیتی سے مربوط ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

عمل کو ریاکاری اور بد نیتی کی آلودگیوں سے پاک رکھنا خود عمل سے کہیں زیادہ مشکل تر ہے اور عملِ خالص خالص یہ ہے کہ تو نہ چاہے کہ خدا کے سوا کوئی اور تیری (اس عمل پر) ستائش کرے۔

تیسرا موضوع جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے ”معاد“ ہے جو آفرینش جہاں کے مسئلہ اور ہدف خلقت سے نہ ٹوٹنے والا رشتہ رکھتا ہے کیونکہ خلقتِ عالم کا مقصد انسانوں کا تکامل و ارتقاء ہے اور انسانوں کا ارتقاء انہیں ایک وسیع تر اور کامل تر جہاں میں زندگی گزارنے کے لئے تیار کرتا ہے، اسی لئے فرمایا: اگر ان سے کہا جائے کہ تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر از روئے تعجب کہتے ہیں کہ اسے باور نہیں کیا جاسکتا اور اس میں کوئی حقیقت و واقعیت نہیں ہے بلکہ یہ



ایک واضح جادو ہے (وَلَيْسَ قَوْلُكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ)۔  
 ”کلمہ ”ہذا“ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معاد و قیامت کے بارے میں گفتگو کی طرف اشارہ ہے یعنی کافروں کے نزدیک پیغمبر کا معاد کے بارے میں یہ دعویٰ جادو ہے اس بناء پر لفظ ”سحر“ یہاں حقیقت سے عاری ہے بنیاد گفتگو اور سادہ و عام تعبیر کے مطابق فریب و شعبدہ بازی کے مترادف ہے کیونکہ جادوگر عموماً حقیقت و واقعیت سے عاری چیزیں دکھاتے ہیں لہذا لفظ ”سحر“ حقیقت سے خالی چیز کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے۔  
 رہا یہ مسئلہ کہ بعض لوگوں کے نزدیک ”ہذا“ قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ قرآن اپنے سننے والوں میں ایک سحر انگیز نفوذ و جذب رکھتا ہے صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ آیت میں بحث معاد و قیامت کے بارے میں ہے نہ کہ قرآن کے متعلق اگرچہ قرآن کی غیر معمولی قوت جذب سے انکار نہیں۔

.....

۱۔ تفسیر نمونہ، ج ۶۔

۲۔ البتہ بعض اوقات تخت کرسی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کا ایک دوسرا مفہوم ہے جسے ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۲، سورہ بقرہ میں آیت الکرسی کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

۸ وَلَيْسَ أَخْرَأْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيْقُولَنَّ مَا يُحِبُّسُهُ الْيَوْمَ يَأْتِيهِمْ أَيْسَٰرَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ  
 ۹ وَلَيْسَ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَّ عَنْهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَنُوسُ كُفُورًا  
 ۱۰ وَلَيْسَ أَذَقْنَا نِعْمَاءَ بَعْدَ ضِرَاءٍ مَسْنُونَةٍ لَّيْقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتِ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحَ فَخُورًا  
 ۱۱ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ

ترجمہ

۸۔ اور اگر عذاب کو ایک محدود وقت کے لئے ان سے ٹال دیں (تو بطور استہزا) کہتے ہیں کہ اس میں کون سی رکاوٹ ہے؟ آگاہ رہو جس دن اس کی طرف سے عذاب آئے گا تو کوئی چیز اس کے آگے رکاوٹ نہیں بنے گی اور جس کا مذاق اڑاتے تھے وہی انہیں دامنگیر ہو جائے گا۔  
 ۹۔ اور اگر انسان کو ہم نعمت شکر کا مزہ چکھانے کے بعد وہ (نعمت) اس سے واپس لے لیں تو بہت ہی ناشکر اور ناامید ہو جاتا ہے۔  
 ۱۰۔ اور اگر شدتِ ناراحتی کے بعد اس تک نعمتیں پہنچائیں تو کہتا ہے کہ مشکلات مجھ سے برطرف ہو گئی ہیں جو دوبارہ نہیں آئیں گی اور خوشی، غفلت اور فخر میں مستغرق ہو جاتا ہے۔  
 ۱۱۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے (سچے ایمان کے سائے میں) صبر و استقامت دکھائی اور عملِ صالح انجام دیئے ہیں ان کے لئے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔

مومن عالی ظرف اور بے ایمان کم ظرف ہوتے ہیں

ان آیات میں اس بحث کی مناسبت سے کہ جو بے ایمان افراد کے بارے میں گزر چکی ہے، ایسے افراد کے نفسیاتی حالات اور اخلاقی کمزوریوں کے بعض نکات کی تشریح ہوئی ہے، وہی کمزور گوشے جو انسان کو تاریکیوں اور فساد کی راہوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

ایسے افراد کی پہلی صفت جو ذکر کی گئی ہے وہ حقائق کا مذاق اڑانا اور حیات ساز مسائل کے بارے میں تمسخر کرنا ہے وہ جہالت و نادانی اور غرور و تکبر کی وجہ سے جس وقت خدائی نمائندوں کو، بدکاروں کی سزا کے بارے میں ڈراتے دھمکتے ہیں، جبکہ چند روز گزرنے کے باوجود خدا اپنے لطف و کرم سے ان کے عذاب اور سزا کو تاخیر میں ڈال دیتا ہے تو بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہتے ہیں، کس چیز نے اس خدائی عذاب اور سزا کو تاخیر میں ڈال دیا ہے؟ کیا ہوا اس سزا کا اور کہاں گیا وہ عذاب؟ (وَلَيْسَ أَخْرَأْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيْقُولَنَّ مَا يُحِبُّسُهُ)۔

”امت“ مادہ ”ام“ (بروزن قم) سے ماں کے معنی میں آیا ہے جس کا معنی در اصل مختلف اشیاء کا ایک دوسرے میں ضم ہو جانا ہے، اسی بناء پر ہر اس گروہ کو جو اپنے ہدف یا ایک ہی زمان و مکان میں جمع ہو، امت کہا جاتا ہے۔

البتہ یہ لفظ وقت اور زمانے کے معنی میں بھی آیا ہے، کیونکہ زمانے کے اجزاء باہم پیوست ہوتے ہیں یا اس بناء پر کہ ہر جماعت یا گروہ کسی نہ کسی زمانے میں زندگی گزارتا ہے، سورہ یوسف کی آیت ۴۵ میں ہے:

آزاد شدہ قیدی ایک مدت کے بعد یوسف کو یاد کرنے لگا۔

زیر بحث آیت میں لفظ ”امت“ انہیں معنی میں آیا ہے، لہذا لفظ ”معدودہ“ سے توصیف کیا گیا ہے یعنی اگر تھوڑی مدت کے لئے ان سے عذاب مؤخر کر دیا جائے تو کہتے ہیں کہ کونسی چیز اس سے مانع ہوئی ہے۔ پس یہ شیوہ اور طریقہ تمام مغرور اور جاہلوں کا ہے جو چیز ان کے میلانات سے مطابقت نہ رکھے وہ ان کی نگاہ میں مذاق ہے، اسی لئے وہ مردان حق کی بلا دینے اور بیدار کرنے والی دھمکیوں کو شوخی اور مذاق سمجھتے ہیں لیکن قرآن مجید ان کو صراحت کے ساتھ جواب دیتا ہے: ”آگاہ رہو جس دن خدائی عذاب آن پہنچا کوئی اسے روک نہیں سکے گی اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ (عذاب) ان پر نازل ہوگا اور انہیں تباہ کر دے (الْأَيُّومَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِئُونَ)۔

یہ درست ہے کہ اس وقت ان کا نالہ و فریاد آسمان تک بلند ہوگا اور اپنی شرم انگیز گفتگو سے پشیمان ہوں گے لیکن نہ وہ نالہ و فریاد کہیں پہنچے گا اور نہ وہ پشیمانی انہیں کوئی فائدہ پہنچائے دے گی۔

ان کمزوری کا ایک اور نکتہ، مشکلات و ناراحتیوں اور برکات الہی کے منقطع ہونے پر ان کی کم ظرفی ہے جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے: اور جس وقت کسی نعت اور رحمت کا مزہ ہم انسان کو چکھائیں گے اور پھر وہ اس سے واپس لے لیں تو وہ مایوس اور ناامید ہوجاتا ہے اور کفرانِ نعمت اور ناشکری پر اٹھ کھڑا ہوتا ہے (وَلَمَّا أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَكُونُ مِنَّا قُحُورًا)۔

اگرچہ اس آیت میں گفتگو انسان کے بارے میں بطور کلی آئی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلی بھی اشارہ کیا ہے کہ لفظ ”انسان“ سے اس قسم کی آیات میں غیر ترتیب یافتہ، خود غرض اور ناکارہ انسانوں کی طرف اشارہ ہے، اس بناء پر یہ بحث گزشتہ آیات میں بے ایمان افراد کے متعلق بحث پر منطبق ہوتی ہے۔

بے ایمان افراد کی کمزوری کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جس وقت ناز و نعمت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں تو ان پر تکبر اور غرور اور نفس پرستی اس قدر چھائی ہوتی ہے کہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: اور مشکلات و تکالیف اب مجھ سے دور ہو گئی ہیں جو کبھی دوبارہ نہ آئیں گی۔ اور یوں وہ پروردگار کی نعمتوں کے شکرانے سے غافل ہوجاتا ہے (وَلَمَّا أَذَقْنَا نِعْمَاءَ بَعْدَ ضَرْأٍ مَسْتَهُ لَيَقُولُنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحَ فَخُورًا)۔

اس آیت کے جملہ ”ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي“ میں ایک دوسرا احتمال بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ جب اس طرح کے لوگ شہداند و مشکلات کو نعمتوں سے بدل دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ گزشتہ مصائب ہمارے گناہوں کا گفارہ تھے۔ اب ہمارے گناہ ان کی وجہ سے دھل گئے ہیں اور ہم پاک و پاکیزہ ہو گئے ہیں اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ مقربانِ درگاہِ خدا ہو چکے ہیں توبہ اور اس خدا کی بارگاہ میں بازگشت کے تصور سے عاری ہوجاتے ہیں۔

پس فرمایا: صرف صاحبانِ ایمان کہ جنہوں نے زندگی کے شہداند اور سخت حوادث کے مقابلے میں صبر و استقامت کا اختیار کیا اور جو ہر حال میں اعمالِ صالح بجالانے میں کوتاہی نہیں کرتے، تنگ نظری، ناشکرگاری اور غرور و تکبر سے کنارہ کش ہیں جو نہ تو وفورِ نعمت کے وقت مغرور ہوتے اور خدا کو فراموش کرتے ہیں اور نہ ہی شدتِ مصائب کے وقت مایوسی اور کفرانِ نعمت کرتے ہیں بلکہ ان کی عظیم روح اور بلند فکرِ نعمت و بلا دونوں کو برداشت کرتی ہے، وہ یاد خدا اور اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوتے، یہی لوگ خدا کے مقرب بندے ہیں اور انہی کے لئے بخشش اور بہت بڑا اجر ہے (إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ)۔

چند توجہ طلب نکات

۱۔ امتِ معدودہ اور یارانِ مہدی علیہ السلام:

وہ متعدد روایات جو طریقِ اہل بیت (علیہ السلام) سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں ”امتِ معدودہ“ سے مراد بہت تھوڑے افراد اور حضرت امام مہدی علیہ السلام کے یار و انصار کی طرف اشارہ سمجھا گیا ہے، لہذا اس ترتیب سے پہلی آیت کا مطلب اس طرح ہوگا: اگر ہم ستمگروں اور بدکاروں کی سزا و عذاب حضرت مہدی (علیہ السلام) اور ان کے یار و انصار کے قیام تک ملتوی کر دیں تو وہ (منکرین) کہتے ہیں کہ کس چیز نے عذابِ خدا کو روک رکھا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں آیت کے ظاہری معنی میں ”امتِ معدودہ“ محدود و معین زمانہ کے معنی میں آتا ہے اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے بھی اس آیت کی تفسیر میں جو روایت نقل ہوئی ہے اس میں ”امتِ معدودہ“ کی یہی تفسیر بیان ہوئی ہے۔

بنابریں ممکن ہے منقولہ روایت آیت کے دوسرے معنی یا بطن آیت کی طرف اشارہ ہو، البتہ اس صورت میں ظالموں اور ستمگروں کے بارے میں ایک قانون کلی کا بیان ہوگا نہ کہ زمانہ پیغمبر اکرم کے مشرکین اور مجرموں سے مربوط مسئلہ ہوگا، نیز ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی آیات مختلف معانی رکھتی ہیں، ممکن ہے اس کا پہلا اور ظاہری مطلب کسی خاص مسئلہ یا گروہ سے متعلق ہو، لیکن اس کا دوسرا معنی ایک عام معنی ہو جو کسی زمانہ یا گروہ میں منحصر نہ ہو۔

۲۔ کوتاہ فکری کے چار مظاہر

مندرجہ بالا آیت نے مشرکین اور گنہگاروں کے روحانی و باطنی حالات کی تین صورتوں میں تصویر کشی کی ہے اور ان میں ان کے چار اوصاف بیان ہوئے ہیں۔  
 اولین یہ کہ وہ نعمتوں کے منقطع ہونے کی صورت میں ”یئوس“ یعنی بہت ہی ناامید ہوجاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ”کفور“ یعنی بہت ہی ناشکرے ہیں۔

اس کے برعکس جب وہ نعمت میں مستغرق ہوتے ہیں یہاں تک کہ اگر چھوٹی سی نعمت بھی ان تک پہنچتی ہے تو وہ خوشی میں اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں اور لذت و نشاط میں غرق ہو کر ہر چیز سے غافل ہوجاتے ہیں، بادۂ لذت و غرور کی یہ سرمستی انہیں فتنہ و فساد اور حدود اللہ سے تجاوز کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔  
 مزید برآں ایسے لوگ ”فخور“ یعنی نعمت کے حصول پر بہت متکبر اور مباہات کا شکار ہوجاتے ہیں۔  
 بہر کیف یہ چار صفات کوتاہ فکری اور کم ظرفی کی بنا پر معرض وجود میں آتی ہیں اور یہ بے ایمان اور گناہگار افراد کے کسی ایک گروہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ سب کے لئے عمومی اوصاف کے ایک سلسلہ میں سے ہیں۔  
 البتہ صاحب ایمان لوگ جو بلند فکر، اعلیٰ ظرف، کشادہ دل اور عظیم روح کے حامل ہوتے ہیں انہیں نہ زمانہ کی دگرگوئیاں لرزاتی ہیں نہ نعمتوں کا چہن جانا انہیں شکر و مایوسی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور نہ ہی نعمتوں کا ان کی طرف رُخ کرنا انہیں غرور و غفلت میں مبتلا کرتا ہے۔  
 اسی لئے آیت میں استثنائی صورتِ حال کے پیش نظر لفظ ایمان کے بجائے صبر و استقامت استعمال کیا گیا ہے (غور طلب نکتہ ہے)۔

۳۔ کم ظرفی کی انتہا

ایک اور نکتہ جو توجہ طلب ہے یہ ہے کہ دونوں مواقع (عطا کے بعد نعمت کے سلب ہونے اور سلب کے بعد عطا ہونے) کے لئے ”انقنا“ جو مادہ ”اذاقۃ“ سے چکھنے کے معنی میں آیا ہے، کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر کم ظرف ہیں کہ اگر تھوڑی سی نعمت انہیں دی جائے اور پھر اسے ان سے لے لیا جائے تو ان کی داد و فریاد اور ناشکری کی صدا بلند ہوتی ہے اور اگر تکلیف و ناراحتی کے بعد ذرا سی نعمت انہیں مل جائے تو فرط و انبساط میں سرکے بل دوڑتے ہیں۔

۴۔ تمام نعمات عطیہ و بخشش ہیں

یہ امر توجہ طلب ہے کہ پہلی آیت میں نعمت کو لفظ ”رحمت“ سے بیان کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں لفظ ”نعمت“ استعمال ہوا ہے، ممکن ہے اس سے یہ اشارہ ہو کہ خدا کی تمام نعمتیں اس کے فضل و رحمت کے ذریعے انسان تک پہنچتی ہیں نہ کہ استحقاق کی بنیاد پر اور اگر نعمتیں استحقاق کی بنیاد پر میسر ہوتیں تو بہت ہی تھوڑے لوگوں کو میسر ہوتیں نہ کہ کسی شخص کو میسر آئیں۔

۵۔ اعمال نیک کے اثرات

اعمال نیک کے دو اثرات ذکر ہوئے ہیں، زیر نظر آخری آیت میں باایمان، صاحب استقامت اور صالح افراد سے ”مغفرت“ اور بخشش گناہ کا وعدہ بھی کیا گیا ہے اور ”اجر کبیر“ کا بھی، یہ اس جانب اشارہ ہے کہ نیک اعمال کے دو اثر ہیں ایک گناہوں کا دھل جانا اور دوسرا بڑی جزا کا حاصل ہونا۔

۱۲ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضٌ مَّا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كِتَابٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ إِنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ  
 ۱۳ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرِيَاتٍ وَادْعُوا مَنْ اسْتَلَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ  
 ۱۴ فَإِذَا هُمْ يَسْتَعْجِلُونَ لَكُمْ فَاَعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ

ترجمہ

۱۲۔ شاید بعض آیات کی تبلیغ کو جن کی تجھ پر وحی ہوئی ہے تو تاخیر میں ڈال دیتا ہے اور تیرا دل اس بنا پر تنگ (اور ناراحت) ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کیوں اس پر خزانہ نازل نہیں ہوتا یا کیوں فرشتہ اس کے ہمراہ نہیں آیا (تبلیغ کرو اور پریشان نہ ہو کیونکہ) تم صرف ڈرانے والے (اور خدائی خطرات سے آگاہ کرنے والے) ہو اور خدا ہر چیز پر نگہبان و دیکھنے والا ہے (اور وہ ان کا حساب کتاب رکھتا ہے)۔  
 ۱۳۔ بلکہ وہ کہتے ہیں یہ (قرآن کی) جھوٹی نسبت (خدا کی طرف دیتا ہے، ان سے کہو اگر سچ کہتے ہو تو تم بھی ان جیسی جھوٹی موٹی ہی دس سورتیں لے آؤ اور (بجز خدا) اپنی حسب استطاعت (اس کام کے لئے) تمام لوگوں کو دعوت دو۔  
 ۱۴۔ اور اگر وہ تمہاری دعوت قبول نہ کریں تو جان لو کہ (یہ کلام) علم الہی کے ساتھ نازل ہوا ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں، کیا ان حالات میں سر تسلیم خم کرو گے؟۔

شان نزول

ان آیات کے لئے دوسان نزول منکور ہیں جو ممکن ہے دونوں صحیح ہوں۔  
 پہلا یہ کہ کفار مکہ کا ایک گروہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، وہ کہنے لگے: اگر سچ کہتے ہو کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو مکہ کے پہاڑ ہمارے لئے سونے کے کردو یا فرشتے لے آؤ جو تمہاری نبوت کی تصدیق کریں، چنانچہ انکے جواب میں مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔  
 دوسری شان نزول حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، وہ یہ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں نے خدا سے درخواست کی ہے کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان برادری اور اخوت قائم کرے اور یہ درخواست قبول ہوگئی ہے، نیز میں نے یہ درخواست کی ہے کہ تمہیں میرا وصی قرار دے اور یہ درخواست بھی مستجاب ہوگئی ہے۔  
 جس وقت یہ گفتگو بعض مخالفین کے کانوں تک پہنچی تو عداوت و دشمنی کی بناء پر کہنے لگے خدا کی قسم ایک خشک مشک میں ایک من خرما بہتر ہے اس سے جو محمد نے اپنے خدا سے درخواست کی ہے، (اگر وہ سچ کہتا ہے تو) اسے کیوں خدا سے درخواست نہیں کی کہ دشمنوں کے خلاف مدد کرنے کے لئے کوئی فرشتہ نازل فرمائے یا کوئی خزانہ جو فقر و فاقہ سے نجات دلائے۔  
 لہذا مندرجہ بالا آیات نازل ہوئی تاکہ دشمنوں کو جواب دیا جاسکے۔

قرآن ایک معجزہ جادواں

ان آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم بعض اوقات دشمنوں کی شدید مخالفت اور ہٹ دھرمی کی بناء پر بعض آیات کی تبلیغ کسی موقع کے لئے ملتوی رکھتے تھے۔  
 لہذا زیر بحث پہلی آیت میں خداوند عالم اس بیان کے ساتھ اپنے پیغمبر کو اس کام سے منع فرماتا ہے: گویا بعض آیات کی تبلیغ کہ جن کی وحی ہوتی ہے، ترک کر دیتے ہو اور اس لحاظ سے تمہارا دل تنگ اور مضطرب ہوجاتا ہے (فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضٌ مَّا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ)۔  
 اور اس بات سے ناراحت ہوجاتے ہو کہ شاید وہ تجھ سے من پسند معجزات کی خواہش کریں اور ”کہتے ہیں کیوں اس پر خزانہ نازل نہیں ہوا یا کیوں اس کے ہمراہ فرشتہ نہیں آیا (أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كِتَابٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ)  
 البتہ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے مثلاً سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۹۰ تا ۹۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تقاضا اس بناء پر نہ تھا کہ وہ قبول حق کے لئے اور دعوت کی صداقت کے لئے معجزہ دیکھیں بلکہ وہ یہ تقاضا بہانہ جوئی، ہٹ دھرمی اور عناد کے باعث کرتے تھے لہذا قرآن بلافاصلہ کہتا ہے: تو صرف خوف دلانے اور ڈرانے والا ہے (إِنَّمَا أَنْتَ

نَذِيرٌ) یعنی چاہے قبول کریں یا نہ کریں، تمسخر اڑائیں اور ہٹ دھرمی سے کام لیں۔  
 آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا ہر چیز ا حافظہ، نگہبان اور ناظر ہے (وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ) یعنی ان کے ایمان و کفر کی پرواہ نہ کرو اور یہ معاملہ تمہارے ساتھ مربوط نہیں ہے، تمہاری ذمہ داری ابلاغ اور پیغام پہنچانا ہے، خدا خود جانتا ہے کہ ان کے کس طرح سلوک کرے اور وہی ان کے ہر کام کا حساب کتاب رکھنے والا ہے۔  
 یہ بہانہ جوئی اور اعتراض تراشی چونکہ اس بناء پر تھی کہ وہ اصولی طور پر وحی الہی کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ یہ آیات خدا کی طرف سے نہیں ہیں، یہ جملے محمد نے خود جھوٹ موٹ خدا پر باندھے ہیں، اسی لئے بعد والی آیت اس بات کا جواب جتنی صراحت سے ہوسکتا تھا دیتے ہوئے کہتی ہے: وہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) نے یہ (آیات) خدا پر افتراء باندھی ہیں (أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ)۔ ”ان سے کہہ دو اگر سچ کہتے ہو کہ یہ انسانی دماغ کی تخلیق ہیں تو تم بھی اس قسم کی دس جھوٹی سورتیں بنا کر لاؤ اور خدا کو چھوڑ کر جس سے ہوسکتا ہے اس میں مدد کی دعوت دو (قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيَاتٍ وَاذْعُوا مَنْ اسْتَضَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ)۔ لیکن اگر انہوں نے تم مسلمانوں کی دعوت قبول نہ کی اور کم از کم ایسی دس سورتیں بھی نہ لائے تو پھر جان لو کہ یہ کمزوری اور ناتوانی اس بات کی نشانی ہے کہ ان آیات کا سرچشمہ علم الہی ہے ورنہ اگر یہ فکر بشر ہی ہیں (فَأَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ)۔  
 نیز جان لو کہ خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور ان آیات پر اعجاز کا نزول اس حقیقت کی دلیل ہے (وَأَنْ لَّآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ)

اے مخالفین! کیا اس حالت میں تم فرمان الہی کے سامنے سرتسلیم خم کرو گے (فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ)۔ باوجودیکہ ہم نے تمہیں مقابلے کی دعوت دی ہے اور اس دعوت پر تمہارا عجز ثابت ہو گیا ہے کیا اس کے باوجود کوئی شک کی گنجائش باقی ہے کہ یہ آیات خدا کی طرف سے ہیں، اس واضح معجزہ کے ہوتے ہوئے کیا پھر بھی تم ان کی راہ پر چلو گے یا سرتسلیم خم کر لو گے۔

چند اہم نکات

1- آیت ”لعل“ کا مفہوم:

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ”لعل“ عام طور پر کسی چیز کے بارے میں توقع کا اظہار کے لئے آتا ہے، البتہ یہاں یہ لفظ نہیں کے معنی میں آیا ہے، یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو کسی چیز سے روکنا چاہے تو کہے: شاید تیری دوستی اس شخص سے جو اپنے کاموں میں زیادہ پختہ کار نہیں ہے، یعنی اس سے دوستی نہ رکھ کیونکہ اس کی دوستی تجھے سُست اور بیکار بنا دے گی، لہذا ایسے مواقع پر ”لعل“ اگرچہ ”شاید“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تاہم اس کا التزامی مفہوم کسی کام کے کرنے سے روکنا ہے۔  
 زیر بحث آیات میں بھی خداتعالیٰ اپنے پیغمبر کو تاکید کرتا ہے کہ آیات الہی کی تبلیغ مخالفین کی تکذیب کے ڈر سے یا دل خواہ معجزات کے تقاضے کی وجہ سے تاخیر میں نہ ڈالیں۔

۲- آیات الہی کی تبلیغ میں تاخیر؟

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیونکر ممکن ہے کہ پیغمبر آیات الہی کی تبلیغ میں تاخیر کریں یا ان کی تبلیغ سے بالکل ہی رُک جائیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ نبی سے کوئی گناہ یا خطا سرزد نہیں ہوسکتی۔  
 اس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت پیغمبر کسی حکم کی فوری تبلیغ پر مامور ہوں تو یقیناً بغیر کسی شک و شبہ کے وہ اس کی تبلیغ کریں گے لیکن کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ تبلیغ کا وقت وسیع ہوتا ہے اور پیغمبر بعض وجوہات کے پیش نظر جو خود ان کی اپنی طرف سے نہیں ہوتیں بلکہ مکتب کے دفاع کی اور حمایت ہی کے حوالے سے ہوتی ہیں ان کی تبلیغ میں تاخیر کردیتے ہیں، مسلم ہے کہ یہ گناہ نہیں جیسا کہ اس کی نظیر سورہ مائدہ کی آیت ۶۷ میں ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو تاکید کرتا ہے کہ آیات الہی کی تبلیغ کریں اور لوگوں کو دھمکیوں سے نہ ڈریں اور خدا ان کی حفاظت کرے گا، قرآن کے الفاظ ہیں:

درحقیقت یہاں تبلیغ میں تاخیر ممنوع نہ تھی، تاہم قاطعیت کے اظہار کے طور پر اس میں جلدی کرنا بہتر تھا، اس طریقے سے خدا اپنے پیغمبر کی نفسیاتی حوالے سے تقویت چاہتا ہے اور مخالفین کے سامنے ان کی قاطعیت اور اٹل فیصلے کو

استقامت دینا چاہتا ہے تاکہ وہ ان کے شور و شرابے، بے بنیاد تقاضوں، بہانہ سازیوں اور تمسخر سے پریشان نہ ہوں -

۳۔ آیت میں ”آم“ کا معنی:

زیرِ نظر دوسری آیت ”آم یقولون افتراء...“ کی ابتداء میں لفظ ”آم“ کے بارے میں دو احتمالات ذکر کئے ہیں، ایک یہ کہ یہ ”او“ (یا) کے معنی میں ہے اور دوسرا یہ کہ یہ ”بل“ کے معنی میں ہے -

پہلی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: شاید تو نے ہماری آیات کو مخالفین کی بہانہ سازیوں کے خوف سے انہیں نہیں سنایا ”یا یہ کہ“ تُوئے تو آیات الہی پڑھی ہیں لیکن انہوں نے انہیں خدا پر افتراء سمجھا ہے -  
دوسری صورت میں آیت کا معنی اس طرح ہوگا: آیات الہی کی تبلیغ میں ان کی بہانہ سازیوں کی وجہ سے تاخیر نہ کرو۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ یہ لوگ تو بنیادی طور پر وحی اور نبوت کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خدا پر افتراء باندھا ہے -

درحقیقت اس بیان کے ذریعے خدا اپنے پیغمبر کو خبر دیتا ہے کہ من پسند کے معجزات کے بارے میں ان کے تقاضے تلاشِ حقیقت کی بنا پر نہیں بلکہ اس لئے ہیں کہ وہ اصولی طور پر نبوت کے منکر ہیں اور یہ سب ان کے بہانے ہیں -  
بہرحال مندرجہ بالا آیات کے مفہوم میں غور و خوض سے اور خصوصاً ادبی لحاظ سے ان کے الفاظِ دقتِ نظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرا معنی آیات کے مفہوم سے زیادہ نزدیک ہے (غور کیجئے گا) -

۴۔ معجزہ طلبی کا جواب:

اس میں شک نہیں کہ پیغمبر کے لئے ضروری ہے کہ متلاشیانِ حق کے لئے اپنی حقانیت کے سند کے طور پر معجزہ پیش کرے اور کوئی پیغمبر بھی صرف اپنے دعویٰ کو کافی نہیں سمجھ سکتا لیکن اس میں شک نہیں کہ جن مخالفین کا مندرجہ بالا آیات میں ذکر آیا ہے وہ حقیقت کی تلاش میں نہیں تھے وہ جن معجزات کا مطالبہ کرتے تھے وہ ان کے من پسند کے معجزات تھے - مسلم ہے کہ ایسے لوگ بہانہ جو ہوتے ہیں نہ کہ حقیقت کے متلاشی، کیا حتماً ضروری ہے کہ پیغمبر کے پاس بڑا خزانہ ہو جیسا کہ مشرکین کا خیال تھا یا کیا ضروری ہے کہ فرشتہ اس کے ہمراہ تبلیغِ رسالت کرے علاوہ ازینکیا خود قرآن معجزہ سے برتر اور بالاتر نہیں تھا، اگر واقعاً ان کا مقصود بہانہ تراشی نہ تھا تو پھر قرآن کی اس بات پر کان کیوں نہیں دھرتے کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ آیات پیغمبر اپنی طرف سے لے آتا ہے تو جاؤ اس کے مثل لے آؤ اور دنیا کے تمام لوگوں کی مدد بھی حاصل کرلو۔

۵۔ قرآن کا چیلنج

مندرجہ بالا آیات میں دوبارہ اعجازِ قرآن کے بارے میں تاکید کی گئی ہے کہ یہ کوئی عام سی گفتگو نہیں ہے اور نہ یہ انسانی ذہن کی اختراع ہے بلکہ آسمانی وحی ہے جس کا سرچشمہ خدا کا ہے پایاں اور لامتناہی علم اور قدرت ہے اسی بنا پر پوری دنیا کو چیلنج کیا گیا ہے جس اور مقابلے کی دعوت دی گئی ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ رسول اللہ کے ہمعصر بلکہ وہ قومیں جو آج تک اس کام میں لگی ہوئی ہیں ایسا کرنے سے عاجز ہیں، یہ قومیں دیگر تمام تر مشکلات تو جھیلنے کو تیار ہیں لیکن آیاتِ قرآن کا مقابلہ کرنے کی طرف نہیں آتیں، اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ ایسا کام انسان کے بس میں نہ تھا ورنہ ہوسکتا ہے، تو کیا معجزہ اس کے علاوہ کسی چیز کا نام ہے -

قرآن میں یہ آواز آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے، یہ معجزہ جاوید آج بھی اسی طرح عالمین اور ساری کائنات کو اپنی طرف دعوت دے رہا ہے اور دنیا کے تمام علمی مراکز کو چیلنج کر رہا ہے، اس کا یہ چیلنج نہ صرف فصاحت و بلاغت یعنی عبارات کی شیرینی و جاذبیت اور مفاہیم کی رسائی کے لحاظ سے ہے بلکہ:

، اس کے مضامین کے اعتبار سے بھی،

، ان علوم کے لحاظ بھی جو اُس زمانے کے انسانوں سے پنہاں تھے،

، قوانین و احکام کے حوالے سے بھی جو بشریت کی سعادت و نجات کے ضامن ہیں،

، بیانات کے حوالے سے بھی جو ہر قسم کے تناقض اور پراگندگی سے پاک ہیں،

، تواریخ کے اعتبار سے سے جو خرافات سے مبرا ہیں اور

، اسی طرح تمام حوالوں سے اس کا یہ چیلنج ہے -

تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیات ۲۳ اور ۲۴ کی تفسیر کے ذیل میں ہم اعجازِ قرآن کے بارے میں تفصیل سے بحث

کرچکے ہیں -

۶۔ پورا قرآن، دس سورتیں یا ایک سورت :

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ، قرآن مجید نے ایک جگہ مخالفین کو قرآن کی مثلاً لانے کی دعوت دی ہے (بنی اسرائیل/۸۸) اور دوسری جگہ قرآن جیسی سورتیں لانے کے لئے کہا ہے (مثلاً محل بحث آیات ) اور ایک اور جگہ قرآن کی ایک سورت جیسی سورت لانے کا کہا ہے (بقرہ/۲۳) اس بناء پر بعض مفسرین نے یہ بحث کی ہے کہ چیلنج اور مقابلے کی اس دعوت میں اتنا فرق کیوں ہے؟

اس سوال کا جواب میں مختلف راستے اختیار کئے گئے ہیں:

الف) بعض کا نظریہ ہے کہ یہ فرق اوپر کے مرحلہ سے نیچے کی طرف تنزل کی مانند ہ، جیسے ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ تم بھی اگر میری طرح فن تحریر اور شعر گوئی میں مہارت رکھتے ہو تو میری کتاب جیسی کتاب لکھ کر دکھاؤ، پھر کہتا ہے اس کے ایک باب جیسی تحریر پیش کر دو حتیٰ کہ ایک صفحہ ہی لکھ کر دکھا دو -

البتہ یہ جواب اس صورت میں صحیح ہے کہ سورہ بنی اسرائیل ، سورہ ہود، سورہ یونس اور سورہ بقرہ اسی ترتیب سے نازل ہوئی ہوں اور ”تاریخ القرآن“ میں فہرست ”ابن ندیم“ سے جو ترتیب نقل ہوئی ہے یہ بات اس سے مناسبت رکھتی ہے کیونکہ اس کے مطابق رسول اللہ پر نزول کے اعتبار سے سورہ بنی اسرائیل کا نمبر ۴۸ ہے ، ہود کا نمبر ۵۹، یونس کا نمبر ۵۱ اور بقرہ کا نمبر ۹۹ ہے -

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ بات مشہور ترتیب سے مناسبت نہیں رکھتی جو مندرجہ بالا سورتوں کے متعلق اسلامی تفاسیر میں بیان کی گئی ہے

ب) بعض نے کہا ہے کہ اگرچہ یہ سورتیں ترتیب نزول کے اعتبار سے نیچے کی طرف تنزل کے معاملے پر منطبق نہیں ہوتیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایک سورت کی تمام آیتیں ایک ہی مرتبہ نازل نہیں ہوجاتی تھیں، بلکہ بہت سی آیات ایسی ہوتیں جو بعد میں نازل ہوئیں اور رسول اللہ کے حکم سے پانی مناسبات کی وجہ سے قبل کی سورت میں قرار پاتیں، زیر بحث معاملے میں بھی ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو لہذا مندرجہ بالا سورتوں کی تاریخ نزول اس بات کے منافی نہیں ہے کہ یہاں اوپر سے نیچے کی طرف تنزل کا معاملہ ہو۔

ج) اس سوال کے جواب میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ اصولاً ”قرآن“ ایک ایسا لفظ ہے جو پورے قرآن کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور قرآن کے کچھ حصے پر بھی، مثلاً سورہ جن کی ابتدا میں ہے:

ہم نے عجیب قرآن سنا ہے -

واضح رہے انہوں نے قرآن کا کچھ حصہ ہی سنا تا -

اصول طور پر قرآن مادہ ”قرانت“ سے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قرانت و تلاوت پورے قرآن پر بھی صادق آتی ہے اور جزو قرآن پر بھی لہذا مثل قرآن لانے کے چیلنج کا مفہوم تمام قرآن نہیں ہے بلکہ یہ دس سورتوں کے لئے بھی ٹھیک ہے اور ایک سورت کے لئے بھی درست ہے -

دوسری طرف ”سورہ“ بھی ”مجموعہ“ اور ”محدودہ“ کے معنی میں ہے اور یہ لفظ آیات کے کسی بھی مجموعہ پر منطبق ہوجاتا ہے اگر عام اصطلاح میں جسے مکمل سورہ کہتے ہی یہ اس کے برابر بھی نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں ”سورہ“ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ، ایک معنی آیات کا وہ مجموعہ ہے جس کا ایک معین مقصد ہو اور دوسرا معنی ایک مکمل سورہ ہے جو بسم اللہ سے شروع ہو کر بعد والی سورت کی بسم اللہ سے پہلے ختم ہوجائے، اس بات کی شاہد ”توبہ“ کی آیت ۸۶ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

جس وقت کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ خدا پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو....

واضح ہے کہ یہاں سورہ سے مراد وہ آیات ہیں جو خدا پر ایمان اور جہاد کے مذکورہ مقصد کے بارے میں ہیں اگرچہ وہ ایک مکمل سورت کا ایک حصہ ہی ہوں -

مفردات میں راغب نے بھی سورہ نور کی پہلی آیت ”سورہ انزلناھ...“ کی تفسیر میں کہا ہے:

أی جملة من الاحکام والحکم....

جیسا کہ ہم دیکھ رہے یہاں سورت کو احکام کا ایک مجموعہ قرار دیا گیا ہے -

اس گفتگو کے پیش نظر قرآن، سورت اور دس سورتوں میں لغوی مفہوم کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں رہتا یعنی ان

تمام الفاظ کا اطلاق قرآن مجید کی چند آیتوں پر ہوسکتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن چیلنج ایک لفظ اور ایک جملے کے لئے نہیں کہ کوئی دعویٰ کرے کہ میں آیہ ”والضحیٰ“ اور آیہ ”مدهامتان“ یا قرآن کے کسی سادہ جملے کی مثل لاسکتا ہوں بلکہ تمام جگہوں پر آیات کے ایک ایسے مجموعے کے بارے میں جس کا ایک خاص ہدف اور مقصد ہو (غور کیجئے گا)

۷۔ ”إِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ“ کے مخاطب:

اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ ”إِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ“ میں مخاطب کون ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مخاطب مسلمان ہیں، یعنی اگر منکرین نے تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہا اور قرآن کی دس سورتوں کی مثل نہ لائے تو جان لو کہ یہ قرآن کی طرف سے ہے اور یہی خود اعجاز قرآن کی دلیل ہے۔

بعض دوسروں نے کہا کہ مخاطب منکرین ہیں یعنی اے منکرین! اگر باقی انسان اور جو کچھ غیر از خدا ہے انہوں نے مثل قرآن لانے میں مدد کے لئے تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہا اور وہ عاجز و ناتواں رہ گئے تو پھر جان لو کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے۔

نتیجہ کے لحاظ سے دونوں تفاسیر میں کوئی فرق نہیں ہے تاہم پہلا احتمال زیادہ نزدیک معلوم ہوتا ہے۔

#### تفسیر نمونہ جلد 09

۱۵ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوفَّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُخْسُونَ  
۱۶ أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

ترجمہ

۱۵۔ جو لوگ دنیا اور اس کی زینت کو چاہتے ہیں ہم ان کے اعمال انہیں بے کم وکاست اسی جہان میں دے دیں گے۔  
۱۶۔ (لیکن) آخرت میں (جہنم کی) آگ سے سوا ان کا (کچھ حصہ) نہیں ہوگا اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں (مادی مقاصد اور غیر خدا کے لئے) انجام دیا ہے وہ برباد ہوگا اور ان کے اعمال باطل ہو جائیں گے۔

تفسیر

گزشتہ آیات نے اعجاز قرآن کے دلائل پیش کر کے مشرکین اور منکرین پر حجت تمام کر دی ہے اور چونکہ حق واضح ہوجانے کے باوجود ایک گروہ نے صرف اپنے مادی منافع کی خاطر سرتسلیم خم نہیں کیا لہذا محل بحث آیات میں ایسے دنیا پرست افراد کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ”جس کا مقصد صرف دنیاوی زندگی کی رنگینیاں اور اس کی زینت ہو وہ اس جہان میں اپنے اعمال کا نتیجہ پالے گا بغیر اس کے کہ کوئی چیز اس میں کم ہے“ (مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوفَّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُخْسُونَ)۔

”بخس“ لغت میں حق کے نقصان کے معنی میں آیا ہے اور ”وَهُمْ فِيهَا لَا يُخْسُونَ“ اس طرح اشارہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بغیر ٹھوڑے سے بھی نقصان کے پالیں گے۔

یہ آیت خداتعالیٰ کی ایک دائمی سنت کو بیان کر رہی ہے اور وہ یہ کہ مثبت اعمال اور مؤثر نتائج ختم نہیں ہوتے، فرق یہ ہے کہ اگر اعمال کا اصلی مقصد اس جہان کی مادی زندگی کا حصول ہے تو نتیجہ بھی مادی ہی ہوگا لیکن اگر مقصد خدا اور اس کی رضا کا حصول ہو تو وہ اس جہان میں بھی ثمر بخش ہوں گے اور دوسرے جہان میں بھی پربار نتائج پیدا کریں گے۔

درحقیقت پہلی قسم کے اعمال ایسی غیر مستقل اور کم عمر عمارت کی طرح ہیں جسے وقتی ضرورت کے لئے بنایا جاتا ہے اور اس سے استفادہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ویران ہوجاتی ہے لیکن دوسری قسم کی مثال ایسی محکم اور مضبوط بنیادوں والی عمارت کی سی ہے جو صدیوں تک برقرار رہتی ہے اور قال استفادہ ہوتی ہے، اس امر کا نمونہ آج کل ہم اپنے گردو پیش دیکھتے ہیں، مغربی دنیا نے اپنی مسلسل اور منظم کوشش سے بہت سے علوم کے اسرار معلوم کئے ہیں



نیز مغربی دنیا نے مادہ کی مختلف طاقتوں پر تصرف حاصل کر لیا ہے اور مسلسل کوشش اور مشکلات کے مقابلے میں استقامت، اتحاد اور ہم بستگی ہے انھوں نے بہت سی نعمات حاصل ہیں۔

اس بناء پر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے اعمال اور کوشش کے نتائج حاصل کریں گے اور درخشاں اور واضح کامیابیوں سے ہمکنار ہوں گے لیکن دوسری طرف سے چونکہ ان کا مقصد صرف دنیاوی زندگی ہے لہذا ان اعمال کا طبعی و فطری اثر سوائے ان کے لئے مادی وسائل فراہم ہونے کے اور کوئی نہیں ہو گیا یہاں تک کہ ان کے انسانی اور بڑے کام مثلاً ہسپتال بنانا، شفاخانے قائم کرنا، علمی مراکز قائم کرنا، غریب اقوام کی مدد کرنا اور اس قسم کے دیگر فلاحی کام، اگر ان کے استعمار و استثمار کی قیمت نہ ہو تو چونکہ بہر حال مادی ہدف کے تحت اور مادی منافع کے لئے ہوتے ہیں لہذا ان کا صرف مادی اثر ہوگا، اسی طرح وہ لوگ جو ریاکارانہ کام کرتے ہیں ان کے علاوہ جو انسانی حوالوں سے ہوتے ہیں ان کے صرف مادی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اسی لئے بعد والی آیت میں صراحت سے فرمایا گیا ہے: ایسے افراد کے لئے آخرت میں (جہنم کی) آگ کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہے (أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ)۔ ”اور جو کچھ انہوں نے اس جہان میں انجام دیا ہے وہ دوسرے جہان میں محو و نابود ہو جائے گا اور اس کے بدلے میں انہیں کوئی جزا نہیں ملے گی“ (وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا)۔ ”اور وہ تمام اعمال جو انہوں نے غیر خدا کے لئے انجام دیئے ہیں باطل و نابود ہو جائیں گے (وَبَاطِلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ)۔

”حبط“ (بروزن ”وقت“) کا معنی در اصل ایسا حیوان ہے جو نامناسب گھاس پھوس میں اتنا زیادہ کھالے کہ اس کے پیٹ بوا بھر جائے اور اس کا اوجھڑی بیمار اور ضائع ہو جائے، اس عالم میں یہ جانور ظاہراً تو جاق و چوبند نظر آتا ہے حالانکہ باطناً مریض ہوتا ہے۔

یہ ایسے اعمال کے لئے نہایت موثر اور عمدہ تعبیر ہے جو ظاہراً مفید اور نسانی ہیں لیکن باطن میں آلودہ اور پست نیت سے انجام دیئے گئے ہیں۔

#### ۱۔ ایک اشکال کی وضاحت:

ہوسکتا ہے پہلی نظر میں یوں معلوم ہو کہ مندرجہ بالا دو آیتیں آپس میں تعارض رکھتی ہیں اس بناء پر کہ پہلی آیت کہتی ہے: ”وہ اشخاص جن کا ہدف فقط اس دنیا کی زندگی ہے ان کے اعمال کا نتیجہ ہم انہیں ہے کم و کاست دیں گے“ لیکن دوسری آیت کہتی ہے: ان کے اعمال حبط اور باطل ہو جائیں گے۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ایک آیت دنیاوی زندگی کے بارے میں اور دوسری اشارہ دارِ آخرت کی طرف ہے، اس اشکال کی وضاحت ہو جاتی ہے، یعنی وہ اپنے اعمال کے نتائج اسی دنیا میں پورے طور پر حاصل کر لیں گے، لیکن اس کا کیا فائدہ کہ یہ اعمال جو اگرچہ نہایت زیادہ تھے مگر آخرت کے لئے بے اثر ہیں کیونکہ ان کا ہدف پاک اور نیت خالص نہیں تھی، ان کا ہدف مادی مفادات کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جس تک وہ پہنچ گئے۔

#### ۲۔ دنیا کی زینتیں

حیاتِ دنیا کے بعد لفظ ”زینت“ دنسا پرستی اور دنیا پرستی کی زرق و برق کی مذمت کے لئے ہے نہ کہ اس کا مقصد دنیا کی نعمتوں سے مناسب اور معتدل فائدہ اٹھانے کی نفی کرنا ہے۔

لفظ ”زینت“ جو یہاں سر بستہ طور پر آیا ہے دوسری آیات میں خوبصورت عورتوں، عظیم خزانوں اور قیمتی سوراہوں، زرعی زمینوں اور فراوان دولت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً:

< زَيْنٌ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ >

مادی چیزوں میں سے عورتیں، اولاد اور مال جو سونے اور چاندی کے ڈھیروں پر مشتمل ہے، منتخب گھوڑے، جانور اور زراعت لوگوں کی نظر میں پسندیدہ بنا دیئے گئے ہیں۔

#### ۳۔ ”حبط“ کے بعد لفظ ”باطل“

لفظ ”حبط“ کے بعد لفظ ”باطل“ ہوسکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ ان کے اعمال کا ایک ظاہر ہے اور باطن کوئی نہیں ہے، اسی بناء پر ان کا نتیجہ کچھ بھی نہیں، اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ ان کے اعمال اصولی طور پر ابتداء ہی سے باطل اور بے خاصیت ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہ بہت سی اشیاء کے حقائق چونکہ اس دنیا میں پہچانے نہیں جاتے اور دوسرے جہان میں جس میں تمام اسرار کھل جائیں گے، ان کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اعمال شروع ہی

سے کچھ نہ تھے -

۴۔ ایک حدیث:

مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں کتاب ”در المنثور“ میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے جس سے ان کا مفہوم واضح ہوتا ہے، حدیث یہ ہے:

قال رسول الله صل الله عليه و آله : اذا كان يوم القيامة صارت امت ثلاث فرق : فرقة يعبدون الله خالصاً و فرقة يعبدون الله رياءً و فرق يعبدون الله يعيون به دنيا.

فيقول للذي كان يعبد الله للدنيا: بعزتي و جلالی ما اردت بعبادتي؟ فيقول الدنيا، فيقول لاجرم لا ينفعك ما جمعت و لا ترجع اليه انطلقوا به الى النار.

و يقول للذي يعبد الله رياءً: بعزتي و جلالی ما اردت بعبادتي؟ قال الرياء، فيقول انما كانت عبادتك التي كنت تراني بها لا يصعد الي منها شيء و لا ينفعك اليوم ، انطلقوا به الى النار.

و يقول للذي كان يعبد الله خالصاً: بعزتي و جلالی ما اردت بعبادتي؟ فيقول بعزتك و جلالك لانك اعلم مني كنت اعبدك لوجهك و لدارك قال : صدق عبدي انطلقوا به الى الجنة :

رسول الله نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہو، میرے پیروکار تین گروہوں میں تقسیم ہوجائیں :

ایک وہ گروہ جو خدا کی خلوص کے ساتھ عبادت کرتا تھا، دوسرا گروہ جو دکھاوے کے لئے عبادت کرتا تھا اور تیسرا وہ گروہ جو دنیا تک رسائی کے لئے عبادت کرتا تھا -

اس وقت خدا اس گروہ کو جو دنیا کی خاطر اس کی عبادت کرتا تھا کہے گا: میری عزت و جلال کی قسم بتاؤ میری عبادت میں تمہارا کیا مقصد تھا، وہ جواب میں کہے گا: دنیا ، خدافرمائے گا: اس بناء پر جو کچھ تم نے جمع کیا ہے وہ تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا اور تم اس کی طرف پلٹ کر نہیں جاؤ گے، پھر فرمائے گا: اسے آتش جہنم کی طرف لے جاؤ -

اور جو شخص رياء کے طور پر خدا کی عبادت کرتا تھا اللہ اس سے کہے گا: میری عزت و جلال کی قسم بتاؤ میری عبادت سے تمہارا کیا مقصد تھا؟ وہ جواب دے گا: دکھاوا - تو اللہ فرمائے گا: وہ عبادت جو تم نے رياء کے طور پر انجام دی تھی اس میں کچھ بھی میرے پاس نہیں پہنچتا تھا اور آج تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں دونگا، پھر حکم دے گا: اسے آتش جہنم کی طرف لے جاؤ۔

اور وہ شخص جو خدا کی عبادت خلوص سے کرتا تھا، اس سے کہا جائے گا: میری عزت و جلال کی قسم، بتاؤ تم عبادت کس مقصد سے کرتے تھے، وہ کہے تیری عزت و جلال کی قسم تو اس بات سے زیادہ باخبر ہے کہ میں نے تیری عبادت صرف تیرے لئے اور دار آخرت کے لئے کی تھی، خدا فرمائے گا: میرا بندہ سچ کہتا ہے اسے جنت لے جاؤ۔ (2)

.....

- ۱۔ مزید وضاحت کے لئے آل عمران کی آیت ۱۴ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں (تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۲۶۶ ، اردو ترجمہ)
- ۲۔ تفسیر المیزان: ج ۱، ص ۱۸۶ (بحوالہ تفسیر۔)

تفسیر نمونہ جلد 09

۱۷ أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِنْهُ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ قَالُوا مَوْعِدُهُمْ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِنْهُ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ

ترجمہ

۱۷۔ کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہے اس کے پیچھے اس کی طرف شاکد ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب کہ جو پیشوا اور حرمت تھی (اس پر گواہی دیتی ہے، اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہ ہو)

وہ (حق طلب اور حقیقت کی متلاشی) اس پر (جو یہ خصوصیات رکھتا ہے) ایمان لاتے ہیں اور مختلف گروہوں میں سے جو شخص اس کا منکر ہو آگ اس کی وعدہ گاہ ہے، لہذا اس میں شک نہ کرو کہ وہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر

زیر نظر آیت کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے، آیت کے الفاظ کی جزئیات، ضمائے، موصول اور اسم اشارہ کے بارے میں مختلف نظریے ہیں، اس تفسیر میں ان سب کا ذکر ہماری روش کے خلاف ہے، دو تفاسیر جو زیادہ واضح معلوم ہوتی ہیں اہمیت ترتیبی کے اعتبار سے یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ آیت کی ابتداء میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہے اور اس کے پیچھے خدا کی طرف سے شاہد آیا ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (توریت) پیشوا، رحمت اور ان کی عظمت کو واضح کرنے والی کتاب کی حیثیت سے آئی ہے، اس شخص کی طرح ہے جو ان صفات، نشانیوں اور واضح دلائل کا حامل نہیں ہے (أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِنْهُ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً)۔ یہ شخص پیغمبر اکرم ہیں، ان کی واضح دلیل قرآن مجید ہے، ان کی نبوت کی صداقت کے شاہد علی (علیہ السلام) جیسے مومن صادق ہیں اور قبل ازیں ان کی نشانیاں اور صفات تورات میں آچکی ہیں، اسی طرح تین واضح طریقوں سے آپ کی دعوت کی حقانیت ثابت ہوگئی ہے۔

پہلا راستہ قرآن ہے، جو ان کے ہاتھ میں ایک واضح دلیل ہے۔ دوسرا راستہ گزشتہ آسمانی کتب ہیں، جن میں آنحضرت کی نشانیاں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں اور رسول اللہ کے زمانے کے ان کتب کے پیروکار انہیں اچھی طرح سے پہچانتے ہیں اور اسی بناء پر ان کے انتظار میں تھے۔ تیسرا راستہ آپ کے فدا کار پیروکار اور مخلص مومنین ہیں کہ جو آپ کی دعوت اور گفتار کی صداقت کو واضح کرتے تھے کیونکہ کسی مکتب کی حقانیت کی ایک نشانی اس مکتب کے پیروکاروں سے پہچانا جاتا ہے۔ کیا ان زندہ دلائل و براہین کے باوجود انہیں دوسرے مدعیان نبوت پر قیاس کیا جاسکتا ہے یا ان کی دعوت کی صداقت میں شک و شبہ کیا جاسکتا ہے۔ (۱)

اس گفتگو کے بعد قرآن متلاشیان حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں ضمنی طور پر ایمان کی دعوت دیتا ہے: ایسے پیغمبر پر کہ جو روشن دلیل رکھتا ہے ایمان لائیں گے (أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ)۔ لفظ ”أُولَٰئِكَ“ میں جن افراد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگرچہ ان کا ذکر نہیں ہے لیکن اگر گزشتہ آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس آیت میں ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی طرف اشارے کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد منکرین کی گہانی یوں بیان کی گئی ہے: مختلف گروہوں میں سے جو کوئی اس سے کفر کرے گا تو اس کی وعدہ گاہ جہنم ہے (بِمَنْ يَكْفُرُ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَآلِنَارٌ مَوْعِدُهُ)۔ پورا جملہ مبتداء، اس کی خبر محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہوگی: ”کمن لیس کذلک“ یا ”کمن یرید الحیاة الدنیا“

آیت کے آخر میں قرآن کے دیگر بہت سے مواقع کی طرف سیرت قرآن کے روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے تمام لوگوں کے لئے ایک عمومی درس بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: اب جبکہ ایسا ہے اور تیری دعوت کی صداقت کے لئے یہ تمام شاہد موجود ہیں جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے اس کے بارے میں ہرگز شک و شبہ کو راہ نہ دے (فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِنْهُ)۔ ”کیونکہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے کلام حق ہے“ (إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ)۔ ”لیکن بہت سے لوگ جہالت، تعصب اور خود پسندی کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے (وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ)۔

۲۔ دوسری تفسیر جو آیت کے لئے ذکر ہوئی ہے یہ ہے کہ اصل مقصد سچے مومنین کی حالت بیان کرنا ہے کہ وہ ان واضح دلائل و شواہد اور گزشتہ کتب میں موحود شہادتوں کی بنیاد پر دعوت پیغمبر کی صداقت پر ایمان لائے ہیں، لہذا ”من کان علیٰ بئیۃ من ربہ“ کے جملے سے مراد وہ تمام لوگ ہیں کہ جو کھلی آنکھوں سے اور اطمینان بخش دلائل کے ذریعے اور اس کے لانے والے پیروی کر رہے ہیں اور اس سے مراد خود پیغمبر اکرم نہیں ہیں۔

یہ تفسیر گزشتہ تفسیر پر یہ ترجیح رکھتی ہے کہ مبتداء کی خبر آیت میں صراحت سے آئی ہے، اس میں کوئی محذوف نہیں اور ”أُولَٰئِكَ“ کا مشار الیہ خود آیت میں مذکور ہے، نیز آیت کا پہلا حصہ کہ جو ”أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهِ“ شروع ہوتا ہے ”أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ“ تک ایک مکمل جملہ ہے اور اس میں کوئی حذف و تقدیر نہیں ہے۔

بلاشبہ آیت کی دوسری تعبیریں اس تفسیر سے مناسبت نہیں رکھتیں، اس لئے ہم نے اس تفسیر کو دوسرے مرحلے میں قرار

دیا ہے (غور کیجئے گا)۔  
بہر حال آیت اسلام اور سچے مسلمانوں کے امتیازات اور اس مکتب کے انتخاب میں محکم دلائل پر ان کے اعتماد کرنے کی طرف اشارہ ہے جبکہ دوسری طرف سے آیت متکبر منکرین کا انجام بد بیان کر رہی ہے۔

۱۔ آیت میں ”شاہد“ سے مراد بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں ”شاہد“ سے مراد وحی خدا کے قاصد جبرئیل (علیہ السلام) ہیں، بعض نے اس سے مراد پیغمبر اسلام لئے ہیں، بعض دوسرے مفسرین نے اس کی تفسیر زبان پیغمبر کی ہے (جبکہ ”یتلوہ“ کو ”تلاوت“ کے مادہ سے ”قرائت“ کے معنی میں لیا ہے، نہ کہ پیچھے آنے والے کے معنی میں) لیکن بہت سے بزرگ مفسرین نے اسے حضرت علی علیہ السلام سے تعبیر کیا ہے، اس ضمن میں ائمہ معصومین (علیہ السلام) سے بھی کئی روایات سے اس تفسیر کی تاکید ہوئی ہے کہ ”شاہد“ سے مراد حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں، جو پیغمبر اسلام اور قرآن پر ایمان لانے والے پہلے شخص ہیں، جو تمام مراحل میں رسول اللہ کے ساتھ رہے اور ایک لمحہ کے لئے فداکاری سے دریغ نہیں کیا اور آخری دم تک ان کی حمایت میں کوشاں رہے۔ (2)

ایک حدیث میں ہے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: قریش کے مشہور افراد کے میں ایک یا ایک سے زیادہ آیت نازل ہوئیں۔

کسی نے عرض کیا: اے امیر المومنین (علیہ السلام)! آپ (علیہ السلام) کے بارے میں کونسی آیت نازل ہوئی؟  
امام (علیہ السلام) نے فرمایا: کیا تونے سورہ بود کی یہ آیت نہیٹیڑھی ”أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيْتَةٍ مِنْ رَبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِنْهُ“، رسول اللہ خدائی ”بیئہ“ اور ”شاہد“ میں تھا۔ (3)

سورہ رعد کی آخری آیت میں بھی ایک تعبیر دکھائی دیتی ہے کہ جو اس معنی کی تاکید کرتی ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے:

کفار کہتے ہیں کہ تُو پیغمبر نہیں ہے، کہہ دو یہی کافی ہے کہ خدا میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور وہ کہ جس کے پاس علم کتاب (قرآن) ہے۔

سُنّی اور شیعہ طرق کی بہت سی روایات میں ہے کہ ”ومن عنده علم الكتاب“ سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے پھر اس نکتے کی طرف یاد دہانی ضروری ہے کہ کسی مکتب کی حقانیت کی پہچان کا ایک بہترین طریقہ اس کے پیروکار، مددکاروں اور حامیوں کی کیفیت کا مطالعہ ہے، مشہور ضرب المثل ہے کہ امامزادے کو اس کے زائرین سے پہچاننا چاہیے، جب دیکھیں کہ پاکباز، باشعور، صاحب ایمان، مخلص اور باتقویٰ افراد کسی رہبر اور مکتب کے گرد جمع ہیں تو اچھی طرح پہچانا جاسکتا ہے کہ یہ مکتب اور یہ رہبر صداقت کی حدبلند پر ہے، لیکن اگر دیکھیں کہ موقع پرست، دھوکے باز، بے ایمان اور بے تقویٰ افراد کسی مکتب یا رہبر کے گرد جمع ہیں تو بہت کم یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ مکتب اور یہ رہبر حق پر ہے۔

اس مطلب کی طرف اشارہ بھی ہم سمجھتے ہیں کہ لفظ ”شاہد“ سے حضرت علی علیہ السلام مراد لینا اس حقیقت کے منافی نہیں کہ ابوذر، سلمان، عمار یاسر جیسے تمام افراد اس کے مفہوم میں شامل ہیں کیونکہ ایسی تفاسیر اکمل و برتر کی طرف اشارہ ہوتی ہیں یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ارٹس و رئیس یہ فرد اکمل ہے، اس امر کی شاہد وہ روایت ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

”شاہد سے مراد امیر المومنین (علیہ السلام) ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے ان کے جانشین۔“ (4)

اس حدیث میں اگرچہ معصوم ہستیوں کا ذکر ہے لیکن یہ امر خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ روایات جن میں ”شاہد“ کو منحصر اُ حضرت علی (علیہ السلام) سے تفسیر کیا گیا ہے ان سے مراد فقط آپ (علیہ السلام) نہیں بلکہ مراد افضل و برتر کا مصداق ہے۔

- ۱۔ اس تفسیر کے مطابق ”من“ سے مراد پیغمبر اکرم ہیں، ”بیئہ“ سے مراد قرآن ہے اور ”شاہد“ سے کہ جو جنس کے معنی میں ہے سے مراد سچے مومنین ہیں جن کے راس و رئیس حضرت علی علیہ السلام ہیں، نیز ”منہ“ کی ضمیر خداتعالیٰ کی طرف اور ”قیلہ“ کی ضمیر قرآن یا پیغمبر اسلام کی طرف لٹوتی ہے۔
- 2۔ برہان، نور الثقلین، مجمع البیان اور دیگر تفاسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔
- 3۔ تفسیر برہان، ج ۲، ص ۲۱۳۔

۲- صرف تورات کی طرف اشارہ کیوں؟

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ پیغمبر کی حقانیت کی ایک دلیل زیر بحث آیت میں گزشتہ کتب بیان کی گئی ہیں، لیکن تذکرہ صرف حضرت موسیٰ کی کتاب کا ہوا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کے ظہور کی بشارتیں انجیل میں بھی ہیں۔ شاید یہ اس بناء پر ہو کہ نزول قرآن اور ظہور اسلام کے علاقے یعنی مکہ اور مدینہ میں زیادہ تر اہل کتاب میں سے یہودیوں کے افکار و نظریات پھیلے ہوئے تھے اور عیسائی نسبتاً دور کے علاقوں میں رہتے تھے مثلاً یمن، شامات اور نجران (جو شمالی یمن کے پہاڑی علاقوں میں صنعاء سے دس منزل کے فاصلے پر واقع تھا)۔

یا ہوسکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ اوصاف پیغمبر کا تذکرہ تورات میں زیادہ جامع اور زیادہ وسیع طور پر آیا تھا۔ بہر حال تورات کے بارے میں ”امام“ کی تعبیر ہوسکتا ہے اس بناء پر ہو کہ شریعتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے احکام پورے طور پر اس میں موجود تھے یہاں تک کہ عیسائی بھی اپنی بہت سی تعلیمات تورات سے لیتے ہیں۔

۳- ”فَلَا تَكُنْ فِي مَرْيَةَ“ میں مخاطب:

”فَلَا تَكُنْ فِي مَرْيَةَ“ میں مخاطب کون ہے، اس بارے میں دو احتمال ذکر کئے گئے ہیں:

پہلا احتمال یہ کہ پیغمبر اکرم ہیں یعنی قرآن یا انین اسلام کی حقانیت میں ذرہ بھر شک کورہ نہ دیجئے۔ البتہ اس حکم کی رو سے کہ وہ وی کو بطور شہود دیکھتے تھے اور خدا کی طرف سے نزول قرآن ان کے لئے محسوس طور پر بلکہ جس سے بھی بالا تھا، آپ کو اس دعوت کی حقانیت میں کسی قسم کا کوئی شک نہ تھا لیکن یہ کوئی پہلا موقع نہیں کہ قرآن میں خطاب تو پیغمبر اکرم سے ہے جبکہ مراد تمام لوگ بینا اور عربوں کی مشہور تعبیر کے مطابق ایسے خطاب ”اِتَاكَ اَعْنَى وَاِسْمَعَى يَا جَارَةَ“ (میری مراد تو تم ہو اور پڑوسن تم بھی سُن لو) کی طرح کے ہیں۔

فارسی میں کہتے ہیں:

در بہ تو گویم دیوار تو گوش کن یا تو بشنو

اے دروازہ! میں تجھے کہہ رہا ہوں، دیوار! تُو سن لے۔

یہ فنونِ لغت میں سے ہے کہ کئی مواقع پر تاکید اور اہمیت کے لئے یا دیگر مقاصد کے لئے حقیقی مخاطب کے بجائے دوسرے شخص سے خطاب کیا جاتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ہر مکلف عاقل مخاطب ہے یعنی ”فلا تک ایہا المكلف العاقل فی مریة“ یعنی اے عاقل و مکلف انسان! ان واضح دلائل کے ہوتے ہوئے اس قرآن کی حقانیت میں شک نہ کر“ اور یہ احتمال اس بناء پر ہے کہ ”من کان علی بیتہ من ربہ“ سے مراد پیغمبر نہ ہوں بلکہ تمام سچے مومنین ہوں (غور کیجئے گا) لیکن بہر حال پہلی تفسیر آیت سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

۱۸ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ

۱۹ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ

۲۰ أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءٍ يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ

۲۱ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ

۲۲ لَاجِرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمْ الْأَخْسَرُونَ

ترجمہ

۱۸۔ ان لوگوں سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو خدا پر افتراء باندھتے ہیں وہ (روز قیامت) اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہوں گے اور شاہد (انبیاء اور فرشتے) کہیں گے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا تھا، خدا کی لعنت ہو ظالموں پر۔

۱۹۔ وہی لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے تھے اور راہِ حق میں کجی دکھانا چاہتے تھے اور آخرت کا کفر کرتے تھے۔

۲۰۔ وہ زمین میں کبھی بھی فرار کی طاقت نہیں رکھتے اور خدا کے سوا کوئی دوست اور سرپرست نہیں پائیں گے ان کے

لئے کئی گنا عذاب الہی ہوگا (کیونکہ وہ خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچتے تھے) اور کبھی کبھی (حق بات) سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور (حقائق کو) نہیں دیکھتے تھے۔  
 ۲۱۔ وہ ایسے لوگ جو اپنا سرمایہ ہستی گنوا بیٹھے ہیں اور جھوٹے معبود ان کی نظر سے کھو گئے ہیں۔  
 ۲۲۔ (اسی بناء پر) یقیناً وہ آخرت میں سب سے زیادہ زیانکار ہیں۔

سب سے زیادہ زیاں کار گزشتہ آیت قرآن اور رسالت پیغمبر کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی، اس کے بعد زیر بحث آیات کی نشانیوں اور ان کے انجام کار کے متعلق تفصیلی بحث کر رہی ہیں، پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوسکتا ہے کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے (وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا)۔  
 یعنی سچے پیغمبر کی دعوت کی نفی کلمات الہی کی نفی ہے اور اس کی طرف جھوٹ کی نسبت دیتا ہے۔ اصولی طور پر تکذیب پیغمبر تکذیب خدا ہے، اس شخص پر جھوٹ باندھنا کہ جو صرف خدا کی طرف سے بات کرتا ہے خدا کی ذات پاک پر جھوٹ باندھنا شمار ہوگا۔ (۱)

جیسا کہ ہم نے متعدد بار کہا ہے قرآن مجید کی مختلف آیات میں لوگوں کو سب سے بڑھ کر ظالم ("اظم") قرار دیا گیا ہے حالانکہ ظاہراً ان کے کام آپس میں مختلف ہیں اور ممکن نہیں ہے کہ مختلف کام کرنے والے مختلف گروہوں میں سے ہر ایک کو سب سے بڑھ کر ظالم شمار کیا جائے بلکہ چاہیے کہ ایگ گروہ ستمگر یا ستمگر تر ہوا اور دوسرا ستمگر ترین ہو لیکن جیسا کہ اس سوال کے جواب میں ہم نے بار بار کہا ہے کہ ان تمام اعمال کی بنیاد ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے شرک اور آیات الہی کی تکذیب جو کہ سب سے بڑی تہمت ہے۔

مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد پنجم صفحہ ۱۶۰ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔  
 اس کے بعد قیامت ان کے بُرے مستقبل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: اس روز وہ بارگاہ پروردگار میں اپنے تمام اعمال اور کردار کے ساتھ پیش ہوں گے اور اس کی عدالت میں حاضر ہوں گے (أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ)۔  
 "اس وقت اعمال کے شاہد گواہی دیں اور کہیں گے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے عظیم مہربان اور ولی نعمت پروردگار جھوٹ باندھنا تھا (وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَّبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ)۔  
 اس کے بعد کھلے بندوں کہیں گے: ظالموں پر خدا کی لعنت ہو (أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ)۔

اس بارے میں کہ شاہد خدائی فرشتے ہیں کہ یا اعمال لکھنے پر مامور ملک ہیں یا انبیاء ہیں، مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کئے ہیں لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے قرآن کی دوسری آیات میں انبیاء الہی کا تعارف اعمال کے شاہدین کے طور پر کروایا گیا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں بھی وہی مراد ہیں یا اس سے وسیع تر مفہوم مراد ہے جس میں دیگر گواہ بھی شامل ہیں۔

سورہ نساء کی آیت ۴۱ میں ہے:

ان کا کیا حال ہوگا جب اس دن ہم ہر امت کے لئے ان کے اعمال کے گواہ بلائیں گے اور تجھے ان پر گواہ قرار دیں گے۔  
 حضرت مسیح (علیہ السلام) کے بارے میں سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۷ میں ہے:

"میں جب تک اپنے پیروکاروں کے درمیان تھا ان کے اعمال پر گواہ تھا۔  
 نیز اس سلسلے میں کہ "أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ" کہنے والا خدا ہے یا گواہ ہیں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہر آیت یہ ہے کہ بات گواہوں کی گفتگو کے تسلسل میں ہے۔

بعد والی آیت ظالموں کی صفات تین ظالموں کی صفات تین جملوں میں بیان کی گئی ہیں۔  
 پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے افراد ہیں جو لوگوں کو مختلف ذریعوں سے راہ خدا سے روکتے ہیں (الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ)۔ ایسا وہ کبھی شک و شبہ پیدا کر کے کرتے ہیں، کبھی دھمکی سے کام لیتے ہیں اور کبھی لالچ دے کر مقصد حاصل کرتے ہیں اور ان سب کا امور کا ہدف ایک ہی ہے اور وہ راہ خدا سے روکتا۔

دوسرا یہ کہ وہ خاص طور پر کوشش کرتے ہیں کہ خدا کی راہ مستقیم کو ٹیڑھا کر کے دکھائیں (وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا)۔ یعنی طرح طرح کی تحریفیں کرے، کمی بیشی کرے، تفسیر بالرائے کر کے اور حقائق کو مخفی رکھ کر ایسا کرتے ہیں کہ یہ سیدھا راستہ اپنی اصلی صورت میں لوگوں کے سامنے نہ آئے تاکہ لوگ اس راستے پر نہ جاسکیں اور حق طلب افراد جادہ حقیقی کو نہ پہچان سکیں۔ (۲)

نیز یہ کہ وہ قیامت اور روزِ جزا پر ایمان نہیں رکھتے (وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ)۔ اور معاد پر ان کا ایمان نہ رکھنا ان کے سب انحرافات اور تباہ کاریوں کا سرچشمہ ہے کیونکہ موت کے بعد اس بڑی عدالت اور وسیع عالم پر ایمان لانے سے قلب و روح کی تربیت ہوتی ہے۔

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ یہ تمام امور ”ظلم“ کے مفہوم میں جمع ہیں کیونکہ اس لفظ کے وسیع مفہوم میں ہر قسم کا انحراف اور اشیاء، اعمال، ثفات اور عقائد کو ان کی حقیقی جگہ سے تبدیل کر دینا شامل ہے۔ لیکن بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں کے باوجود ”ایسا نہیں ہے کہ وہ روئے زمین پر خدا کی سزا اور عذاب سے فرار حاصل کر سکیں اور اس کی قدرت کی قلمرو سے نکل سکیں گے“ (أُولَئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ)۔ ”اسی طرح وہ خدا کے علاوہ اپنے لئے کوئی حامی و مددگار نہیں پاسکتے“ (وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءٍ)۔ آخر میں ان کی سنگین سزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ان کا عذاب کئی گنا ہو جائے گا (يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ)۔ کیونکہ وہ خود بھی گمراہ، گناہگار اور تباہکار تھے اور دوسرے کو بھی انہی راہوں کی طرف کھینچتے تھے، اس بناء پر وہ اپنے گناہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائیں گے اور دوسرے کے گناہوں کا بھی (جبکہ ان دوسرے گناہ کرنے والوں کی سزا میں بھی کمی نہیں ہوگی)۔ اس مفہوم پر قرآن کی دوسری آیات شاہد ہیں، مثلاً:

روزِ قیامت وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اور ان کے ساتھ دوسرے بوجھ اور گناہ اپنے دوش پر اٹھائیں گے۔ (عنکبوت/۱۳) نیز بہت سی روایات میں ہے کہ جو شخص کسی بُری سنت کی بنیاد رکھے گا اس بُری سنت پر عمل کرنے والے تمام لوگوں کا ”عذر“ اور گناہ اس کے کھاتے میں لکھا جائے اور اسی طرح جو شخص کسی اچھی نیت سنت کی بنیاد رکھے گا اس پر عمل کرنے والے لوگوں کی جزا کے برابر ثواب اس کے لئے لکھا جائے گا۔

آیت کے آخر میں ان کی بدبختی کی اصل بنیاد کا ذکر یوں کیا گیا ہے: ان کے پاس سننے والا کان ہے نہ دیکھنے والی آنکھ (مَا كَانُوا يَسْتَمِطِعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ)۔ درحقیقت جب یہ دونوں وسائل حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہو جاتے ہیں تو وہ خود بھی گمراہی میں گر جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں کیونکہ کھلی آنکھ اور گوشِ شنوا کے بغیر حق و حقیقت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ اس جملے میں ہے کہ وہ (حق بات) سننے کی طاقت نہیں رکھتے، یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے لئے حق باتوں کا سننا اس قدر بوجھل ہے کہ گویا وہ اسے سننے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، یہ تعبیر بعینہ ایسے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ عاشق اپنے معشوق کی برائی نہیں سن سکتا۔

واضح ہے کہ حقائق فہمی کی اس طرح سے طاقت نہ ہونا، اس کی سخت ہٹ دھرمی اور حق دشمنی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب ان کی مسئولیت ختم ہو گئی ہے، اصطلاح میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے جس کے اسباب انہوں نے خود مہیا کیے ہیں جبکہ وہ طاقت رکھتے تھے کہ اس حالت کو اپنے سے دُور رکھیں کیونکہ سبب پر قدرت رکھنا مسبب پر قدرت رکھنے کے مترادف ہے۔

بعد والی آیت میں ان کی غلط مساعی کو ایک ہی جملہ میں بیان کیا گیا ہے: یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے وجود کا سرمایہ گنوا بیٹھے اور خسارے میں رہے (أُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ)۔ اور یہ عظیم ترین گناہ ہے جو انسان کو دامن گیر ہو سکتا ہے وہ اپنی ہستی ہی گنوا بیٹھے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ”انہوں نے جھوٹے معبودوں سے دل لگالیا ہے“ لیکن آخر کا یہ سب بناوٹی معبود گم ہو گئے اور ان کی نظر سے محو ہو گئے“ (وَصَلَّىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ)

زیر بحثِ آخری آیت میں ان کے انجام کے بارے میں یقینی اور آخری حکم کو قطعی صورت میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے: ناچار وہ آخرت کے گھر میں سب سے زیادہ نقصان میں ہوں گے (لَا جَرَمَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمْ الْأَخْسَرُونَ)۔ کیونکہ وہ دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ اپنے انسانی وجود کا تمام سرمایہ گنوا بیٹھے ہیں اور اس حالت میں اپنا بارِ مسئولیت بھی اٹھائے ہوئے ہیں اور دوسروں کی ذمہ داری بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔

”جرم“ (بروزن ”حرم“) اصل میں درخت سے پھل چننے کے معنی میں ہے (جیسا کہ مفردات میں راغب نے ذکر کیا ہے) بعد ازاں یہ لفظ ہر قسم کے اکتساب اور تحصیل امر کے لئے استعمال ہونے لگا اور نامناسب کسب کا مفہوم پیدا ہو گیا، اسی لئے گناہ کو جرم کہا جاتا ہے لیکن جب یہ لفظ ”لا“ کے ساتھ کسی جملے کی ابتداء میں ”لاجرم“ کی صورت میں آئے تو پھر یہ معنی دیتا ہے کہ ”کوئی چیز اس امر کی نہیں روک سکتی“ اسی لئے ”لاجرم“ ناچار ”یقیناً“ اور ”مسلماً“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (غور کیجئے گا)۔

- .....
- ۱۔ یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس جملے سے مراد اُن لوگوں کو جواب دینا ہے جو کہتے ہیں کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتا ہے، بہت بعید ہے کیونکہ پہلے والے اور بعد کی آیات اس ترتیب سے مناسبت رکھتیں بلکہ مناسب یہی ہے کہ یہ کفار کی طرف اشارہ ہے۔
- 2۔ ”عوج“ کا معنی کجی اور ٹیڑھ پن ہے، اس سلسلے میں جلد ۶ صفحہ ۱۶۱ (اردو ترجمہ) پر ہم تشریح کرچکے ہیں، ضمنی طور پر توجہ رہے کہ ”بیعقونہا“ کی ضمیر سبیل کی طرف لوتتی ہے جو مونث مجازی ہے یا یہ طریقہ اور جادہ کے معنی میں ہے جو مونث لفظی ہیں سورہ یوسف کی آیت ۱۰۸ میں ہے:

#### تفسیر نمونہ جلد 09

۲۳ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ  
 ۲۴ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصْمَىٰ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا أَفَلَا تَذَكَّرُونَ

ترجمہ

- ۲۳۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے اور جو خدا کے سامنے خاضع اور تسلیم تھے اصحابِ جنت ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔
- ۲۴۔ ان دو گروہوں (منکرین اور مومنین) کی حالت ”اندھوں اور بہروں“ اور ”دیکھنے اور سننے والوں“ کی سی ہے۔ کیا یہ دونوں گروہ ایک جیسے ہوسکتے ہیں، کیا تم فکر نہیں کرتے ہو۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں وحی الہی کے ایک گروہ کی حالت بیان کی گئی تھی، یہ دو آیات ان کے مقابل سچے مومنین کی حالت بیان کر رہی ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے اور خدا کے سامنے خاضع اور تسلیم رہے اور اس کے عدول پر مطمئن رہے وہ اصحابِ جنت ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے (إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ)۔

دو قابلِ توجہ نکات

۱۔ تین مربوط حقائق:

ایمان، عملِ صالح اور دعوتِ حق کے سامنے سرتسلیم خم، در اصل تین ایسے حقائق ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں کیونکہ عملِ صالح شجرِ ایمان کا ثمر ہے، وہ ایمان جس کا ثمرہ عملِ صالح نہ ہو ایسا کمزور اور بے وقعت ہوتا ہے کہ جو کسی شمار میں نہیں لایا جاسکتا، اسی طرح سرتسلیم خم اور پروردگار کے وعدوں پر اطمینان ایسا مسئلہ ہے جو ایمان اور عملِ صالح کے آثار میں سے نہیں ہے کیونکہ صحیح اعتقاد اور پاک عمل ہی انسان کی جان اور روح ہیں ان بلند صفات و ملکات کے پیدا ہونے کا سرچشمہ ہے۔

2۔ ”أَخْبَتُوا“ کا مفہوم:

”أَخْبَتُوا“ ”اخبات“ کے مادہ سے ہے اس کی اصل ”خبت“ (بروزن ”ثبت“) ہے جس کے معنی ہیں صاف اور وسیع زمین جس میں آرام و اطمینان سے چل پھر سکتا ہے، اسی بناء پر یہ مادہ اطمینان کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور خضوع و تسلیم کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ ایسی زمین چلنے پھرنے کے لئے بھی اطمینان بخش ہے اور خود چلنے والوں کے



سامنے خاضع اور تسلیم بھی ہے -

اسی بناء پر جملہ ”أَخْبَتُوا إِلَيَّ رَبِّهِمْ“ ہوسکتا ہے مندرجہ ذیل متن میں سے کسی ایک معنی میں ہو اگرچہ تینوں معانی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے:-

۱- سچے مومنین خدا کے سامنے خاضع ہیں -

۲- وہ اپنے پروردگار کے سامنے سرتسلیم خم کئے ہوئے ہیں -

۳- وہ خدا کے وعدوں پر اطمینان رکھتے ہیں -

ہر صورت میں مومنین کی ایک عالی ترین صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کا اثر ان کی تمام زندگی میں منعکس ہوتا ہے -

یہ امر جاذب نظر ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہے کہ آپ (علیہ السلام) کے اصحاب میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ ہمارے درمیان کلیب نامی ایک شخص ہے، آپ (علیہ السلام) سے مروی جو بھی حدیث اس تک پہنچے وہ فوراً کہتا ہے کہ میں اس کے سامنے تسلیم ہوں، اس لئے کہ اس کا نام ”کلیب تسلیم“ رکھ دیا ہے - امام (علیہ السلام) نے فرمایا: اس پر خدا کی رحمت ہو، پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تسلیم کسے کہتے ہیں، ہم خاموش رہے تو فرمایا: خدا کی قسم یہ وہی ”اخبات“ ہے جو خدا کے کلام ”الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَيَّ رَبِّهِمْ“ میں آیا ہے - (۱)

بعد والی آیت میں خدا اس گروہ کی حالت کو ایک واضح اور زندہ مثال کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ان دو گروہوں کی حالت، نابینا اور بہرے اور بینا اور سننے والے“ کی سی ہے (مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَى وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ) - کیا یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مساوی ہیں (هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا) کیا تم تذکر نہیں کرتے اور غور و فکر نہیں کرتے (أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ) -

جیسا کہ علم معانی میں آیا ہے کہ ہمیشہ حقائق عقلی کو مجسم کرنے اور عمومی سطح پر ان کی وضاحت و صراحت کے لئے معقولات کو محسوسات سے تشبیہ دیتے ہیں، قرآن نے اس طریقہ کا زیادہ استعمال کیا ہے اور بہت سے حساس اور پُر اہمیت مسائل کو واضح اور خوبصورت مثالوں سے استفادہ کرتے ہوئے حقائق کو عالی ترین صورت میں بیان کیا ہے، مندرجہ بالا بیان بھی اس قسم کا ہے کیونکہ مؤثر ترین وسیلہ جسے حقائق کی شناخت کے لئے مادہ و طبیعت میں آنکھ اور کان ہیں، اسی بناء پر یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ افراد جو آنکھ اور کان سے مکمل طور پر مثلاً مادر زاد صورت میں بے بہرہ ہوں کسی چیز کا اس جہان طبیعت میں صحیح طور پر ادراک حاصل کر لیں، وہ مسلماً ایک مکمل بے خبری کے عالم میں زندگی بسر کریں گے، اسی طرح وہ افراد جو ہٹ دھرمی، حق دشمنی، تعصب، خود خواہی اور خود پرستی کے چنگل میں گرفتار ہونے کی وجہ سے حقیقت میں آنکھ اور کان گنوا بیٹھے ہیں وہ ہرگز عالم غیب سے مربوط حقائق، ایمان کے اثرات، لذتِ عبادتِ خداوندی اور اس کے فرمان کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی عظمت کا ادراک نہیں کرسکتے، ایسے افراد اندھوں، بہروں کی مانند ہیں جو گھٹا ٹوپ اندھیرے اور موت کی خاموشی میں زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ مومن دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان سے ہر حرکت کو دیکھتے ہیں اور ہر صدا کوسنتے ہیں اور اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا راستہ سعادت آفرین راہ کی طرف اختیار کر لیتے ہیں -

۲۵ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ

۲۶ أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمِ الْآلِيمِ

۲۷ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشْرًا مِثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ إِلَّا الَّذِي هُمْ أَرَادُوا بِادِي الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ

۲۸ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَأَتَانِي رَحْمَةٌ مِنْ عِنْدِهِ فَعَمَّيْتُ عَلَيْكُمْ أَنْزِلْ مُكُومَهَا وَانْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ

ترجمہ

۲۵- ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا (پہلی مرتبہ اس نے ان سے کہا) میں تمہارے لئے واضح ڈرانے والا ہوں  
۲۶- (میری دعوت یہ ہے کہ) سوائے اللہ کے (جو واحد یکتا خدا ہے) کسی کی عبادت نہ کرو میں تم پر دردناک دن والے عذاب سے ڈرتا ہوں -

۲۷- اس کی قوم کے کافر سرداروں نے (جواب میں) کہا: ہم تو تجھے صرف اپنے جیسا بشر پاتے ہیں اور وہ لوگ جنہونے تیری پیروی کی ہے انہیں ہم سوائے سادہ لوح پست لوگوں کے نہیں پاتے اور تمہارے لئے کوئی فضیلت اپنی

نسبت نہیں دیکھتے بلکہ تمہیں دروغ گو خیال کرتے ہیں۔

۲۸۔ (نوح نے) کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس نے اپنی طرف سے مجھے رحمت عطا کی ہے جو تم پر مخفی ہو (پھر بھی تم میری رسالت کا انکار کرو گے) کیا میں تمہیں واضح امر قبول کرنے پر مجبور کرسکتا ہوں جبکہ تم آمادہ نہیں ہو۔

۱۔ تفسیر برہان: ج ۲، ص ۱۱۶۔

حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم کی ہلا دینے والی سرگزشت

جیسا کہ ہم نے سورہ کی ابتداء میں بیان کیا ہے اس سورہ مینافکار کو بیدار کرنے اور زندگی کے حقائق کی طرف متوجہ کرنے اور تہکاریوں کی بُری سرنوشت کی طرف توجہ دلانے اور کامیابی اور موفقیت کی راہ بیان کرنے کے لئے گزشتہ انبیاء کے تاریخ کے اہم حصے بیان ہوئے۔

سب سے پہلے اولوالعزم پیغمبر حضرت نوح (علیہ السلام) کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور ۲۶ آیات میں ان کی تاریخ کے اساسی اور بنیادی نکات کی ہلادینے والی شکل میں تشریح کی گئی ہے، اس میں شک نہیں کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کا قیام اور ان کے اپنے زمانے کے متکبروں کے ساتھ شدید اور مسلسل جہاد اور ان کے بُرے انجام کی داستان تاریخ بشر کے فراز میں ایک نہایت اور بہت عبرت انگیز درس کی حامل ہے۔

مندرجہ بالا آیات پہلے مرحلے میں اس عظیم دعوت کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں: ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، اس نے انہیں بتایا کہ میں واضح ڈرانے والا ہوں (وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ)۔

انبیاء کے لفظ ”نذیر“

انبیاء ڈرانے والے بھی تھے اور خوش خبری دینے والے بھی پھر ”انذار“ (ڈرانے) کے مسئلہ پر انحصار صرف اس بناء پر کیا گیا ہے چونکہ انقلاب کی پہلی ضرب جو خطرے کے اعلان اور ڈرانے سے شروع کیا جائے کیونکہ اس کی تاثیر سوئے ہوئے اور غافل لوگوں کو بیدار کرنے میں بشارت کی نسبت زیادہ ہے، اصولی طور پر جب تک انسان کوئی بُرا خطرہ محسوس نہ کرے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا اور اسی بناء پر انبیاء کے انذار اور خطرے کے اعلان کو تازیانہ کی شکل میں گمراہیوں کی بے درد روحوں پر پڑتے تھے کہ جو شخص بھی حرکت کی طاقت رکھتا وہ حرکت میں آجاتا تھا نیز اسی بناء پر قرآن کی بہت سی آیات میں (مثلاً سورہ حج ۴۹، شعراء ۱۱۵، عنکبوت ۵۰، فاطر ۴۲، ص ۷۰، احقاف ۹، ذاریات ۵۰، اور دیگر آیات میں) ہر جگہ دعوتِ انبیاء کو بیان کرتے وقت لفظ ”نذیر“ (ڈرانے والے) استعمال کیا گیا ہے۔ بعدوالی آیات پہلی ضرب کے بعد اپنی رسالت کے مضمون کو صرف ایک جملہ میں بطور خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: میرا پیغام یہ ہے کہ ”اللہ“ کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش نہ کرو (أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ)۔ پھر بلافاصلہ اس کے پیچھے اسی مسئلہ انذار اور اعلامِ خطر کا تکرار کرتے ہوئے کہتا ہے: میں تم پر دردناک دن سے ڈرتا ہوں (إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ)۔ (۱)

اصل میں اللہ (خدائے یکتا و یگانہ) کی توحید اور عبادت ہی تمام انبیاء کی دعوت کی بنیاد ہے اور اسی بناء پر تمام انبیاء کے حالات میں جیسا کہ اس سورہ کی دوسری آیت اور سورہ یوسف کی آیت ۴۰ اور سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ میں بھی آیا ہے یہی تعبیر نظر آتی ہے کہ وہ اپنی دعوت کا خلاصہ توحید کو قرار دیتے تھے۔

سچ مچ اگر تمام افراد اور معاشرہ اللہ کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور طرح طرح کے بنائے ہوئے بتوں کے سامنے چاہے بیرونی بت ہوں یا اندرونی، خود خوابی، ہوا و ہوس، شہوت و ثروت، مقام و منزلت، جاہ و جلال، عورت و اولاد ہوں سر تسلیم خم نہ کریں تو کسی قسم کی خرابی اور فساد معاشروں میں پیدا نہ ہو۔ اگر انسان خود کاسہ توانائی کو ایک بت کی صورت میں نہ لائے اور اس کے سامنے سجدہ نہ کرے اور اس کی فرمانبرداری نہ کرے تو استبداد اور استعمار وجود میں نہ آئے اور نہ ہی اس کے بُرے آثار، ذلت اور اسارت پیش آئیں اور نہ ہی وابستگی اور طفیلی ہونے کی بنیاد پڑے، تمام بدبختیاں جو افراد اور معاشروں کو دامنگیر ہوں اسی اللہ کی پرستش سے انحراف اور بتوں اور طاغوتوں کی پرستش کی طرف رخ کرنے کی وجہ سے ہیں۔

اب ہم دیکھیں گے کہ پہلا درعمل اس زمانے کے طاغوتوں، خود سروں اور صاحبانِ زورور کا اس عظیم دعوت اور

واضع اعلام کے مقابلے میں کیا تھا، مسلماً سوائے کچھ بیہودہ اور جھوٹے عذر بہانوں اور بے بنیاد استدلالوں کے جو کہ ہر زمانے کے جابروں کا طریقہ کار ہے ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

انہوں نے حضرت نوح (علیہ السلام) کی دعوت کے تین جواب دیئے:

۱۔ قوم نوح (علیہ السلام) کے سردار اور سرمایہ دار کافر تھے، انہوں نے کہا ہم تو تجھے صرف اپنے جیسا انسان دیکھتے ہیں (قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا تَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا)۔ حالانکہ اللہ کی رسالت اور پیغام تو فرشتوں کو اپنے کاندھوں پر لینا چاہیے، نہ کہ ہم جیسے انسانوں کو، اس گمان کے ساتھ کہ انسان کا مقام فرشتوں سے نیچے ہے یا انسان کی ضرورت کو فرشتہ انسان سے بہتر جانتا ہے، پھر ہم یہاں لفظ ”ملاء“ کاسامنا کر رہے ہیں یعنی صاحبان اقتدار، سرمایہ دار اور ایسے افراد جن پر لوگوں کی نظریں جمتی ہیں لیکن وہ اندر سے خالی ہوتے ہیں، یہ لوگ ہر معاشرے میں فساد اور تباہی کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں اور انبیاء کے مقابلے میں مخالفت کا پرچم بلند کرتے ہیں۔

۲۔ انہوں نے کہا: اے نوح! ہم تیرے گرد و پیش اور ان کے درمیان کہ جنہوں نے تیری پیروی کی ہے سوائے چند پست، ناگاہ اور بے خبر تھوڑے سن و سال کے نوجوانوں کے کہ جنہوں نے مسائل کی دیکھ بھال نہیں کی کسی کو نہیں دیکھتے (وَمَا تَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بِادْبَارِكُمْ)۔

”باراندل“ ”ارذل“ (بروزن اہرم) کی جمع ہے اور وہ خود ”رذل“ کی جمع ہے جو پست و حقیر موجود کے معنی میں ہے چاہے وہ انسان ہے یا کوئی اور چیز۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرف مائل ہونے والے اور ان پر ایمان لانے والے لوگ نہ ارادل تھے اور نہ ہی حقیر و پست، تاہم اس بناء پر چونکہ انبیاء ہر چیز سے پہلے مستضعفین کے حمایت اور مستکبرین سے مبارزہ اور جہاد کرتے تھے لہذا پہلا گروہ جو انبیاء کی دعوت پر لبیک کہتا وہی محروم، فقیر اور کم آمدنی والے لوگ ہوتے تھے، جو مستکبرین کی نگاہ میں جو کہ شخصیت کامعیار دولت اور اقتدار کو سمجھتے تھے پست اور حقیر افراد شمار ہوتے تھے اور یہ جو انہیں ”بادی الرأی“ (ظاہر بین ہے مطالعہ اور وہ شخص جو پہلی نظر میں کسی چیز کا عاشق اور خواہاں ہوتا ہے) کا نام دیا ہے حقیقت میں اس بناء پر ہے کہ وہ ہٹ دھرمی اور غیر مناسب تعصبات جو دوسروں میں تھے وہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ زیادہ تر پاک دل نوجوان تھے جو حقیقت کی پہلی کرن کو جو اُن کے دل پر پڑتی جلدی محسوس کر لیتے تھے، وہ اس بیداری کے ساتھ جو کہ حق کی تلاش سے تلاش سے حاصل ہوتی ہے صداقت کی نشانیاں انبیاء کے اقوال و افعال کا ادراک کر لیتے تھے۔

۳۔ اُن کا آخری اعتراض یہ تھا کہ قطع نظر اس سے کہ تو انسان ہے نہ کہ فرشتہ، علاوہ ازیں تجھ پر ایمان لانے والے نشانہبی کرتے ہیں کہ تیری دعوت کے مشتملات صحیح نہیں ہیں، اصولی طور پر تم ہم پر کسی قسم کی برتری نہیں رکھتے کہ ہم اس بناء پر تیری پیروی کریں (وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ)۔ لہذا ہم گمان کرتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو (بَلْ تَطْنَكُمُ كَاذِبِينَ)۔

۱۔ باوجودیکہ دردناک عذاب ک صفت ہے لیکن زیر نظر آیت مینیوم کی صفت قرار دی گئی ہے یہ ایک قسم کی لطیف اسنادحجازی ہے جو مختلف زبانوں کی ادبیات میں آتی ہے فارسی میں بھی ہم کہتے ہیں ”فلاں دن بڑا دردناک تھا“ حالانکہ خود دن دردناک نہیں تھا بلکہ اس کے حوادث دردناک تھے۔

حضرت نوح کے جوابات

بعد والی آیات میں ان بہانہ جو اور فسانہ ساز افراد کو حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرف سے دیئے گئے جوابات ذکر کئے گئے ہیں، پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے قوم! میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل اور معجزہ کا حامل ہوں اور اس نے اس رسالت و پیغام کی انجام دہی کی وجہ سے اپنی رحمت میرے شامل حال کی ہے اور یہ امر عدم توجہ کی وجہ سے تم سے مخفی رہ گیا تو کیا پھر بھی تم میری رسالت کا انکار کر سکتے ہو اور میری پیروی سے دست بردار ہوسکتے ہو (قَالَ يٰقَوْمِ اَرَأَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّيْ وَآتَانِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيْتُ عَلَيْكُمْ)۔

اس بارے میں کہ یہ جواب قوم نوح (علیہ السلام) کے مستکبرین کے تین سوالوں میں سے کس کے ساتھ مربوط ہے مفسرین کا بہت اختلاف ہے لیک غور و خوض سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ جامع جواب تینوں اعتراضات کا جواب بن سکتا ہے کیونکہ ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ تم انسان ہو، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: یہ بجا ہے کہ میں تمہاری طرح کا ہی انسان ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت میرے شامل حال ہوئی ہے اور اس نے مجھے کھلی اور واضح نشانیاں دی ہیں اس بناء پر

میری انسانیت اس عظیم رسالت سے مانع نہیں ہوسکتی اور یہ ضروری نہیں کہ میں فرشتہ ہوتا۔ ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تمہارے پیروکار بے فکر اور ظاہر بین افراد ہیں، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: تم بے فکر اور سمجھ بوجھ اس واضح حقیقت کا انکار کرتے ہو حالانکہ میرے پاس ایسے دلائل موجود ہیں جو ہر حقیقت کے متلاشی انسان کے لئے کافی ہیں اور اسے قائل کرسکتے ہیں مگر تم جیسے افراد جو غرور، خود خوابی، تکبر اور جاہ طلبی کا پردہ اوڑھے ہوئے ہیں ان کی حقیقت بین آنکھ بیکار ہوچکی ہے۔

ان کا تیسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: ہم کوئی برتری اور فضیلت تمہارے لئے اور اپنی نسبت نہیں پاتے، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا اس سے بالاتر کونسی برتری ہے کہ خدا نے اپنی رحمت میرے شامل حال کی ہے اور واضح مدارک و دلائل میرے اختیار میں دیئے ہیں، اس بناء پر ایسی کوئی وجہ نہیں کہ تم مجھے جھوٹا خیال کرو کیونکہ میری گفتگو کی نشانیاں ظاہر ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کیا میں تمہیں اس ظاہر بظاہر بینہ کے قبول کرنے پر مجبور کرسکتا ہوں جبکہ تم خود اس پر آمادہ نہیں ہو اور اسے قبول کرنا بلکہ اس کے بارے میں غور و فکر کرنا بھی پسند نہیں کرتے ہو (أَنْزَلْنَاكُمْ هَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ)

#### تفسیر نمونہ جلد 09

۲۹ وَيَا قَوْمِ لَأَسْأَلَنَّكُمْ عَلَيْهِ مَا لَأِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّهُمْ مُلَأُوا رَبَّهُمْ وَلَكِنِّي أَرَأَيْتُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ  
 ۳۰ وَيَا قَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُمْهُمْ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ  
 ۳۱ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ إِنِّي إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ

ترجمہ

۲۹۔ اے قوم نوح! میں اس دعوت کے بدلے تم سے کچھ نہیں چاہتا میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور میں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں (تمہاری وجہ سے) دھتکارنا نہیں ہوں کیونکہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات کریں گے (اور قیامت کی عدالت میں میرے مقابل تمہیں پائیں گے) لیکن تمہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ تم جاہل ہو۔

۳۰۔ اے قوم! اگر میں انہیں دھتکار دوں تو خدا (کے عذاب) کے مقابلے میں کون میری مدد کرے گا، کیا تم سوچتے نہیں ہو۔

۳۱۔ میں تمہیں کبھی نہیں کہوں گا کہ خدائی خزانے میرے پاس ہیں، نہ میں کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ یہ کہ میں فرشتہ ہوں اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ لوگ جو تمہاری نگاہ میں ذلیل و خوار نظر آتے ہیں خدا انہیں خیر نہیں دے گا، خدا ان کے دلوں سے زیادہ آگاہ ہے (میں اگر اس کے باوجود دُور کردوں) تو اس صورت میں میں ظالموں میں سے ہوں گا۔

صاحب ایمان افراد کو دھتکارا نہیں جاسکتا

ہم نے گزشتہ آیات میں دیکھا ہے کہ خود غرض اور بہانہ جو قوم حضرت نوح (علیہ السلام) پر مختلف اعتراضات کرتی تھی جن کا انہوں نے نہایت عمدہ اور واضح جواب دیا، زیر بحث آیات میں بھی ان کی بہانہ تراشیوں کا جواب دیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں نبوت کی ایک دلیل بیان کی گئی ہے جو حضرت نوح (علیہ السلام) نے تاریک دل قوم کو روشنی بخشنے کے لئے پیش کی تھی، ارشاد ہوتا ہے: اے قوم! میں اس دعوت کے بدلے تم سے مال و ثروت اور اجر و جزاء کا مطالبہ نہیں کرتا (وَيَا قَوْمِ لَأَسْأَلَنَّكُمْ عَلَيْهِ مَا لَأِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ)۔ میرا اجر و جزاء صرف اللہ پر ہے وہ خدا کہ جس نے مجھ نبوت کے ساتھ مبعوث کیا ہے اور مخلوق کو دعوت دینے پر مامور کیا ہے (إِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ)۔

یہ امر اچھی طرح سے نشاندہی کرتا ہے کہ اس پروگرام سے میرا کوئی مادی ہدف نہیں، میں سوائے خدا کے معنوی

وروحانی اجر کے کچھ بھی نہیں دیکھتا ہوں اور کوئی جھوٹا مدعی ایسا نہیں ہوسکتا جو اس قسم کے سردرد، ناراحتی اور بے آرامی کو یوں ہی اپنے لئے خرید لے اور یہ سچے رہبروں کی پہچان کے لئے ایک میزان ہے، اُن جھوٹے موقع پرستوں کے مقابلے میں جو کہ جب بھی قدم اٹھاتے ہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس سے ان کا کوئی نہ کوئی مادی ہدف اور مقصد ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان کے جواب میں جنہیں اصرار تھا کہ حضرت نوح(علیہ السلام) غریب وحقیر اور کم افراد کو جو آپ پر ایمان لائے تھے خود سے ڈور کر دیں حضرت نوح(علیہ السلام) حتمی طور پر (فیصلہ سناتے ہوئے) کہتے ہیں: میں ہرگز ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں نہیں دھتکاروں گا (وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا)۔ کیونکہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے اور دوسرے جہان میں اس کے سامنے میرے ساتھ ہوں گے (أَنَّهُمْ مُّلاَقُوا رَبِّهِمْ)۔ (۱)

آیت کے آخر میں انہیں بتا گیا ہے: میں سمجھتا ہوں کہ تم جاہل ہو (وَلَكِنِّي أَرَأَيْتُمْ كَيْفَ تَجْهَلُونَ)۔ اس سے بڑھ کر جاہالت کیا ہوگی کہ فضیلت کو پرکھنے کی میزان تم گنوا بیٹھے ہو، آج تمہاری نظر دولت، مالی وجاہت، ظاہری مقام و منصب اور سن و سال معیارِ فضیلت بن چکے ہیں اور صاحبانِ ایمان افراد جو تہی دست اور برہنہ پا ہیں وہ تمہارے گمان میں بارگاہِ خداوندی سے ڈور ہیں، یہ تمہاری بڑی غلط فہمی ہے اور یہ تمہاری جاہالت کی نشانی ہے۔ علاوہ ازیں تم اپنی جاہالت و نادانی کی بناء پر سمجھتے ہو کہ پیغمبر کورفرشتہ ہونا چاہیے حالانکہ انسانوں کا رہبر انہی کی نوع سے ہونا چاہیے تاکہ وہ ان کی ضروریات، مشکلات اور تکالیف کو محسوس کرسکے اور سمجھ سکے۔

بعد والی آیت میں مزید وضاحت کے لئے ان سے کہا گیا: اے قوم! اگر میں ان بالیمان لوگوں کو دھتکاروں تو خدا کے سامنے (اس عظیم عدالت میں بلکہ اُس جہان میں) کون میری مدد کرے گا (وَيَأْقُومُ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ)۔ صالح اور مومن افراد کو دھتکارنا کوئی معمولی کام نہیں ہے، وہ کل قیامت کے دن میرے خلاف ہوں گے اور وہاں کوئی شخص میرا دفاع نہیں کرسکے گا، نیز ممکن ہے عذابِ الہی اس جہان میں بھی مجھے دامن گیر ہو، کیا تم کچھ سوچتے سمجھتے نہیں ہو کہ تمہیں ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں عین حقیقت ہے (أَفَلَا تَذَكَّرُونَ)۔

”تذکر“ اور ”تذکر“ میں یہ فرق ہے کہ تفکر در حقیقت کسی چیز کی شناخت کے لئے ہوتا ہے چاہے اس کے بارے میں ہمیں پہلے سے کچھ پتہ نہ ہو لیکن ”تذکر“ (یادآوری) اس موقع پر بولا جاتا ہے جب انسان اس امر کے بارے میں زیر بحث مسائل بھی اسی نوعیت کے تھے کہ انسان اپنی فطرت اور وجدان کی طرف توجہ کرنے سے انہیں سمجھ سکتا ہے لیکن ان غرور، تعصب، خود پرستی اور غفلت نے ان کے چہروں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

اپنی قوم کے مہمل اعتراضات کے جواب میں حضرت نوح(علیہ السلام) آخری بات یہ کہتے ہیں کہ اگر تم خیال کرتے ہو اور توقع رکھتے ہو کہ وحی اور اعجاز کے سوا میں تم پر کوئی امتیاز یا برتری رکھوں تو یہ غلط ہے، میں صراحت سے کہنا چاہتا ہوں کہ ”میں نہ تم سے کہتا ہوں کہ خدائی خزانے میرے قبضے میں ہیں اور نہ ہر کام جب چاہوں انجام دے سکتا ہوں“ (وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ)۔ ”نہ میں غیب سے آگاہی کا دعویٰ کرتا ہوں“ (وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ)۔ ”اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں (وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ)۔

ایسے بڑے اور جھوٹے دعوے جھوٹے مدعیوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور ایک سچا پیغمبر کبھی ایسے دعوے نہیں کرے گا کیونکہ خدائی خزانے اور علمِ غیب صرف خدا کی پاک ذات کے اختیار میں ہیں اور فرشتہ ہونا بھی ان بشری احساسات سے مناسب نہیں رکھتا، لہذا جو شخص ان تین میں سے کوئی ایک دعویٰ کرے یا یہ سب دعوے کرے تو یہ اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔

پیغمبر اسلام کے بارے میں سورہ انعام کی آیت ۵۰ میں ایسی تعبیر ملتی ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

میں نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں علمِ غیب رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

اس آیت میں امتیازِ پیغمبر کو وحی میں منحصر کرنا اور مندرجہ بالا تینوں امور کی نفی کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت نوح(علیہ السلام) سے مربوط آیات میں بھی ایسی امتیاز مفہوم کلام میں مخفی ہے اگرچہ صراحت سے بیان نہیں ہوا۔

آیت کے آخر میں دوبارہ مستضعفین کا ذکر کرتے ہوئے ناکیداً کہا گیا ہے ”میں ہرگز ان افراد کے بارے میں جو تمہاری نگاہ میں حقیر ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ خدا انہیں کوئی جزائے خیر نہیں دے گا (وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَرُدُّونَ أَعْيُنَكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا)۔ بلکہ اس کے برعکس اس جہان کی خیر انہی کے لئے اگرچہ ان کا ہاتھ مال و دولت سے خالی ہے، یہ تو تم ہو جنہوں نے خام خیالی کی وجہ سے خیر کو مال و مقام یا سن و سال میں منحصر سمجھ رکھا ہے اور تم حقیقت سے بالکل بے

خبر ہو۔

اور بالفرض اگر تمہاری بات سچی ہو اور وہ پشت اور اوباش ہوں تو خدا ان کے باطن اور نیتوں سے آگاہ ہے (اللہ اَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ)۔

میں تو ان میں ایمان و صداقت کے سوا کچھ نہیں پاتا، لہذا میری ذمہ داری ہے کہ میں انہیں قبول کر لوں، میں تو ظاہر پر مامور ہوں اور بندہ شناس خدا ہے۔

اور اگر میں اس کے علاوہ کچھ کروں تو یقیناً ظالموں میں سے ہوجاؤں گا (إِنِّي إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ)۔ آخری جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ آیت کے سارے مضمون سے مربوط ہو یعنی اگر میں علم غیب جاننے، فرشتہ ہونے یا خزان کا مالک ہونے کا دعویٰ کروں یا ایمان لانے والوں کو دھتکار دوں تو خدا کی بارگاہ میں اور وجدان کی نظر میں میں ظالموں کی صف میں داخل ہوں گا۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ علم غیب اور خدا کے خاص بندے

جیسا کہ ہم نے بار بار اشارہ کیا ہے غیب سے مطلق آگاہی اور بغیر کسی قید و شرط سے واقفیت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن وہ جس قدر مصلحت سمجھتا ہے یہ علم و آگہی انبیاء اور اولیاء کے اختیار میں دے دیتا ہے، جیسا کہ سورہ جن کی آیت ۲۶ اور ۲۷ میں ہے:

خدا تمام پوشیدہ امور سے آگاہ ہے اور کسی کو اپنے علم غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر اس رسول کو جسے وہ چاہتا ہے۔ اس بناء پر زیر بحث آیات میں جو انبیاء سے علم غیب کی نفی کی گئی ہے اور دیگر آیات و روایات جن میں انبیاء (علیہ السلام)، یا ائمہ (علیہ السلام) کی طرف بعض غیوب کی نسبت دی گئی ہے کوئی تضاد نہیں ہے، اسرار غیب سے بالذات گواہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے وہ تعلیم خداوندی کے ذریعہ ہے، لہذا وہ ارادۃ الہی کے مطابق اور اسی حد تک ہے۔ (2)

.....

۱۔ یہ احتمال بھی اس جملہ کی تفسیر میں ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی مراد یہ ہو کہ اگر مجھ پر ایمان لانے والے باطن میں دروغ گو اور جھوٹے ہونے تو خدا قیامت تک ان سے حساب کرے گا، لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے۔  
2۔ مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد صفحہ ۲۰۶ (اردو ترجمہ) اور ساتویں جلد صفحہ ۵۲ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ معیار فضیلت

ان آیات میں ہم دوبارہ اس حقیقت کو دیکھ رہے ہیں کہ اہل اقتدار، سرمایہ دار اور دنیا پرست مادی لوگ جو تمام چیزوں کو اپنے افکار کے دریچے سے اسی مادی حوالے سے دیکھتے ہیں ان کی نظر کسی مقام و احترام دولت و منصب کے حوالے سے ہوتا ہے لہذا یہ بات کوئی باعث تعجب نہیں کہ وہ تہی دست سچے مومنین کو ”اراذل“ (پست) قرار دیں اور ان کی طرف حقارت سے دیکھیں۔

یہ امر قوم نوح ہی میں منحصر نہیں کہ وہ مستضعفین مومنین خصوصاً انقلابی نوجوانوں کو جو آپ کے گرد و پیش تھے بے وقوف، کوتاہ فکر اور بے وقعت سمجھتے تھے بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ یہی منطق دوسرے انبیاء، خصوصاً پیغمبر اسلام اور پہلے مومنین کے بارے میں موجود تھی، آج بھی ہم یہی صورت دیکھتے ہیں، فرعون صفت مستکبرین اپنی شیطانی طاقت کا سہارا لیتے ہوئے سچے مومنین کو ایسے ہی متہم کرتے ہیں، وہ تاریخ کو ڈہراتے ہوئے اپنے مخالفین کو ایسے القابات ہی سے یاد کرتے ہیں۔

لیکن ایک بُرا ماحول ایک خدائی انقلاب کے ذریعے پاک ہوجائے تو شخصیت شناسی کے ایسے معیار بھی دیگر موبوم چیزوں کے ساتھ تاریخ کے کوڑا دان میں پھینک دیئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ اصلی اور انسانی معیار لے لیتے ہیں، وہ معیار کہ جن پر زندگی کا متن برقرار ہے، جن پر عینی حقائق استوار ہیں اور جن سے ایک پاک، آباد اور آزاد معاشرہ استفادہ کرتا ہے مثلاً ایمان، علم، آگہی، ایثار، تقویٰ، پاکدامنی، شہادت، شجاعت، تجربہ، بیداری، مدیریت اور نظم و نسق کی

۳۔ ایک اشکال کی وضاحت

صاحب المنار کی طرح بعض مفسرین اس آیت تک پہنچے ہیں تو وہ ان لوگوں کی طرف جو غیر خدا کے لئے علم غیب کے قائل ہیں یا ان سے اپنی مشکلات کا حل چاہتے ہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختصراً کہتے ہیں کہ یہ دو چیزیں (علم غیب اور خزانہ الہی) ایسی ہیں جن کی قرآن نے انبیاء سے نفی کی ہے لیکن مسلمانوں اور اہل کتاب میں سے بدعتی اولیاء اور قدیسین کے لئے ان امور کے قائل ہیں - (1)

.....

1- اگر موصوف کی مراد یہ ہے کہ وہ ان سے ہر قسم کے علم غیب کی نفی کرے چاہے وہ تعلیم الہی سے ہو تو یہ بات قرآن مجید کی صرح نصوص کے خلاف ہے اور اگر مقصود انبیاء اور اولیاء سے توسل کی اس معنی میں نفی ہے کہ وہ خدا سے ہماری مشکلات کے حل کے لئے دعا اور خواہش کریں تو یہ بات آیا قرآن اور شیعہ سنی مسلمہ احادیث کے خلاف ہے ۔

۳۲ قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ

۳۳ قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ

۳۴ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ

۳۵ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَىٰ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرَمُونَ

ترجمہ

۳۲۔ انہوں نے کہا: اے نوح! تُو نے ہم سے بہت بحث و تکرار کی اور بڑی باتیں کیں اب (بس کرو) اگر سچ کہتے ہو تو جس (عذاب الہی) کا ہم سے وعدہ کرتے ہو اسے لے آؤ۔

۳۳۔ (نوح نے جواباً کہا: اگر خدا نے ارادہ کر لیا تو لے آئے گا پھر تم میں فرار کی طاقت نہ ہوگی۔

۳۴۔ (لیکن کیا فائدہ کہ) جب خدا چاہے تمہیں (تمہارے گناہوں کی وجہ سے) گمراہ کر دے اور میں تمہیں نصیحت کروں تو پھر تمہیں کوئی فائدہ نہ دے گی، وہ تمہارا پروردگار ہے اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

۳۵۔ (مشرکین) کہتے ہیں: وہ (محمد) خدا کی طرف ان باتوں کی غلط نسبت دیتا ہے کہہ دو: اگر میں نے تمہیں اپنی طرف سے گھڑا ہے اور اس کی طرف نسبت دیتا ہوں تو اس کا گناہ میرے ذمہ ہے لیکن میں تمہارے گناہوں سے بیزار ہوں۔

کہاں ہے عذاب؟

ان آیات میں حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کی قوم کے درمیان ہونے والی باقی گفتگو کی طرف اشارہ ہوا ہے، پہلی آیت میں قوم نوح (علیہ السلام) کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: اے نوح! تم نے یہ سب بحث و تکرار اور مجادلہ کیا ہے اب بس کرو تم نے ہم سے بہت باتیں کی ہیں اب بحث مباحثے کی گنجائش نہیں رہی (قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا)۔

اگر سچے ہو تو خدائی عذابوں کے بارے میں جو سخت وعدے تم نے ہم سے کئے تھے انہیں پورا کر دکھاؤ اور وہ عذاب لے آؤ (فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ)۔

یہ بعینہ اس طرح سے ہے کہ ایک شخص یا کچھ اشخاص کسی مسئلے کے بارے میں ہم سے بات کریں اور ضمناً ہمیں دھمکیاں بھی دیں اور کہیں کہ اب زیادہ باتیں بند کرو اور جو کچھ تم کرسکتے ہو کرلو اور دیر نہ کرو، اس طرف اشارے کرتے ہوئے کہ ہم نہ تو تمہارے دلائل کو کچھ سمجھتے ہیں، نہ تمہاری دھمکیوں سے ڈرتے ہیں اور نہ اس سے زیادہ ہم تمہاری بات سن سکتے ہیں۔

انبیاء الہی کے لطف و محبت اور ان کی وہ گفتگو جو صاف و شفاف اور خوشگوار پانی کی طرح ہوتی ہے اس طرز عمل کا انتخاب انتہائی ہٹ دھرمی، تعصب اور جہالت کی ترجمانی کرتا ہے۔

قوم نوح کی اس گفتگو سے ضمناً یہ بھی اچھی طرح سے واضح ہوجاتا ہے کہ آپ نے ان کی ہدایت کے لئے بہت طویل مدت تک کوشش کی اور انہیں ارشاد و ہدایت کے لئے آپ (علیہ السلام) نے ہر موقع سے استفادہ کیا، آپ (علیہ السلام) نے اس قدر کوشش کی کہ اس گمراہ قوم نے آپ (علیہ السلام) کی گفتار اور ارشادات پر اکتاہٹ کا اظہار کیا۔

حضرت نوح (علیہ السلام) کے بارے میں قرآن کریم میں جو دیگر آیات آئی ہیں ان سے بھی یہ حقیقت اچھی طرح سے

واضح ہوتی ہے، سورہ نوح آیات ۵ تا ۱۳ میں یہ مفہوم مبسوط طریقے سے بیان ہوا ہے:

پروردگارا! میں نے اپنی قوم کو دن رات تیری طرف بلایا لیکن میری اس دعوت پر ایمان میں فرار کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا، میں نے جب انہیں پکارا تاکہ تو انہیں بخش دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے اوپر لپیٹ لئے، انہوں نے مخالفت پر اصرار کیا اور تکبر و خود سری کا مظاہرہ کیا، میں نے پھر انہیں علی الاعلان اور پوشیدہ طور پر تیری طرف دعوت دی، میں نے پیہم اصرار کیا مگر انہوں نے کسی بھی طرح میری باتوں کی طرف کان نہ دھرے۔

زیر بحث آیت میں لفظ ”جَادَلْتَنَّا“ آیا ہے جو ”مجادلہ“ کے مادہ سے لیا گیا ہے، یہ اصل میں طناب اور رسی کو مضبوطی سے بٹھے اور پیچ دینے کے معنی میں ہے، اسی بنا پر شکاری باز کو ”اجدل“ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام پرندوں سے زیادہ پیچ و خم کھانے والا ہے، بعد ازاں یہ لفظ بحث اور گفتگو میں مدمقابل کے پیچ و خم کھانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔

”جدال“، ”مراء“، اور ”حجاج“ (بروزن ”لجاج“) اگرچہ معنوی طور ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن جیسا کہ بعض محققین نے کہا ہے کہ ”مراء“، میں ایک طرح کی مذمت پائی جاتی ہے کیونکہ یہ لفظ ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جب انسان کسی باطل مسئلے پر ڈٹ جائے اور استدلال کرے لیکن ”جدال“ اور ”مجادلہ“ میں یہ مفہوم لازمی طور پر نہیں ہوتا۔ باقی رہا ”جدال“ اور ”حجاج“ کا فرق تو وہ یہ ہے کہ ”جدال“ مدمقابل کو اس کے عقیدے کی دعوت دینے اور اس پر استدلال پیش کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

حضرت نوح نے اس بے اعتنائی، بٹ دھرمی اور بیہودگی کا یہ مختصر جواب دیا: خدا ہی چاہے تو ان دھمکیوں اور عذاب کے وعدوں کو پورا کر سکتا ہے (قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ)۔

بہر حال یہ چیز میرے اختیار سے باہر ہے اور میرے قبضہ قدرت میں نہیں ہے، میں تو اس کا فرستادہ ہوں اور اس کے حکم کے سامنے تسلیم ہوں لہذا سزا اور عذاب کی خواہش مجھ سے نہ کرو لیکن یہ جان لو کہ جب عذاب کا حکم آپہنچا تو پھر ”تم اس کے احاطہ قدرت سے نکل نہیں سکتے اور کسی پناہ گاہ کی طرف فرار نہیں کر سکتے“ (وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ)۔

”معجزہ“، ”اعجاز“ مادہ سے دوسرے کو عاجز و ناتواں کرنے کے معنی میں ہے، یہ لفظ بعض اوقات ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جب انسان دوسرے کے کام میں رکاوٹ پیدا کر دے اور اسے روکے اور اسے عاجز و ناتواں کر دے اور کبھی آگ بڑھ کر مدمقابل کو شکست دے دے یا اپنے آپ کو محفوظ کر لے، یہ تمام مدمقابل کو عاجز و ناتواں کرنے کے مختلف طریقے ہیں، مندرجہ بالا آیت میں ان تمام معانی کا احتمال ہے کیونکہ یہ معانی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ یعنی تم کسی صورت میں اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: اگر خدا تمہارے گناہوں اور جسمانی آلودگیوں کی وجہ سے تمہیں گمراہ کرنا چاہے تو میری نصیحت تمہیں ہرگز کوئی فائدہ نہیں دے گی چاہے میں تمہیں جتنی بھی نصیحت کر لوں (وَلَا يَنْفَعُكُمْ نَصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أُنصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ)۔ کیونکہ ”وہ تمہارا پردرگار ہے اور تم اس کی طرف پلٹ کر جاؤ گے“ اور تمہاری تمام تر ہستی اور وجود اس کے قبضہ قدرت میں ہے (هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ)۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس آیت کے مطالعہ سے فوراً یہ سوال سامنے آتا ہے اور بہت سے مفسرین نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کسی کے گمراہ کرنے کا ارادہ کرے، کیا ایسا ہو تو یہ جبر و اکراہ کی دلیل نہیں ہوگی اور کیا یہ جو بنیاد ہے کہ انسان ارادہ و اختیار میں آزاد ہے اسے قبول کر لینے کے بعد ایسی چیز قابل قبول ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ مندرجہ بالا مباحث میں واضح ہو چکا ہے اور ہم نے بار بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض اوقات انسان مسلسل کچھ اعمال بجالاتا ہے جس کا نتیجہ دائمی گمراہی اور ہمیشہ کے انحراف اور حق کی طرف لوٹنے کی صورت میں نکلتا ہے، ہمیشہ کی بٹ دھرمی، گناہوں پر دائمی اصرار اور حق طلب سچے رہبروں کی دشمنی، انسانی فکر پر ایسا ضخیم پردہ ڈال دیتی ہے کہ انسان میں آفتاب حق و حقیقت کی شعاع دیکھنے کی تھوڑی سی صلاحیت بھی نہیں رہتی، چونکہ یہ حالت ایسے اعمال کا نتیجہ ہے کہ جو انسان خود انجام دیتا ہے لہذا یہ کسی طرح بھی جبر و اکراہ کی دلیل نہیں ہوسکتی بلکہ یہ عین اختیار ہے جو کچھ خدا سے مربوط ہے یہ ہے کہ اس نے ایسے اعمال میں ایسی تاثیر قرار دی ہے، قرآن مجید کی آیات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اس سلسلے میں ہم نے سورہ بقرہ کی آیت ۷ کے ذیل میں اور دیگر مواقع پر اشارہ کیا ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں ایک بات جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہے، یہ ان مباحث کی تاکید کے لئے ہے جو حضرت



نوح(علیہ السلام) کے واقعہ کے سلسلے میں گزشتہ اور آئندہ آیات میں موجود ہیں، ارشاد ہوتا ہے : دشمن کہتے ہیں کہ یہ بات اس (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خود سے گھڑ کر خدا کی منسوب کر دی ہے (أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ)۔ ان کے جواب میں کہہ دو کہ اگر میں نے یہ اپنی طرف سے گھڑی ہے اور خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے تو اس کا گناہ مجھ پر ہے (قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُمْ فَعَلَىٰ إِجْرَامِي)۔ لیکن میں تمہارے گناہوں سے بیزار ہوں (وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تُجْرُمُونَ)

۱۔ ”إِجْرَام“ کا مفہوم:

”إِجْرَام“ کا مادہ ”جرم“ (بروزن ”جہل“) ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ کچھ پہل توڑنے کے معنی میں ہے، بعد ازاں ہر غیر خوش آئندہ کام کے لئے بولا جائے لگا، اسی طرح کسی کو گناہ پر آمادہ کرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چونکہ انسانی ذاتی اور فطری طور پر روحانیت اور پاکیزگی سے رشتہ رکھتا ہے لہذا جب وہ گناہ انجام دیتا ہو تو وہ اس خدائی رشتہ سے جدا ہوجاتا ہے۔

۲۔ آخری آیت کس کے بارے میں ہے؟

زیر نظر آخری آیت کے بارے میں بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں نہیں ہے بلکہ خود حضرت نوح(علیہ السلام) سے مربوط ہے کیونکہ یہ سب آیات انہی سے مربوط ہیں اور بعد میں آنے والی آیات بھی انہی سے متعلق ہیں لہذا زیادہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی حضرت نوح(علیہ السلام) سے مربوط ہے اور ان کے نزدیک اس کا جملہ معترضہ ہونا خلاف ظاہر ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ:

اولاً: تقریباً اس طرح کی تعبیر انہی الفاظ میں سورہ احقاف کی آیت ۸ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں آئی ہے۔

ثانیاً: ان آیات میں جو کچھ حضرت نوح(علیہ السلام) کے بارے میں آیا ہے وہ سب صیغہ غائب کی صورت میں ہے جبکہ زیر بحث آیت مخاطب کی صورت میں ہے (اور مسئلہ ”التفات“ یعنی غیبت سے خطاب کی طرف منتقل بھی خلاف ظاہر ہے) اب اگر ہم اس آیت کو حضرت نوح(علیہ السلام) کے بارے میں قرار دیں تو لفظ ”يقولون“ جو فعل مضارع کی صورت میں ہے اور اسی طرح ”قل“ جو فعل امر کی صورت میں ہے سب تقدیر کے محتاج ہونگے۔

ثالثاً: ایک حدیث جو تفسیر برہان میں اس آیت کے ذیل میں حضرت امام باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہے میں ہے کہ یہ آیت کفار مکہ کے مقابلے میں نازل ہوئی تھی۔

ان تمام دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مربوط ہے، کفار آپ پر ناروا تہمتیں باندھتے تھے یہ آیت آپ کی جانب سے ان کے لئے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جملہ معترضہ کا یہ معنی نہیں کہ کوئی ایسی بات ذکر ہو جو اصل گفتگو سے کوئی کلام تاکید اور تائید کرتے ہیں، ان سے وقتی طور پر رشتہ سخن منقطع ہوجاتا ہے، مخاطب کو ایک طرح سے موقع ملتا ہے اور گفتگو کو بھی لطافتِ روح اور تازگی میسر آتی ہے، یہ بات حتمی ہے کہ جملہ معترضہ کبھی بھی ہر لحاظ سے کلام سے بیگانہ نہیں ہوسکتا ورنہ یہ بات اصولِ فصاحت و بلاغت کے خلاف ہوجائے گی حالانکہ فصیح و بلیغ کلام میں ہمیشہ جملہ ہائے معترضہ پائے جاتے ہیں۔

۳۔ ایک وضاحت:

زیر نظر آخری آیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہوسکتا ہے یہ اعتراض سامنے آئے کہ یہ بات کس طرح منطقی و عقلی ہوسکتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا حضرت نوح علیہ السلام کفار سے کہیں کہ یہ بات اگر جھوٹ ہے تو اس کا گناہ میری گردن پر ہے، کیا جھوٹ بولنے کا گناہ قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی گفتگو سچی ہے اور واقع کے مطابق ہے اور لوگ ذمہ دار ہیں کہ ان کی اطاعت اور پیروی کریں؟

اس کی وضاحت یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں غور و فکر کرنے سے ہمیں اس سوال کا جواب مل سکتا ہے، درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہماری یہ باتیں جو بہت سے عقلی دلائل پر مشتمل ہیں بالفرض محال ہم خدا کی طرف سے نہ بھی ہوں تو اس کا گناہ ہماری گردن پر ہے لیکن عقلی استدلال اپنی جگہ پر ثابت ہیں اور تم ان کی مخالفت سے ہمیشہ گناہ میں مبتلا ہوگے، ایسا گناہ جو مسلسل اور دائمی ہے (توجہ رہے کہ ”تجرمون“ صیغہ مضارع ہے جو عام طور پر استمرار اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے۔

۳۶ وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔  
 ۳۷ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُعْرِضُونَ۔  
 ۳۸ وَيَصْنَعِ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأَ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ قَالَ إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ۔  
 ۳۹ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَجِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّؤِيمٌ۔

ترجمہ

۳۶۔ نوح کو وحی ہوئی ہے کہ سوائے ان لوگوں کے کہ جو (اب تک) ایمان لا چکے ہیں اب تمہاری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا لہذا جو کام وہ کرتے ہیں ان سے غمگین نہ ہو۔  
 ۳۷۔ اور (اب) ہمارے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ اور ان کے بارے میں شفاعت نہ کرو جنہوں نے ظلم کیا ہے کیونکہ وہ غرق ہو کر رہیں گے۔  
 ۳۸۔ وہ کشتی بنانے میں مشغول تھا اور جب اس کی قوم کے بڑوں میں سے کوئی گروہ اس کے قریب سے گزرتا تو اس کا مذاق اڑاتا (لیکن نوح نے) کہا: اگر ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی تمہارا اسی طرح مذاق اڑائیں گے۔  
 ۳۹۔ عنقریب تم جان لو گے کہ کس کے پاس خوار کرنے والا عذاب آتا ہے اور ہمیشہ کی سزا اسے ملتی ہے۔

معاشرے کو پاک کرنے کا مرحلہ

ان آیات میں حضرت نوح (علیہ السلام) کی سرگزشت بیان ہوئی ہے، اس کے درحقیقت مختلف مراحل ہیں، ان میں سے متکبرین کے خلاف حضرت نوح (علیہ السلام) کے قیام کے ایک دور سے مربوط ہے، گذشتہ آیات میں حضرت نوح (علیہ السلام) کی مسلسل اور پر عزم دعوت کے مرحلے کا تذکرہ تھا، جس کے لئے انہوں نے تمام تر وسائل سے استفادہ کیا، یہ مرحلہ ایک طویل مدت پر مشتمل تھا، اس میں ایک چھوٹا سا گروہ آپ (علیہ السلام) پر ایمان لایا، یہ گروہ ویسے تو مختصر سا تھا لیکن کیفیت اور استقامت کے لحاظ سے بہت عظیم تھا۔  
 زیر بحث آیات میناس قیام کے دوسرے مرحلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ مرحلہ دور تبلیغ کے اختتام کا تھا جس میں خدا کی طرف سے معاشرے کو برے لوگوں سے پاک کرنے کی تیاری کی جانا تھی۔  
 پہلی آیت میں ہے: نوح (علیہ السلام) کو وحی ہوئی کہ جو افراد ایمان لاچکے ہیں ان کے علاوہ تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا (وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ)۔  
 یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ صفیں بالکل جدا ہوچکی ہیں، اب ایمان اور اصلاح کی دعوت کا کوئی فائدہ نہیں اور اب معاشرے کی پاکیزگی اور آخری انقلاب کے لئے تیار ہوجانا چاہیئے۔  
 آیت کے آخر میں حضرت نوح (علیہ السلام) اور دلجوئی کے لئے فرمایا گیا ہے: اب جب معاملہ یوں ہے تو جو کام تم انجام دے رہے ہو اس پر کوئی حزن و ملال نہ کرو (فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ)۔  
 اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اسرار غیبیت کا کچھ حصہ جہاں ضروری ہوتا ہے اپنے پیغمبر کے اختیار میں دے دیتا ہے جیسا کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کو خبر دی گئی کہ آئندہ ان میں سے کوئی اور شخص ایمان نہیں لائے گا۔

بہر حال ان گنہگار اور بٹ دھرم لوگوں کو سزا ملنی چاہیئے، ایسی سزا جو عالم ہستی کو ان کے وجود کی گندگی سے پاک کر دے اور مومنین کو ہمیشہ کے لئے ان کے چنگل سے نجات دے دے، ان کے غرق ہونے کا حکم صادر ہوچکا ہے لیکن ہر چیز کے لئے کچھ وسائل و اسباب ہوتے ہیں لہذا نوح (علیہ السلام) کو چاہیئے کہ وہ سچے مومنین بچنے کے لئے ایک مناسب کشتی بنائیں تاکہ ایک تو مومنین کشتی بنے کی اس مدت میں اپنے طریق کار میں پختہ تر ہوجائیں اور دوسروں کے لئے بھی کافی اتمام حجت ہوجائے لہذا ”ہم نے نوح کو حکم دیا کہ وہ ہمارے حضور میں اور ہمارے فرمان کے مطابق کشتی بنائیں“ (وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا)۔

لفظ ”اعینا“ (ہماری آنکھوں کے سامنے) سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری سب جد وجہد، مساعی اور تمام کاوشیں ہمارے حضور میں اور ہمارے سامنے ہے لہذا اطمینان اور راحت فکر کے ساتھ اپنا کام جاری رکھو، یہ فطری امر ہے کہ یہ احساس کہ خدا حاضر و ناظر ہے اور محافظ و نگران ہے ایک تو انسان کو قوت و توانائی بخشتا ہے اور دوسرے احساس ذمہ داری کو فروغ دیتا ہے۔

لفظ ”وحینا“ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کشتی بنانے کی کیفیت اور اس کی شکل و صورت کی تشکیل بھی حکم خدا سے سیکھ رہے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ حضرت نوح (علیہ السلام) آنے والے طوفان کی کیفیت و وسعت سے آگاہ نہ تھے کہ وہ کشتی اس مناسبت سے بناتے اور یہ وحی الہی ہی تھی جو بہترین کیفیتوں کے انتخاب میں ان کی مدد گار تھی۔

آیت کے آخر میں حضرت نوح (علیہ السلام) کو خبردار کیا گیا ہے کہ آج کے بعد ”ظالم افراد کے لئے شفاعت اور معافی کا تقاضا نہ کرنا کریں کہ انہیں عذاب دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ حتماً غرق ہوں گے“ (وَلَا تَخَاطِبُنِي فِي الذِّينِ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُعْرَفُونَ)۔

اس جملے سے اچھی طرح سے واضح ہوتا ہے کہ سب افراد کے لئے شفاعت ممکن نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ شرائط ہیں، یہ شرائط جس میں موجود نہ ہوں اس کے لئے خدا کا پیغمبر بھی بھی شفاعت اور معافی کے تقاضے کا حق نہیں رکھتا، اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد اول (ص ۱۸۷ تا ص ۲۰۴، اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

اب چند جملے قوم نوح کے بارے میں بھی سن لیں، وہ بجائے اس کے کہ ایک لمحہ کے لئے حضرت نوح (علیہ السلام) کی دعوت کو غور سے سنتے، اسے سنجیدگی سے لیتے اور کم از کم انہیں یہ احتمال بھی ہوتا کہ ہوسکتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کے بار بار اصرار اور تکرار دعوت کا سرچشمہ وحی الہی ہی ہواورسکتا ہے طوفان اور عذاب کا معاملہ حتمی اور یقینی ہی ہو لہذا انہوں نے تمام متکبر اور مغرور افراد کی عادت کا مظاہرہ کیا اور تمسخر و استہزاء کا اسلسلہ جاری رکھا، ان کی قوم کا کوئی گروہ جب کبھی ان کے نزدیک سے گزرتا اور حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب کو لکڑیاں اور میخیں وغیرہ مہیا کرتے دیکھتا اور کشتی بنانے میں انہیں سرگرم عمل پاتا تو تمسخر اڑاتا اور پھینٹیاں کستے ہوئے گزر جاتا (وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِمْ مَلَأَ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ)۔

”ملاء“ ان اشراف اور بڑے لوگوں کو کہتے ہیں جو خود پسند ہوتے ہیں اور ہر مقام پر مستضعفین کا تمسخر اڑاتے ہیں اور انہیں پست و حقیر مخلوق سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس سرمایہ اور اقتدار نہیں ہوتا، بس یہ نہیں کہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ ان کے افکار کتنے ہی بلند ہوں، ان کا مکتب کتنا ہی پائیدار اور با اصول اور ان کے اعمال کتنے ہی چمکے تھے ہوں ان کے خیال میں وہ حقارت کے قابل ہیں اسی بنا پر پند و نصیحت، تنبیہ اور خطرے کی گھنٹیاں ان پر اثر انداز نہیں ہوتی، ان کا علاج فقط دردناک عذاب الہی ہے۔

کہتے ہیں کہ قوم نوح کے اشراف کے مختلف گروہوں کے ہر دستے نے تمسخر اور تفریح و طبع کے لئے اپنا ہی ایک انداز اختیار کر رکھا تھا۔

ایک کہتا: اے نوح! دعوائے پیغمبری کا کاروبار نہیں چل سکا تو بڑھئی ہو گئے ہو۔

دوسرا کہتا: کشتی بنا رہے ہو؟ بڑا اچھا ہے البتہ اس کے لئے دریا بھی بناؤ، کبھی کوئی عقلمند دیکھا ہے جو خشکی کے بیچ میں کشتی بنائے؟

شاید ان میں سے کچھ کہتے تھے: اتنی بڑی کشتی کس لئے بنا رہے ہو، اگر کشتی بنانا ہی ہے تو ذرا چھوٹی بنالو جسے ضرورت پڑے تو دریا کی طرف لے جانا تو ممکن ہو۔

ایسی باتیں کرتے تھے اور قبضے لگا کر ہنستے ہوئے گزر جاتے تھے، یہ باتیں گھروں میں ہوتیں، کام کاج کے مراکز میں یہ گفتگو ہوتی گویا اب یہ بات بحثوں کا عنوان بن گئی، وہ ایک دوسرے سے حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے پیروں کاروں کی کوتاہ فکری کے بارے میں باتیں کرتے اور کہتے: اس بوڑھے کو دیکھو، آخر عمر میں کس حالت کو جا پہنچا ہے، اب ہم سمجھے کہ اگر ہم اس کی باتوں پر ایمان نہیں لائے تو ہم نے ٹھیک ہی کیا اس کی عقل تو بالکل ٹھکانے نہیں ہے۔

دوسری طرف حضرت نوح (علیہ السلام) بڑی استقامت اور پامردی سے اپنا کام بے پناہ عزم کے ساتھ جاری رکھے ہوئے تھے اور یہ ان کے ایمان کا نتیجہ تھا، وہ ان کو باطن دل کے اندھوں کی بے بنیاد باتوں سے بے نیاز اپنی پسند کے مطابق تیزی سے پیش رفت کر رہے تھے اور دن بدن کشتی کا ڈھانچہ مکمل ہو رہا تھا، کبھی کبھی سر اٹھا کر ان سے یہ پر معنی بات کہتے: اگر آج تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی جلد ہی اسی طرح تمہارا مذاق اڑائیں گے (قَالَ إِنَّ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ)، وہ دن کے جب تم طوفان کے درمیان سرگرداں ہو گئے، سرا سیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگو گے اور

تمہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی، موجوں میں گھرے فریاد کرو گے کہ ہمیں بچالو، جی ہاں اس دن مومنین تمہارے افکار غفلت، جہالت اور بے خبری پر ہنسنے لگے، ”اس دن تمہیں معلوم ہوگا کہ کس کے لئے ذلیل اور رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کسی دائمی سزا دامن گیر ہوتی ہے (فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَجِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ تمہاری مزاحمتیں ہمارے لئے دردناک عذاب ہیں مگر اولاً تو ان مشکلات کو گوارا کرتے ہوئے ہم سربلند اور پر افتخار بینثانیاً یہ مشکلات جو کچھ بھی ہیں جلد ختم ہوجائیں گی لیکن عذاب الہی رسوا کن بھی ہے اور ختم ہونے والا بھی نہیں اور ان دونوں کا آپس میں مقابلہ نہیں ہوسکتا

چند قابل توجہ نکات

۱۔ معاشرے کی پاکیزگی نہ کہ انتقام:

مندرجہ بالا آیات سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ خدائی عذاب انتقامی پہلو نہیں رکھتا بلکہ نوع بشر کی پاکیزگی اور ایسے لوگوں کے خاتمے کے لئے ہے جو زندگی کے اہل نہیں، اس طرح نیک لوگ باقی رہ جاتے ہیں، اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک متکبر اور فاسد و مفسد قوم جس کے ایمان لانے کی اب کوئی امید نہیں، نظام خلقت کے لحاظ سے اب جینے کا حق نہیں رکھتی اور اسے ختم ہوجانا چاہیئے قوم نوح ایسی ہی تھی کیونکہ مندرجہ بالا آیات کہتی ہیں کہ اب جب کہ باقی لوگوں کے ایمان لانے کی امید نہیں ہے کشتی بنانے کے لئے تیار ہوجاؤ اور ظالموں کے لئے کسی قسم کی شفاعت اور معافی کا تقاضا نہ کرو۔

یہی صورت حال اس عظیم پیغمبر کی بد دعا اور نفرین سے بھی معلوم ہوتی ہے جو کہ سورہ نوح میں موجود ہے:

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَأَنْتَ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا إِنَّكَ إِن تَذَرُهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا

پروردگار! ان کفار میں سے کسی ایک کو بھی زمین پر نہ رہنے دے کیونکہ اگر وہ رہ جائیں تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے بھی فاسق و فاجر اور بے ایمان کافروں کے سوا کوئی وجود میں نہیں آئے گا، (نوح، ۲۶، ۲۷)۔

اصولی طور پر کارخانہ تخلیق میں ہر موجود کسی مقصد کے تحت پیدا کیا گیا ہے، جب کوئی موجود اپنے مقصد سے بالکل منحرف ہوجائے اور اصلاح کے تمام راستے اپنے لئے بند کر لے تو اس کا باقی رہنا بلا وجہ ہے لہذا اسے خواہ مخواہ ختم ہوجانا چاہیئے، بقول شاعر:

نہ طراوتی نہ برگی نہ میوہ دارم  
متحرم کہ دھقان بہ چکارہشت مارا  
نہ مجھ میں تازگی ہے، نہ مجھ پر پتے ہیں، نہ پھول اور نہ پھل ہیں، حیران ہوں کہ کسان نے مجھے کیوں چھوڑ رکھا ہے۔

2متکبرین کی نشانیاں:

خود غرض اور خود سر متکبرین ہمیشہ ان مسائل کا مذاق اڑاتے ہیں جن سے ان کی خواہشات اور ہوا و بوس پوری نہ ہوتی ہو، اسی بنا پر ان مخصوص حقائق کا تمسخر اڑانا جن کا تعلق مستضعفین کی زندگی سے ہے، ان کی زندگی کا ایک حصہ ہے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی گناہ آلود اجتماعات میں رنگ بھرنے اور انہیں رونق بخشنے کے لئے کسی تہی دست صاحب ایمان کی تلاش میں رہتے تھے جسے تمسخر اور مضحکہ کا عنوان بنا سکیں اور اگر کسی اجتماع یا نشست کے لئے انہیں ایسے افراد نہ مل سکیں تو ان میں ایک یا کئی افراد اکوان کی عدم موجودگی میں موضوع سخن قرار دے کر مذاق اڑاتے ہیں اور ہنستے ہیں۔

وہ اپنے آپ کو عقل کل خیال کرتے ہیں، ان کے گمان میں ان کی بے بہا حرام دولت، ان کی لیاقت، شخصیت اور مقام کی نشانی ہے، اسی لئے وہ دوسروں کو نالائق، بے قدر اور بے وقعت سمجھتے ہیں۔

لیکن قرآن مجید ایسے مغرور اور متکبر افراد پر نہایت سخت حملے کرتا ہے اور خاص طور پر ان کی تمسخرات کی شدید مذمت کرتا ہے۔

مثلاً تاریخ اسلامی میں ہے:

ابوعقیل انصاری ایک صاحب ایمان شخص تھا، محنت مزدوری کرتا تھا، غریب آدمی تھا، ایک مرتبہ وہ رات بھر جاگتا رہا اور مدینے کے کنوؤں سے پانی بھر کر لوگوں کے گھروں تک پہنچاتا رہا، اس طرح اس نے مزدوری کر کے کچھ

خرمے حاصل کئے، وہ خرمے وہ جنگ تبوک کے لئے تیار ہونے والے لشکر اسلام کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آیا، کچھ متکبر منافق وہاں موجود تھے، وہ اس پر بہت ہنسنے، اس پر یہ قرآنی آیات نازل ہوئیں اور ان پر بجلی بن کر گریں:

الَّذِينَ يَلْمُزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ  
جو راہ خدا میں مالی مدد کرنے پر اطاعت گزار مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کا تمسخر اڑاتے ہیں کہ جو تھوڑی سی مقدار سے زیادہ دینے پر دسترس نہیں رکھتے خدا ایسے لوگوں کا مذاق اڑائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے (توبہ: ۷۹)

۳۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کی کشتی:

اس میں شک نہیں کہ کشتی نوح کوئی عام کشتی نہ تھی کیونکہ اس میں سچے مومنین کے علاوہ ہر نسل کے جانور کو بھی جگہ ملی تھی اور ایک مدت کے لئے ان انسانوں اور جانوروں کو جو خوراک درکار تھی وہ بھی اس میں موجود تھی، ایسی لمبی چوڑی کشتی یقیناً اس زمانے میں بے نظیر تھی یہ ایسی کشتی تھی جو ایسے دریا کی کوہ پیکر موجوں میں صحیح وسالم رہ سکے اور نابود نہ ہو جس کی وسعت اس دنیا جتنی ہو، اسی لئے مفسرین کی بعض روایات میں ہے کہ اس کشتی کا طول یک ہزار دو سو ذراع تھا اور عرض چھ سو ذراع تھا (ایک ذراع کی لمبائی تقریباً آدھا میٹر کے برابر ہوتی ہے)۔

بعض اسلامی روایات میں ہے کہ ظہور طوفان سے چالیس سال پہلے قوم نوح کی عورتوں میں ایک ایسی بیماری پیدا ہو گئی تھی کہ ان ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا، یہ دراصل ان کی سزا کی تمہد تھی۔

۴۰ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ فَئَلْنَا أَحْمِلَ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ

۴۱ وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِاسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَحِيمٌ

۴۲ وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادَى نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ ارْكَبْ مَعَنَا وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ

۴۳ قَالَ سَأَوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ۔

ترجمہ

۴۰۔ (یہ کیفیت اسی طرح جاری تھی) یہاں تک کہ ہمارا فرمان آپہنچا اور تنور جوش مارنے لگا، ہم نے (نوح سے) کہا: جانوروں کے ہر جفت (نر اور مادہ) میں سے ایک جوڑا اس (کشتی) میں اٹھالو، اسی طرح اپنے اہل کو مگر وہ کہ جن کے ہلاک ہونے کا پہلے سے وعدہ کیا جاچکا ہے (نوح کی بیوی اور ایک بیٹا) اور اسی طرح مومنین کو لیکن مختصر سے گروہ کے سوا اس پر کوئی ایمان نہیں لایا تھا۔

۴۱۔ اس نے کہا: اللہ کا نام لے کر اس میں سوار ہوجاؤ اور اس کے چلتے اور ٹھہرتے ہوئے وقت اسے یاد کرو اور میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۴۲۔ اور وہ انہیں پہاڑ جیسی موجوں میں گزارتا تھا، (اس وقت) نوح نے اپنے بیٹے کو جو ایک طرف کھڑا تھا پکارا: اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہوجا اور کافروں کے ساتھ نہ رہ۔

۴۳۔ اس نے کہا: میں پہاڑ کا سہارا لے لوں گا تاکہ پانی سے محفوظ رہوں، (نوح نے) کہا: فرمان خدا کے سامنے آج کوئی بچنے والا نہیں مگر وہی (بچ سکتا ہے) جس پر وہ رحم کرے، اس وقت ایک موج ان دونوں کے درمیان حائل ہوئی اور وہ غرق ہونے والوں میں سے قرار پایا۔

آغاز طوفان

گذشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کس طرح حضرت نوح (علیہ السلام) اور سچے مومنین نے کشتی نجات بنانا شروع کی اور انہیں کیسی کیسی مشکلات آئیں اور بے ایمان مغرور اکثریت نے ان کا کس طرح ان کا تمسخر اڑایا، اس طرح تمسخر اڑانے والوں نے کس طرح اپنے آپ کو اس طوفان کے لئے تیار کیا جو سطح زمین کو بے ایمان مستکبرین کے نجس وجود سے پاک کرنے والا تھا۔

زیر بحث آیات میں اس سرگزشت کے تیسرے مرحلے کے بارے میں ہیں، یہ آیات گویا اس ظالم قوم پر نزول عذاب کی

بولتی ہوئی تصویریں ہیں -

پہلے ارشاد ہوتا ہے: یہ صورت حال یونہی تھی یہاں تک کہ ہمارا حکم صادر ہوا اور عذاب کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ، پانی تنور کے اندر سے جوش مارنے لگا (حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ ) -  
”تنور“ (نون کی تشدید کے ساتھ) وہی معنی دیتا ہے جو آج کل فارسی زبان میں مستعمل ہے ، یعنی روٹی پکانے کی جگہ۔  
(۱)

اس بارے میں کہ طوفان کے نزدیک ہونے سے تنور سے پانی کا جوش مارنا کیا مناسبت رکھتا ہے مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے -

بعض نے کہا ہے کہ تنور سے پانی کا جوش مارنا خدا کی طرف سے حضرت نوح (علیہ السلام) کے لئے ایک نشانی تھی تاکہ وہ اصل واقعہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس موقع پر وہ اور ان کے اصحاب ضروری اسباب و وسائل لے کر کشتی میں سوار ہوجائیں -

بعض نے کہا ہے کہ یہاں ”تنور“ مجازی اور کنائی معنی میں ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ غضب الہی کے تنور میں جوش پیدا ہوا اور وہ شعلہ ور ہوا اور یہ تباہ کن خدائی عذاب کے نزدیک ہونے کے معنی میں ہے ، ایسی تعبیریں فارسی اور عربی زبان میں استعمال ہوتی ہیں کہ شدت غضب کو آگ کے جوش مارنے اور شعلہ ور ہونے سے تشبیہ دی جاتی ہے - ان احتمالات میں یہ احتمال زیادہ قوی ہوتا ہے کہ یہاں ”تنور“ اپنے حقیقی اور مشہور معنی میں آیا ہے اور ہوسکتا ہے اس سے مراد کوئی خاص تنور بھی ہو بلکہ ممکن ہے کہ اس سے یہ نکتہ بیان کرنا مقصود ہو کہ تنور جو عام طور پر آگ کا مرکز ہے جب اس میں سے پانی جوش مارنے لگا تو حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب متوجہ ہوئے کہ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور انقلاب قریب تر ہے یعنی کہاں آگ اور کہاں پانی -

بالفاظ دیگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ زیر زمین پانی کی سطح اس قدر اوپر آگئی ہے کہ وہ تنور کے اندر سے جو رعام طور پر خشک، محفوظ اور اونچی جگہ بنایا جاتا ہے، جوش مار رہا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ کوئی اہم امر درپیش ہے اور قدرت کی طرف سے کسی نئے حادثے کا ظہور ہے - اور یہی امر حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب کے لئے خطرے کا الارم تھا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور تیار رہیں -

شاید غافل اور جاہل قوم نے بھی اپنے گھروں کے تنور میں پانی کو جوش مارتے دیکھا ہو بہر حال وہ ہمیشہ کی طرح خطرے کے ان پُر معنی خدائی نشانات سے آنکھ کان بند کرنے گزر گئے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی غور و فکر کی زحمت نہ دی کہ شاید شرف تکوین میں کوئی حادثہ پوشیدہ ہو اور شاید حضرت نوح (علیہ السلام) جن خطرات کی خبر دیتے تھے ان میں سچائی ہو -

اس وقت نوح کو ”ہم نے حکم دیا کہ جانوروں کی ہر نوع میں سے ایک جفت (نر اور مادہ کا جوڑا) کشتی میں سوار کرلو“ تاکہ غرقاب ہو کر ان کی نسل منقطع نہ ہوجائے ( قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ )، ”اور اسی طرح اپنے خاندان میں سے جن کی ہلاکت کا پہلے سے وعدہ کیا جاچکا ہے ان کے سوا باقی افراد کو سوار کرلو نیز مومنین کو کشتی میں سوار کرلو“ ( وَاهْلُكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ )، ”لیکن تھوڑے سے افراد کے سوا لوگ ان پر ایمان نہیں لائے تھے“، ( وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ) -

یہ آیت ایک طرف حضرت نوح (علیہ السلام) کی بے ایمان بیوی اور ان کے بیٹے کنعان کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کی داستان آئندہ آیات میں آئے گی کہ جنہوں نے راہ ایمان سے انحراف کیا اور گنہگاروں کا ساتھ دینے کی وجہ سے حضرت نوح (علیہ السلام) اپنا رشتہ توڑ لیا، وہ اس کشتی میں سوار ہونے کا حق نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس میں سوار ہونے کی پہلی شرط ایمان تھی -

دوسری طرف یہ آیت اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) نے جو اپنے دین و آئین کی تبلیغ کے لئے سالہاسال بہت طویل اور مسلسل کوشش کی اس نتیجے بہت تھوڑے سے افراد مومنین کے سوا کچھ نہ تھا بعض روایات کے مطابق ان کی تعداد صرف اسی افراد تھی یہاں تک کہ بعض نے تو اس سے بھی کم تعداد لکھی ہے ، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر نے کس حد تک استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان میں سے ایک ایک فرد کے لئے اوسطاً کم از کم دس سال زحمت اٹھائی، اتنی زحمت تو ہم لوگ اپنی اولاد تک کی ہدایت اور نجات کے لئے نہیں اٹھاتے -

بہر حال حضرت نوح (علیہ السلام) نے جلدی سے اپنے وابستہ صاحب ایمان افراد اور اصحاب کو جمع کیا اور چونکہ طوفان اور تباہ کن خدائی عذابوں کا مرحلہ نزدیک آ رہا تھا ”انہیں حکم دیا کہ خدا کے نام سے کشتی پر سوار ہوجاؤ اور کشتی کے چلتے اور ٹھہرتے وقت خدا کانام زبان پر جاری کرو اور اس کی یاد میں رہو ( بِاسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا ) - (2)

کیونکہ کیا گیا کہ ہر حالت میں اس کی یاد میں رہو اور اس کی یاد اور اس کے نام سے مدد لو” اس لئے کہ میرا پروردگار

بخشنے والا اور مہربان ہے،“ (إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَحِيمٌ) -

اس نے اپنی رحمت کے تقاضے سے تم اہل ایمان بندوں کو یہ وسیلہ نجات بخشا ہے اور اپنی بخشش کے تقاضے سے تمہاری لغزشوں سے درگزر کرے گا۔

بالآخر آخری مرحلہ آپہنچا اور اس سرکش قوم کے لئے عذاب اور سزا کا فرمان صادر ہوا تیرہ وتار بادل جو سیاہ رات کے ٹکڑوں کی طرح تھے سارے آسمان پر چھا گئے اور اس طرح ایک دوسرے پر تہ تہ ہوئے کہ جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں دیکھی گئی تھی، پے در پے سخت بادل گرجتے خیرہ کن بجلیاں پورے آسمان پر کوندتیں آسمانی فضا گویا ایک بہت بڑے وحشتناک حادثے کی خبر دے رہی تھی۔

بارش شروع ہوگئی اور پھر تیز سے تیزتر ہوتی چلی گئی، بارش کے قطرے موٹے سے موٹے ہوتے چلے گئے جیسا کہ قرآن سورہ قمر کی آیہ ۱۱ میں کہتا ہے:

گویا آسمان کے تمام دروازے کھل گئے اور پانی کا سمندر ان کے اندر سے نیچے گرنے لگا۔

دوسری طرف زیر زمین پانی کی سطح اس قدر بلند ہوگئی کہ ہر طرف سے پرجوش چشمے ابل پڑے، یوں زمین و آسمان کا پانی آپس میں مل گیا اور زمین، پہاڑ، دشت، بیابان اور درہ غرض ہر جگہ پانی جاری ہوگیا، بہت جلد زمین کی سطح ایک سمندر کی صورت اختیار کرگئی، تیز ہوائیں چلنے لگیں جن کی وجہ سے پانی کو کوہ پیکر موجیں امانڈنے لگیں اس عالم میں ”کشتی نوح پیکر موجوں کا سینہ چیرتے ہوئے بڑھ رہی تھی“ (وَهِيَ تَجْرِي بِهْمٍ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ)۔

پسر نوح ایک طرف اپنے باپ سے الگ کھڑا تھا، نوح نے پکارا: میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہوجاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو ورنہ فنا ہوجاؤ گے (وَنَادَى نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بَنِيَّ اِزْكَبْ مَعَنَا وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ)۔

پیغمبر بزرگوار حضرت نوح (علیہ السلام) نے نہ صرف پاک کی حیثیت سے بلکہ ایک انتھک پر امید مربی کے طور پر آخری لمحے تک اپنی ذمہ داریوں سے دستبرداری نہ کی، اس امید پر کہ شاید ان کی بات سنگ دل بیٹے پر اثر کر جائے لیکن افسوس کہ بری ساتھی کی بات اس کے لئے زیادہ پر تاثیر تھی لہذا دلسوز پاک کی گفتگو اپنا مطلوبہ اثر نہ کر سکی، وہ ہٹ دھرم اور کوتاہ فکر تھا، اسے گمان تھا کہ غضب خدا کا مقابلہ بھی کیا جاسکتا تھا، اس لئے ”اس نے پکار کر کہا: ابا! میرے لئے جوش میں نہ آؤ میں عنقریب پہاڑ پر پناہ لے لوں گا جس تک یہ سیلاب نہیں پہنچ سکتا (قَالَ سَأُوِي اِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ)۔

نوح (علیہ السلام) پھر بھی مایوس نہ ہوئے، دوبارہ نصیحت کرنے لگے کہ شاید کوتاہ فکر بیٹا غرور اور خود سری کے مرکب سے اتر آئے اور راہ حق پر چلنے لگے ”انہوں نے کہا: میرے بیٹے! آج حکم خدا کے مقابلے میں کوئی طاقت پناہ نہیں دے سکتی“ (قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ)، ”نجات صرف اس شخص کے لئے ہے رحمت خدا جس کے شامل حال ہو“ (اِلَّا مَنْ رَحِمَ)۔

پہاڑ تو معمولی سی چیز ہے، خود کرہ ارض بھی معمولی سی چیز ہے، سورج اور تمام نظام شمسی اپنی خیرہ کن عظمت کے باوجود خدا کی قدرت لایزال کے سامنے ذرہ بے مقدار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، کیا بڑے سے بڑے پہاڑ کرہ زمین کے مقابلے میں چھوٹے سے ابھار سے زیادہ رکھتے ہیں ان کی حیثیت تو ایسے ہے جیسے ناشپاتی کی بالائی سطح ہوتی ہے جب کہ خود زمین کی حیثیت یہ ہے کہ اسے ایک ملین اور دوہزار گنا بڑا کیا جائے تو پھر جاکر وہ کرہ آفتاب کے برابر ہوتی ہے، وہ آفتاب آسمان میں جس کی حیثیت ایک معمولی سے ستارہ کی سی ہے جب کہ وسیع عالم خلقت میں اربوں کھربوں سارے موجود ہیں پس کس قدر خام خیالی ہے کہ پہاڑ پناہ دے سکے گا۔

اسی دوران ایک موج اٹھی اور آگے آئی، مزید آگے بڑھی اور پسر نوح کو ایک تنکے کی طرح اس کی جگہ سے اٹھایا اور اپنے اندر درہم برہم کر دیا اور باپ بیٹے کے درمیان جدائی ڈال دی اور اسے غرق ہونے والے میں شامل کر دیا (وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ)۔

.....

۱. اردو میں بھی ”تنور“ کا یہی معنی مستعمل ہے۔ (مترجم)

2. ”مجرأ“ اور ”مرسا“ دونوں اسم زمان ہیں اور ان کا معنی ”چلتے وقت“ اور ”ٹھہرتے وقت“۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا طوفان نوح عالمگیر تھا:

بہت سی آیات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح کسی خاص علاقے کے لئے نہیں تھا بلکہ پوری زمین پر رونما ہوا تھا کیونکہ لفظ ”ارض“ (زمین) مطلق طور پر آیا ہے:  
 رَبِّ لَا تَذَرْنَا عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا  
 خداوندا! روئے زمین پر ان کافروں میں سے کسی کو زندہ نہ رہنے دے کہ جن کے بارے میں اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے۔ (نوح: ۲۶)  
 اسی طرح ہود کی آیہ ۴۴ میں یوں ہے:  
 وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَائِكَ ---  
 اپنے زمین اپنا پانہ نگل لے

بہت سی تواریخ سے بھی طوفان نوح کے عالمگیر ہونے کی خبر ملتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ موجودہ تمام نسلیں حضرت نوح (علیہ السلام) کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث کی اولاد میں سے ہیں جو کہ زندہ رہے تھے۔  
 طبیعی تاریخ میں سیلابی بارشوں کے نام سے ایک دور کا پتہ چلتا ہے، اس دور کو اگر لازمی طور پر جانداروں کی پیدائش سے قبل سے مربوط نہ سمجھے تو وہ بھی طوفان نوح پر منطبق ہوسکتا ہے۔  
 زمین کی طبیعی تاریخ میں یہ نظر بھی ہے کہ کرہ زمین کا محور تدریجی طور پر تغیر پیدا کرتا ہے یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی خط استوا میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور خط استوا قطب شمالی اور قطب جنوبی کی جگہ لے لیتا ہے، واضح ہے کہ جب قطب شمالی و جنوبی میں موجود بہت زیادہ برف پگھل پڑے تو دریاؤں اور سمندروں کے پانی کی سطح اس قدر اوپر آجائے گی کہ بہت سی خشکیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور پانی زمین جہاں جہاں اسے گنجائش ملے گی ابلتے ہوئے چشموں کی صورت میں نکلے گا، پانیوں کی یہی وسعت بادلوں کی تخلیق کا سبب بنتی ہے اور پھر زیادہ سے زیادہ بارشیں انہیں بادلوں سے ہوتی ہیں۔  
 یہ امر کہ حضرت نوح (علیہ السلام) زمین کے جانوروں کے نمونے بھی اپنے ساتھ لئے تھے طوفان کے عالمگیر ہونے کا موید ہے۔

جیسا کہ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کوفہ میں رہتے تھے دوسری طرف بعض روایات کے مطابق طوفان مکہ اور خانہ کعبہ تک پھیلا ہوا تھا تو یہ صورت بھی اس بات کی موید ہے کہ طوفان عالمگیر تھا۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اس امر کی بھی بالکل نفی نہیں کی جاسکتی کہ طوفان نوح ایک منطقے کے ساتھ مخصوص تھا کیوں لفظ ”ارض“ (زمین) کا اطلاق قرآن میں کئی مرتبہ زمین کے ایک وسیع قطعے پر بھی ہوا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی سرگزشت میں ہے:  
 وَأَوْزَنَّا الْفُؤْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَعَارِبَهَا۔

ہم نے زمین کے مشارق اور مغارب بنی اسرائیل کے مستضعفین کے قبضے میں دئے۔ (اعراف: ۱۳۷)  
 کشتی میں جانوروں کو شاید اس بنا پر رکھا گیا ہو کہ زمین کے اس حصے میں جانوروں کی نسل منقطع نہ ہو خصوصاً اس زمانے میں جانوروں کا دور دراز علاقوں سے منتقل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ (غور کیجئے گا)  
 اسی طرح دیگر مذکورہ قرآن اس بات پر منطبق ہوسکتے ہیں کہ طوفان نوح ایک منقطعہ ارض پر آیا۔  
 یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ طوفان نوح تو اس سرکش قوم کی سزا اور عذاب کے طور تھا اور ہمارے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی دعوت تمام روئے زمین پہنچی تھی۔  
 اصولی طور پر اس زمانے کے وسائل و ذرائع کے ساتھ ایک پیغمبر کی دعوت کا (اس کے اپنے زمانے میں) زمین کے تمام خطوں اور علاقوں تک پہنچنا بعید نظر آتا ہے۔

بہر حال اس عبرت خیز واقعے کو بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اہم تربیتی نکات بیان کئے جائیں جو اس میں چھپے ہوئے ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ یہ واقعہ عالمی ہوا کسی ایک علاقے تعلق رکھتا ہو۔

۲۔ کیا نزول عذاب کے بعد توبہ ممکن ہے؟

گذشتہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) طوفان شروع ہونے کے بعد تک اپنے بیٹے کو تبلیغ کرتے رہے یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اگر وہ ایمان لے آتا تو اس کا ایمان قابل قبول ہوتا، یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کی دوسری آیات کی طرف توجہ کرنے سے، جن کے کچھ نمونے بیان کئے جاچکے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ عذاب نازل ہونے کے بعد توبہ کے دروازے بند ہوجاتے ہیں کیونکہ ایسے مواقع پر تو اکثر سرکش گنہگار جو اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھ



لیتے ہیں بے اختیار ہوتے ہیں اور اضطرار کی حالت میں توبہ کرتے ہیں، ایسی توبہ جس کی کوئی قدر قیمت، اہمیت اور وقعت نہیں، ایسی توبہ جس کا کوئی مفہوم نہیں۔

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ آیات بالا میں غور فکر کرنے سے اس سوال کا جواب اس طرح سے مل سکتا ہے کہ آغاز طوفان میں عذاب کی کوئی واضح نشانی موجود نہیں تھی بلکہ تیز اور اور غیر معمولی بارش نظر آتی تھی اسی تو نوح (علیہ السلام) کے بیٹے نے اپنے باپ سے کہا کہ میں پہاڑ کی پناہ لے لوں گاتا کہ غرق ہونے سے بچ جاؤں، اسے یہ گمان تھا کہ بارش اور طوفان ایک طبیعی چیز ہے، ایسے مواقع پر توبہ کے دروازوں کا کھلا ہونا کوئی عجیب مسئلہ نہیں۔ دوسرا سوال جو حضرت نوح (علیہ السلام) کے بیٹے سلسلے میں کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) نے اس حساس موقع پر صرف اپنے بیٹے کو کیوں پکارا سب لوگوں کو دعوت کیوں نہ دی، ہوسکتا ہے یہ اس بنا پر ہو کہ وہ عمومی دعوت کا فریضہ سب کے لئے یہاں تک کہ بیٹے کے لئے بھی انجام دے چکے تھے لیکن بیٹے کے بارے میں ان کی ذمہ داری زیادہ ہو کیونکہ وہ اس کے لئے نبی ہونے کے علاوہ باپ ہونے کے حوالے سے بھی مسئولیت رکھتے تھے، اسی بنا پر اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے آخری لمحات میں اپنے فرزند کے لئے مزید تاکید کر رہے تھے۔

بعض مفسرین کے بقول یہاں ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پسر نوح اس وقت نہ کفار کی صف میں تھا اور نہ مومنین کی صف میں، جملہ ”وکان فی معزل“ (وہ گوشہ تنہائی میں کھڑا تھا) کو انہوں نے اس کی دلیل قرار دیا ہے، اگرچہ وہ مومنین کی صف میں شامل نہ ہونے کے وجہ عذاب کا مستحق تھا لیکن کفار کی صف سے اس کی کنارہ کشی کا تقاضا تھا کہ طریق تبلیغ سے اس کے ساتھ لطف و محبت کا اظہار کیا جاتا ہے، علاوہ ازیں کفار کی صف سے اس کی علحیدگی نے حضرت نوح (علیہ السلام) یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ شاید وہ اپنے کام سے پشیمان ہو چکا ہے۔

آئندہ کی آیات پر توجہ کرنے سے یہ احتمال بھی پیدا ہوتا ہے کہ پسر نوح صراحت سے اپنے باپ کی مخالفت نہیں کرتا تھا بلکہ ”منافقین“ کی صورت میں تھا اور بعض اوقات آپ کے سامنے اظہار موافقت کرتا تھا، ایسی لئے حضرت نوح (علیہ السلام) نے کدا سے اس کے لئے نجات کا تقاضا کیا۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت ان آیات کے منافی نہیں ہے جو کہتی ہیں کہ نزول عذاب کے وقت توبہ کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔

### ۳. طوفان نوح میں عبرت کے درس

جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآن گذشتہ لوگوں واقعات درس عبرت دینے کے لئے اور اصلاح و تربیت کے لئے بیان کرتا ہے، ہم نے حضرت نوح (علیہ السلام) کی داستان کا جتنا حصہ پڑھا ہے اس میں بہت سے درس پوشیدہ ہیں، ان میں سے ہم بعض کی ذیل میں اشارہ کرتے ہیں۔

الف۔ روئے زمین کو پاک کرنا: یہ صحیح ہے کہ خدا رحیم اور مہربان ہے لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ اس کے باجود حکیم بھی ہے، اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی قوم و ملت فاسد ہوجائے اور نصیحت کرنے والوں اور تربیت کرنے والے خدائی نمائندوں کی دعوت ان پر اثر نہ کرے تو انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، ایسے مواقع پر خدائے تعالیٰ بالآخر معاشرتی یا طبیعی اور فطری انقلابات کے ذریعے ان کی زندگی کے کارخانے کو درہم برہم کر کے انہیں نابود کر دیتا ہے۔

یہ بات نہ قوم نوح میں منحصر تھی اور نہ کسی اور زمانے یا معین وقت میں، یہ ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے ایک خدائی سنت ہے یہاں تک کہ ہمارے زمانے کے لئے بھی اور ہوسکتا ہے پہلی اور دوسری عالمی جنگیں اس پاک سازی کی مختلف شکلیں ہوں۔

ب۔ طوفان کے ذریعے انقلاب کیوں؟: یہ صحیح ہے کہ ایک فاسد اور بری قوم کو نابود ہونا چاہئے وہ کسی ذریعے سے نابود ہو اس میں فرق نہیں پڑتا لیکن آیات قرآنی میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ عذاب و سزا اور قوموں کی گناہوں میں ایک قسم کی مناسبت تھی اور ہے۔ (غور کیجئے)

فرعون نے عظیم دریائے نیل اور اس کے پر برکت پانی کو اپنی قوت و طاقت کا ذریعہ بنا رکھا تھا، یہ بات جاذب نظر ہے کہ وہی اس کی نابودی کا سبب بنا۔

نمرود کو اپنے عظیم لشکر پر بھروسہ تھا اور ہم جانتے ہیں کہ حشرات الارض کے چھوٹے سے لشکر نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو شکست دی۔

قوم نوح زراعت پیشہ تھی ان کی کثیر دولت کا دارومدار زراعت پر ہی تھا ہم جانتے ہیں کہ ایسے لوگ اپنا سب کچھ بارش کے حیات بخش قطروں کو سمجھتے ہیں لیکن آخر کار بارش ہی نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

یہاں سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ خدائی فیصلوں میں کس قدر تدبیر اور تدبیر کار فرما ہوتا ہے، اسی طرح اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے سرکش انسان پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اپنے جدید ترین اسلحوں کے ذریعے نیست و نابود ہوتے ہیں تو یہ بات ہمارے لئے باعث تعجب نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ پسے ہوئے محروم انسانوں کے وسائل لوٹنے کے لئے ان کی استعماری طاقتوں نے اپنی اس ٹیکنالوجی اور مصنوعات پر ہی بھروسہ کر رکھا تھا۔

ج خدا کا نام ہر حالت میں او رہر جگہ: مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خدا کا نام کشتی کے رکتے اور چلتے وقت فراموش نہ کریں، سب کچھ اس کے نام سے، اس کی یاد کے ساتھ اور اس کی پاک ذات سے مدد طلب کرتے ہوئے ہونا چاہیئے، ہر حرکت، ہر سکون میں، حالت آرام میں اور طوفان میں سب کچھ اسی کے نام سے شروع ہونا چاہیئے کیونکہ جو کام اس کے نام کے بغیر شروع ہوگا وہ ابتر اور دم بریدہ ہوگا، جیسا کہ رسول اللہ کی مشہور حدیث میں ہے:

کل امر ذی بال لم یذکر فیہ بسم اللہ فہو ابتر۔

ہر اہم کام جس میں نام خدا نہ لیا جائے بد انجام اور دم بریدہ ہوگا۔ (1)

اہم بات یہ ہے کہ نام خدا کا ذکر تکلفات اور تشریفات کے لئے نہ ہو بلکہ مقصد کے طور پر ہو یعنی جو کام خدائی مقصد کے تحت نہیں ہوگا اور اس کا ہدف خدا نہیں ہوگا وہ ابتر اور دم بریدہ ہوگا کیونکہ سارے مقاصد تو ختم ہوجاتے ہیں لیکن الہی مقاصد ختم ہونے والے نہیں ہوتے، مادی اہداف جب اپنے کمال کو پہنچ جائیں تو ختم ہوجاتے ہیں لیکن خدائی اہداف اس کی پاک ذات کی طرح دائمی اور جاوداں ہوتے ہیں۔

د۔ کمزور سہارے: عام طور پر ہر شخص اپنی زندگی کی مشکلات میں کسی چیز کا سہارا لیتا ہے اور پناہ گاہ ڈھونڈتا ہے، کچھ لوگ اپنی دولت و ثروت کو سہارا سمجھتے ہیں، کچھ مقام و منصب کو، کچھ اپنی جسمانی طاقت کو اور بعض اپنی قوت فکر کو، لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا آیات کہتی ہیں اور تاریخ نشاندہی کرتی ہے حکم خدا کے سامنے ان میں سے کسی چیز کی ذرہ برابر حیثیت نہیں ہے، ارادہ الہی کے سامنے ان میں سے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی جیسے تار عنکبوت شدید اندھی میں فوراً درہم برہم ہوجاتی ہے۔

پیغمبر خدا حضرت نوح (علیہ السلام) کا نادان اور سرپھرا بیٹا بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھا، اس کا خیال تھا کہ خدا کے طوفان غضب کے مقابلے میں پہاڑ اسے پناہ دے گا لیکن یہ اس کا کتنا بڑا اشتباہ تھا، طوفان کی ایک لہر نے اس کا کام تمام کر دیا اور اسے ملک عدم میں پہنچا دیا، یہی وجہ ہے کہ ہم بعض دعاؤں میں پڑھتے ہیں:

ہا رب منک الیک۔ (2)

میں تیرے غضب سے تیری طرف بھاگتا ہوں۔

یعنی اگر تیرے غضب کے مقابلے میں کوئی پناہ گاہ ہے تو وہ بھی تیری ذات پاک ہے اور بازگشت تیری ہی طرف ہے نہ کہ کسی اور کی طرف۔

رکشتی نجات: کشتی نجات کے بغیر کسی طوفان سے نہیں بچا جاسکتا، ضروری نہیں کہ وہ کشتی لکڑی اور لوہے کی بنی ہو بلکہ بعض اوقات یہ کشتی ایک کارساز، حیات بخش اور مثبت مکتب و مذہب ہوتا ہے جو انحرافی افکار کی طوفانی موجوں سے مقابلہ کرتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو ساحل نجات تک پہنچا دیتا ہے، اسی بنا پر شیعہ اور سنی کتب میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو روایات نقل ہوئی ہیں ان میں آپ کے خاندان یعنی اہل بیت (علیہ السلام) اور حاملین مکتب اسلام کا ”کشتی نجات“ کی حیثیت سے تعارف کروایا گیا ہے۔

حنش بن مغیرہ کہتا ہے:

میں ابوذر کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آیا، ابوذر نے بیت اللہ کے دروازے کے حلقہ میں ہاتھ ڈالا اور بلند آواز سے کہا: میں ابوذر ہوں جو شخص مجھے نہیں پہچانتا پہچان لے، میں وہی جندب ہوں (ابوذر کا اصلی نام جندب تھا)، میں رسول اللہ کا صحابی ہوں، میں نے اپنے کان سے آپ کو کہتے ہوئے سنا کہ آپ فرما رہے تھے:

مثل اہل بیٹی مثل سفینة نوح من رکبھا نجی۔

یعنی۔ میرت اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی۔ (3)

حدیث کے دوسرے طرق میں اس جملے کا اضافہ ہوا ہے:

فمن تخلف عنھا غرق۔

اور جو اس سے دور رہا اور جس نے تخلف کیا وہ غرق ہوا۔ (4)

بعض جگہ یہ جملہ بھی ہے:

من تخلف عنها هلك. (5)

یعنی - جو اس سے دور رہا وہ ہلاک ہوا -

رسول خدا کی یہ حدیث صراحت سے کہتی ہے کہ جس وقت فکری، عقائدی اور معاشرتی طوفان اسلامی معاشرے کا رخ کریں تو ایسے میں واحد راہ نجات اس میں مکتب میں پناہ لینا ہے، اس مسئلے کو ہم نے ملت ایران کے عظیم الشان انقلاب میں اچھی طرح سے آزمایا ہے کہ غیر اسلامی مکاتب کے پیروکاروں نے طاغوت کے مقابلے میں شکست کھائی اور صرف وہی لوگ کامیاب ہوئے جنہوں نے پناہ گاہ اسلام اور اہل بیت (علیہ السلام) کے مکتب اور ان کے انقلابی پروگراموں کو بنایا -

.....

1. سفینة البحار، ج ۱، ص ۶۶۳.

2. دعائے ابوحمزہ ثمالی -

3. ابن قتیبہ دینوری جو مشہور علماء اہل سنت میں سے ہیں انہوں نے یہ حدیث عیون الاخبار، ج ۱، ص ۲۱۱ پر لکھی ہے -

4. معجم الکبیر تالیف حافظ طبرانی، ص ۱۳۰، (مخطوط)

5. یہ حدیث بہت سے علماء اہل سنت مثلاً حاکم نیشاپوری نے مستدرک میں، ابن منازلی نے مناقب امیرالمومنین میں، علامہ خوارزمی نے مقتل الحسین میں، حموی نے فراند المسلمین، میں اور دیگر بہت سے علماء نے اپنی کتب میں نقل کی ہے (مزید وضاحت کے لئے احقاق الحق، ج ۹، ص ۲۸۰، طبع جدید کی طرف رجوع فرمائیں -

تفسیر نمونہ جلد 09

۴۴ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَائِكِ وَيَأَسْمَاءُ أَفْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءِ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ.

ترجمہ

۴۴ اور کہا گیا: اے زمین! اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا، اور پانی نیچے چلا گیا اور معاملہ ختم ہو گیا اور وہ (کشتی) جودی (پہاڑ کے دامن) میں ٹھہر گئی اور (اس وقت) کہا گیا: دور ہو ظالم قوم۔

ایک داستان کا اختتام

جیسا کہ گزشتہ آیات میں ہم نے اجمالاً سربستہ طور پر پڑھا ہے کہ آخر کار پانی کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی لہروں نے تمام جگہوں کو گھیر لیا، پانی کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی، جاہل گنہگاروں نے یہ گمان کیا کہ یہ ایک معمول کا طوفان ہے، وہ اونچی جگہوں اور پہاڑوں پر پناہ گزریں ہو گئے لہذا پانی ان کے اوپر سے بھی گزر گیا اور تمام جگہیں پانی کے نیچے چھپ گئیں، ان طغیان گروں کے جسم، ان کے بچے کھچے گھر اور زندگی کا سازوسامان پانی کی جھاگ میں نظر آ رہا تھا -

حضرت نوح (علیہ السلام) نے زمام کشتی خدا کے ہاتھ میں دی، موجیں کشتی کو ادھر سے ادھر لے جاتی تھیں، روایات میں آیا ہے کہ کشتی پورے چھ ماہ سرگرداں رہی، یہ مدت ابتدائے ماہ رجب سے لے کر ذی الحجہ کے اختتام تک تھی، ایک اور روایت کے مطابق دس رجب سے لے کر روز عاشورہ تک کشتی پانی کی موجوں میں سرگرداں رہی - (۱)

اس دوران میں کشتی نے مختلف علاقوں کی سیر کی یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق سرزمین مکہ اور خانہ کعبہ کے اطراف کی بھی سیر کی -

آخر کار عذاب کے خاتمے اور زمین کے معمول کی حالت میں لوٹ آنے کا حکم صادر ہوا، مندرجہ بالا آیت میں اس فرمان کی کیفیت، جزئیات اور نتیجہ بہت مختصر مگر انتہائی عمدہ اور جاذب و خوبصورت عبرت میں چھ جملوں میں بیان کیا گیا ہے -

پہلے ارشاد ہوتا ہے: حکم دیا گیا کہ ات زمین! اپنے پانی نگل جاؤ (وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَائِكِ) -

اور آسمان کو حکم ہوا ”اے آسمان ہاتھ روک لے“ (وَبَاسْمَاءِ أَقْلَبِي وَ)۔  
”پانی نیچے بیٹھ گیا“ (غِيضَ الْمَاءِ)۔

”اور کشتی کوہ جودی کے دامن سے الگی“ (وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ)۔  
”اس وقت کہا گیا: دور ہو ظالم قوم“ (وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ)۔

مندرجہ بالا آیت کی تعبیرات مختصر ہوتے ہوئے بھی نہایت موثر اور دلنشین ہیں، یہ بولتی ہوئی زندہ تعبیرات ہیں اور تمام تر زیبائی کے باوجود بلا دینے والی ہیں، بعض علماء عرب کے بقول یہ آیات قرآن میں سے فصیح ترین اور بلیغ ترین آیت ہے، روایات اور توریخ اسلام میں اس کی شہادت موجود ہے، لکھا ہے:

کچھ کفار قریش قرآن سے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ قرآنی آیات جیسی کچھ آیات گھڑیں، ان سے تعلق رکھنے والوں نے انہیں چالیس دن تک بہترین غذائیں مہیا کیں، مشروبات فراہم کئے اور ان کی ہر فرمائش پوری کی، خالص گندم کا معدہ، بکرے کا گوشت، ایرانی شراب غرض سب کچھ انہیں لاکر دیا تاکہ وہ آرام و راحت کے ساتھ قرآنی آیات جیسے جملوں کی ترکیب بندی کریں۔

لیکن جب وہ مذکورہ آیت تک پہنچے تو اس نے انہیں اس طرح سے بلا کر رکھ دیا کہ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ ایسی گفتگو ہے کہ کوئی کلام اس سے مشابہت نہیں رکھتا، یہ کہہ کر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور مایوس ہو کر ادھر ادھر چلے گئے۔ (2)

کوہ جودی کہاں ہے؟

بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ کوہ جودی جس کے کنارے کشتی نوح آکر لگی تھی اور جس کا ذکر مذکورہ آیات میں آیا ہے وہی مشہور پہاڑ ہے جو موصل کے قریب ہے۔ (3)

بعض دوسرے مفسرین نے اسے حدود شام میں یا ”آمد“ کے نزدیک یا عراق کے شمالی پہاڑ سمجھا ہے۔ کتاب مفردات میں راغب نے کہا ہے کہ یہ وہ پہاڑ ہے جو موصل اور الجزیرہ کے درمیان ہے (الجزیرہ شمالی عراق میں ایک جگہ ہے اور یہ الجزائر یا الجزیرہ نہیں جو آج کل مشہور ہے)۔

بعید نہیں کہ ان سب کی بازگشت ایک ہی طرف ہو کیونکہ موصل، آمد اور الجزیرہ سب عراق کے شمالی علاقوں میں ہیں اور شام کے نزدیک ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جودی سے مراد ہر مضبوط پہاڑ اور محکم زمین ہے یعنی کشتی نوح ایک محکم زمین پر لنگر انداز ہوئی جو اس کی سواریوں کے اترنے کے لئے مناسب تھی، لیکن مشہور و معروف وہی پہلا معنی ہے۔

کتاب ”اعلام قرآن“ میں کوہ جودی کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے، یہ تحقیق ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

جودی ایک پہاڑ کا نام ہے جس پر کشتی نوح آکر ٹھہر گئی تھی، اس کا نام سورہ ہود کی آیت ۴۴ میں آیا ہے کہ جس کا مضمون تورات کے مندرجات کے قریب ہے، کوہ جودی کے محل و مقام کے بارے میں تین قول ہیں:

۱۔ اصفہانی کے بقول کوہ جودی عربستان (4) میں ہے اور ان دو پہاڑوں میں سے ایک ہے جو قبیلہ ”طی“ کی حکومت میں تھے۔

۲۔ کوہ جودی کاردین کا سلسلہ ہے جو جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق اور دجلہ کے مشرق میں موصل کے نزدیک میں واقع ہے، اگر اسے اپنے لب و لہجہ میں کاردو اور یونانی جوردی اور اعراب جودی کہتے ہیں۔

ترگوم یعنی تورات کے کلدانی ترجمے میں اور اسی طرح تورات کے سریانی ترجمے میں کشتی نوح کے رکنے کی جگہ کوہ اکراہ کا قلعہ ”کاردین“ معین ہوا ہے، عرب کے جغرافیہ دانوں نے بھی قرآن میں مذکورہ کوہ جودی کو یہی پہاڑ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ کشتی نوح کے تختے کے کچھ ٹکڑے بنی عباس کے زمانے تک اس پہاڑ کی چوٹی پر باقی تھے اور مشرکین ان کی زیارت کیا کرتے تھے۔

بابل کی داستانوں میں طوفان نوح کی داستانوں سے مشابہ ایک داستان موجود ہے۔

علاوہ از این یہ احتمال ہے بھی ہے کہ دجلہ میں طوفان آیا ہو اور اس علاقے لوگوں کو طوفان کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

کوہ جودی پر آشوری کتیبے موجود ہیں، انہیں کتیبہ ہائے مسیر کہتے ہیں، ان کتیبوں میں ”ارارتو“ کا نام نظر آتا ہے۔

۳۔ موجودہ تورات کے ترجمے میں کشتی نوح کے رکنے کی جگہ ارارات کے پہاڑ قرار دی گئی ہے اور وہ کوہ ماسیس ہے جو ارمنستان میں واقع ہے۔

قاموس کتاب مقدس کے مولف نے پہلے معنی کو ”ملعون“ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ روایات کے مطابق کشتی نوح اس پہاڑ کے اوپر رکی اور اسے عرب جودی کہتے ہیں، ایرانی کوہ نوح کہتے ہیں اور ترک ”کرداغ“ کہتے ہیں کہ جو ڈھلوان

کے معنی میں ہے اور وہ ارس کے قریب واقع ہے -  
 پانچویں صدی تک ارمنستانی ارمنستان میں جو دی پہاڑ کو نہیں جانتے تھے، اس صدی سے شاید تورات کے ترجمہ نگاروں کو اشتباہ ہوا ہے اور انہوں نے کوہ اکراد کا ترجمہ کوہ آرات کر دیا جس کی وجہ سے ارمنی علماء کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے -  
 شاید یہ خیال اس وجہ سے پیدا ہوا ہو کہ آشوری لوگ ”وان“ جھیل کے شمال اور جنوب کے پہاڑ کو ”آرات“ یا ”آراتو“ کہتے تھے -  
 کہتے ہیں کہ طوفان ختم ہونے کے بعد حضرت نوح (علیہ السلام) نے کوہ جو دی کی چوٹی پر ایک مسجد بنائی تھی -  
 ارمنی بھی کہتے ہیں کہ کوہ جادی کے نیچے قریب ”ثمانین“ یا ”ثمان“ وہ پہلی جگہ ہے جہاں حضرت نوح (علیہ السلام) کے ہمراہی آکر اترے تھے - (5)

۱. تفسیر قرطبی، ج ۵، ص ۳۲۶۹، تفسیر ابولفتوح رازی، ج ۶، ص ۲۷۸، تفسیر مجمع البیان، ج ۵، ص ۱۶۴، اور طبری، ص ۱۲، ص ۲۹.
۲. مجمع البیان، ج ۵، ص ۱۶۵، روح المعانی، ج ۱۲، ص ۵۷.
۳. مجمع البیان، روح المعانی اور قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں -
۴. جس کا نام آج کل موجودہ حکمرانوں نے اپنے خاندان کے نام پر ”سعودی عرب“ رکھا ہوا ہے - (مترجم)
۵. اعلام قرآن خزانی، ص ۲۸۱.

۴۵ وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ -  
 ۴۶ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعْطُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ -  
 ۴۷ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُنْ مِنَ الْخَاسِرِينَ -

ترجمہ

۴۵. نوح نے اپنے پروردگار سے عرض کیا: پروردگار! میرا بیٹا میرے خاندان میں سے ہے اور تیرا وعدہ (میرے خاندان کے بارے میں) حق ہے اور تو تمام حکم کرنے والوں سے برتر ہے -  
 ۴۶. فرمایا: اے نوح! تیرے اہل سے نہیں ہے، وہ غیر صالح ہے، جس سے تو آگاہ نہیں وہ سوال مجھ سے نہ کر، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں تاکہ جاہلوں میں سے نہ ہو -  
 ۴۷. عرض کیا: پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسی چیز کا سوال کروں کہ جس سے میں آگاہی نہیں رکھتا اور اگر تو مجھے نہ بخشے تو میں زیاں کاروں میں سے ہوجاؤں گا -

پسر نوح کا دردناک انجام

ہم پڑھ چکے ہیں کہ نوح کے بیٹے نے باپ کی نصیحت نہ سنی اور آخری سانس تک اس نے ہٹ دھرمی اور بے ہودگی کو نہ چھوڑا اور آخر کار طوفان کی موجوں میں گرفتار ہو کر غرق ہو گیا -  
 زیر بحث آیات میں اس داستان کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو موجوں کے درمیان دیکھا تو شفقت پدري نے جوش مارا، انھیں چاہنے بیٹے کی نجات کے بارے میں وعدہ الہی یاد آیا، انہوں نے درگاہ الہی کا رخ کیا اور کہا: پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل اور میرے خاندان میں سے ہے اور تونے وعدہ فرمایا تھا کہ میرے خاندان کو طوفان اور ہلاکت سے نجات دے گا اور تو تمام حکم کرنے والوں سے برتر ہے اور تو ایفائے عہد کرنے میں محکم تر ہے ( وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ) -  
 یہ وعدہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو اسی سورہ کی آیہ ۴۰ میں موجود ہے جہاں فرمایا گیا:  
 ۴۰ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ -  
 ہم نے نوح کو حکم دیا کہ جانوروں کی ہر نوع میں سے ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلو اور اسی طرح اپنے خاندان کو سوائے اس شخص کے جس کی نابودی کے لئے فرمان کدا جاری ہو چکا ہے -  
 حضرت نوح (علیہ السلام) نے خیال کیا کہ ”الا من سبق عليه القول“ سے مراد صرف ان کی بے ایمان اور مشرک بیوی ہے اور ان کا بیٹا کنعان اس میں شامل نہیں ہے لہذا انہوں نے بارگاہ خدا وندی میں ایسا تقاضا کیا -

لیکن فوراً جواب ملا، بلا دینے والا جواب اور ایک عظیم حقیقت واضح کرنے والا جواب ، وہ حقیقت جو کہ جو رشتہ مکتب کو نسب اور خاندان کے رشتہ سے مافوق قرار دیتی ہے، ”درمایا: اے نوح وہ تیرے اہل اور خاندان میں سے نہیں ہے“ (قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ)، ”بلکہ وہ غیر صالح عمل ہے“ (اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ)، وہ نالائق شخص ہے اور تجھ سے مکتبی اور مذہبی رشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے خاندانی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں رہی ۔

اب جب ایسا ہے تو مجھ سے ایسی چیز کا تقاضا نہ کر جس کے بارے میں تجھے علم نہیں ”فَلَا تَسْأَلْنِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ“، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ ہو جا“ (اِنِّيْ اَعْطٰكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ) ۔

حضرت نوح (علیہ السلام) سمجھ گئے کہ یہ تقاضا بارگاہ الہی میں صحیح نہ تھا اور ایسے بیٹے کی نجات کو خاندان کی نجات کے بارے میں خدا کے وعدے میں شامل نہیں سمجھنا چاہیئے تھا، لہذا آپ نے درگاہ پرورگار کا رخ کیا اور کہا: ”پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس امر سے کہ تجھ کسی ایسی چیز کی خواہش کروں جس کا علم مجھے نہیں“ (قَالَ رَبِّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ) ۔

اور اگر تونے مجھے نہ بخشا اور اپنی رحمت میرے شامل حال نہ کی تو میں زیاں کاروں میں سے ہوجاؤں گا (وَالَا تُغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْ اَكُنْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ) ۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کا بیٹا کیوں ”عمل غیر صالح“ تھا؟

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس آیت میں ایک لفظ مقدر ہے اور اصل میں اس کا مفہوم اس طرح ہے: ”انہ ذو عمل غیر صالح“۔ یعنی تیرا بیٹا غیر صالح عمل والا ہے ۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بعض اوقات انسان کسی کام میں اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ گویا عین و مل ہوجاتا ہے، مختلف زبانوں کے ادب میں یہ چیز بہت نظر آتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے: فلاں شخص سراپا دل و سخاوت ہے یا فلاں شخص سراپا فساد ہے، گویا وہ اس عمل میں اس قدر غوطہ زن ہے کہ اس کی ذات عین وہی عمل ہو چکی ہے، یہ پسر نبی بھی بروں کی صحبت میں اس قدر بیٹھا اور برے اعمال اور ان کے غلط افکار میں اس طرح غوطہ زن ہوا کہ گویا اس وجود ایک غیر صالح عمل میں بدل گیا ۔

لہذا مندرجہ بالا تعبیر اگرچہ بہت ہی مختصر ہے لیکن ایک اہم حقیقت کی عکاس ہے، یعنی اے نوح ۱ اگر برائی، ظلم اور فساد اس بیٹے کے وجود میں سطحی طور پر ہوتا تو اس کے بارے میں امکان شفاعت تھا لیکن اب جب کہ یہ سراپا غرق فساد و تباہی ہے تو اہل شفاعت نہیں رہا، اس کی بات ہرگز نہ کرو۔

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ حقیقتاً یہ آپ کا بیٹا نہیں تھا (یا غیر شرعی بیٹا تھا یا آپ کی بیوی کا دوسرا شوہر سے غیر شرعی بیٹا تھا) ۔ یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ”انہ عمل غیر صالح“ کا جملہ در حقیقت ”انہ لیس من اہلک“ کے لئے علت و سبب کی طرح ہے، یعنی یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ”تیرے اہل میں سے نہیں ہے“ اس لحاظ پر ہے کہ کردار کے لحاظ سے تجھ سے جدا ہے، گرچہ اس کا نسب تجھ سے متصل ہے ۔

۲۔ حضرت نوح (علیہ السلام) اپنے بیٹے کے بارے میں کیوں کر متوجہ نہ تھے؟

مندرجہ بالا آیت میں حضرت نوح (علیہ السلام) کی گفتگو اور خدا کی طرف سے انہیں دئے گئے جواب کی طرف توجہ کرنے سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) اس مسئلے کی طرف کیوں کر متوجہ نہ تھے کہ وعدہ الہی میں ان کا بیٹا شامل نہیں ۔

اس سوال کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ اس بیٹے کی کیفیت پوری طرح سے واضح نہ تھی کبھی وہ مومنین کے ساتھ ہوتا اور کبھی کفار کے ساتھ، اس کی منافقانہ چال ہر شخص کو ظاہر اشتباہ میں ڈال دیتی تھی ۔

علاوہ ازیں اپنے بیٹے سے متعلق حضرت نوح (علیہ السلام) کو شدید احساس مسئولیت تھا، پھر فطری اور طبعی لگاؤ بھی تھا جو ہر اباب کو اپنے بیٹے سے ہوتا ہے اور انبیاء بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں یہی سبب ہے کہ آپ نے اس قسم کی درخواست کی لیکن جب آپ حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوئے تو فوراً درگاہ خداوندی میں غرخواہی اور طلب عفو کی اگرچہ آپ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا لیکن نبوت کے مقام اور حیثیت کا تقاضا تھا کہ آپ اپنی گفتار و رفتار میں اس سے زیادہ متوجہ ہوتے، اتنی عظیم شخصیت ہونے کے باعث یہ آپ کا ترک اولیٰ تھا، اسی وجہ سے آپ نے بارگاہ خداوندی میں بخشش کا تقاضا کیا ۔

یہیں سے ایک اور سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا اور وہ یہ کہ کیا انبیاء گناہ کرتے ہیں جب کہ وہ بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

۳۔ جہاں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے  
مندرجہ بالا آیات سے حضرت نوح (علیہ السلام) کی سرگزشت میں سے انسانی تربیت کے حوالے سے ایک اور بلند سبق ہاتھ آتا ہے، ایسا سبق جو مادی مکتبوں میں بالکل کوئی مفہوم نہیں رکھتا لیکن ایک خدائی اور معنوی مکتب میں یہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔  
مادی رشتے یعنی نسب، رشتہ داری، دوستی اور رفاقت آسمانی مکاتب میں ہمیشہ روحانی رشتوں کے تحت ہوتے ہیں اس مکتب میں نسبی و خاندانی رشتوں کا مکتبی و روحانی رشتوں کے مقابلے میں کوئی مفہوم نہیں۔  
جہاں مکتبی رابطے موجود ہیں وہاں دور افتادہ سلمان فارسی جو نہ خاندان پیغمبر سے ہے نہ قریشی ہے، مکی بھی نہیں اور اصلاً عرب بھی نہیں، وہ خاندان رسالت کا حصہ شمار ہوتا ہے جیسا کہ مشہور حدیث ہے:  
سلمان منا اهل البيت  
یعنی۔ سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے۔

دوسری طرف نوح جیسے پیغمبر کا بلا فصل حقیقی بیٹا باپ سے مکتبی رشتہ ٹوڑنے کی وجہ سے اس طرح دھتکادیا جاتا ہے:

انه ليس من اهلك

یہ تیرے اہل میں سے نہیں۔

ہوسکتا ہے مادی فکر رکھنے والوں کو یہ بات بہت گراں محسوس ہو لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تمام ادیان آسمانی میں نظر آتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ احادیث بیت (علیہ السلام) میں ان شیعوں کے بارے میں صریح اور ہلا دینے والی باتیں ہیں جو صرف ام کے شیعہ ہیں لیکن اہل بیت (علیہ السلام) کی تعلیمات اور ان کے عملی پروگراموں کا ان کی زندگی میں کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، یہ امر بھی درحقیقت اسی روش کو واضح کرتا ہے جو قرآن نے زیر نظر آیات میں سامنے رکھی ہے۔  
امام علی بن موسیٰ رضا علیہما السلام سے منقول ہے کہ آپ نے ایک دن اپنے دوستوں اور مولیوں سے یہ پوچھا کہ: یہ لوگ اس آیت کی کس طرح تفسیر کرتے ہیں ”انہ عمل غیر صالح“ (یہ غیر صالح عمل ہے) حاضرین میں سے ایک نے عرض کیا: بعض کا نظریہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ نوح کا بیٹا کنعان ان کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔

امام (علیہ السلام) نے فرمایا:

كلا لقد كان ابنه ولكن لما عصى الله نفاه عين عن ابیه كذا من كان منا لم يطع الله فليس منا۔

یعنی۔ ایسا نہیں ہے یقیناً وہ نوح کا بیٹا تھا لیکن جب اس نے نافرمانی کی اور حکم خدا کے راستے سے منحرف ہو گیا تو خدا نے اس کے فرزند ہونے کی نفی کی، اسی طرح جو لوگ ہم میں سے ہوں لیکن خدا کی اطاعت نہ کرتے ہوں وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ (۱)

۴۔ دھتکارے ہوئے مسلمان:

نا مناسب نہ ہوگا اگر ہم مندرجہ بالا آیت سے استفادہ کرتے ہوئے کچھ اسلامی احادیث کی طرف اشارہ کریں جن میں سے بہت سے لوگوں کو، جو ظاہراً مسلمانوں کے زمرے میں ہیں یا ظاہراً مکتب اہل بیت (علیہ السلام) کے پیروکار ہیں، دھتکار دیا ہے اور انہیں مومنین اور شیعوں کی صف سے نکال دیا گیا ہے۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من غش مسلماً فليس منا۔

جو مسلمان بھائیوں سے دھوکی بازی اور خیانت کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (۲)

۲۔ امام صادق (علیہ السلام) فرماتے ہیں:

ليس بولي لي من اكل مال مؤمن حراما۔

جو مومن کا مال ناجائز طور پر کھائے وہ میرا دوست اور موالی نہیں ہے۔ (۳)

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ألا ومن أكرمہ الناس اتقاء فليس منی۔

جان لو کہ جس کے شر سے بچنے کے لئے لوگ اس کا احترام کریں وہ مجھ نہیں ہے -  
۴. امام نے فرمایا:

لیس من شیعتنا من یظلم الناس۔

جو لوگوں پر ظلم کرے وہ ہمارا شیعہ نہیں -

۵. امام کاظم فرماتے ہیں:

لیس منا من لم یحاسب نفسه کل یوم۔

جو شخص ہر روز اپنا محاسبہ نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے - (4)

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من سمع رجلا ینادی یا للمسلمین فلم یجبه فلیس بمسلم۔

جو شخص کسی انسان کی آواز سے سنے جو پکار رہا ہو اے مسلمانو! میری مدد کو پہنچو، میری اعانت کرو اور اس پر

لیک نہ کہے وہ مسلمان نہیں ہے - (5)

۷۔ امام باقر علیہ السلام کے اصحاب میں سے ایک شخص جابر تھا، آپ نے اس سے فرمایا:

واعلم یا جابر بانک لاتکون لنا ولیا حتی لو اجتمع علیک اهل مصرک وقالوا أنت رجل سوء لم یحزنک ذلک ولوقالوا انک رجل صالح لم یسرک ذلک ولکن اعرض نفسك علی کتاب اللہ۔

اے جابر! جان لو کہ تم اس وقت تک ہمارے دوست نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمہارے سارے اہل شہر جمع ہو کر تم سے

کہیں کہ تو برا شخص ہے اور تو اس پر غمگین نہ ہو اور سب مل کر کہیں کہ تو اچھا آدمی ہے اور تو خوش نہ ہو بلکہ

اپنے آپ کو کتاب خدا قرآن کے سامنے پیش کرو اور اچھائی اور برائی کے بارے میں قوانین و ضوابط اس سے لو اور پھر

تم دیکھو کہ تم کس گروہ میں سے ہو۔ (6)

یہ احادیث ان لوگوں کے نظریات پر خط بطلان کھینچتی ہے جو صرف نام پر گزارا کرتے ہیں مگر عمل اور مکتبی ارتباط

کی ان میں کوئی خبر نہیں، یہ احادیث وضاحت سے ثابت کرتی ہیں کہ خدائی پیشواؤں کے مکتب ان کی بنیاد مکتب پر ایمان

اور اس کے پروگراموں کے مطابق عمل کرنا ہے اور تمام چیزوں کو اسی معیار پر پرکھا جانا چاہیے -

.....

۱۔ تفسیر صافی مذکرہ آیات کے ذیل میں -

۲۔ سفینة البحار، ج ۲، ص ۳۱۸۔

۳۔ وسائل، ج ۱۲، ص ۵۳۔

۴۔ بحار، ج ۱۵، حصہ اخلاق (طبع قدیم)۔

۵ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۶۴۔

۶۔ سفینة البحار، ج ۲، ص ۴۹۱۔

## تفسیر نمونہ جلد 09

۴۸ قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّنْ مَعَكَ وَأُمَّمٌ سَمِعَتْهُمْ نَمًّا يَمْسُهُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

۴۹ تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ۔

ترجمہ

۴۸۔ (نوح سے) کہا گیا: اے نوح! سلامتی اور برکت کے ساتھ جو تجھ پر اور تیرے ساتھ موجود تمام امتوں پر ہے اتر آؤ

کچھ ایسی امتیں ہیں جنہیں ہم اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں گے اس کے بعد انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے

گا۔



۴۹۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی (اے پیغمبر!) ہم تجھ پر وحی کرتے ہیں اور انہیں اس سے پہلے نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم لہذا صبر اور استقامت سے کام لو کیونکہ عاقبت پر بیزگاروں کے لئے ہے۔

حضرت نوح (علیہ السلام) باسلامت اتر آئے  
حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کی سبق آموز سرگزشت کے بارے میں اس سورت میں آنے والی یہ آخری آیات ہیں ان میں حضرت نوح (علیہ السلام) کی کشتی سے اترنے اور نئے سرے سے روئے زمین پر معمول کی زندگی گزارنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: نوح سے کہا گیا کہ سلامتی اور برکت کے ساتھ جو ہماری طرف سے تم پر اور ان پر ہے جو تیرے ساتھ ہیں اتر او (قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّنْ مَعَكَ)۔

اس میں شک نہیں ”طوفان“ نے زندگی کے تمام آثار کو درہم برہم کر دیا تھا، فطری طور پر آباد زمینیں، لہلہاتی چراگاہیں اور سرسبز باغ سب کے سب ویران ہو چکے تھے، اس موقع پر شدید خطرہ تھا کہ حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب اور ساتھی زندگی گزارنے اور غذا کے سلسلے میں بہت تنگی کا شکار ہوں گے لیکن خدا نے ان مومنین کو اطمینان دلایا کہ برکت الہی کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور زندگی اور معاش کے حوالے سے تمہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہونا چاہیئے۔

علاوہ ازیں ممکن تھا کہ حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے پیروکاروں کو اپنی سلامتی کے حوالے سے یہ پریشانی ہوتی کہ طوفان کے بعد باقی ماندہ ان گندے پانیوں، جو بڑوناور دلدلوں کے ہوتے ہوئے زندگی کے خطرے سے دوچار ہوگی لہذا خدائے تعالیٰ اس سلسلے میں بھی انہیں اطمینان دلاتا ہے کہ تمہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا اور وہ ذات جس نے ظالموں کی نابودی کے لئے طوفان بھیجا ہے وہ اہل ایمان کی سلامتی اور برکت کے لئے بھی ماحول فراہم کر سکتی ہے۔

یہ مختصر سا جملہ ہمیں سمجھا تا ہے کہ قرآن کیسے چھوٹے چھوٹے مسائل کو بھی اہمیت دیتا ہے اور انہیں جچی تلی اور خوبصورت عبارتوں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔

لفظ ”امم“ ”امت“ کی جمع ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کئی امتیں تھیں، یہ لفظ شاید اس بنا پر کہ جو افراد حضرت نوح (علیہ السلام) کے ساتھ تھے ان میں سے ہر ایک ایک قبیلے اور امت کی پیدائش کا سرچشمہ تھا، یا یہ کہ جو لوگ حضرت نوح (علیہ السلام) کے ساتھ تھے ان میں سے ہر گروہ الگ الگ قوم و قبیلہ سے تھا جس سے مجموعہ کئے امتیں بنتی تھیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ ”امم“ ان مختلف اصناف حیوانات کے بارے میں ہے کہ جو حضرت نوح (علیہ السلام) کے ساتھ تھے کیونکہ قرآن مجید میں ان کے بارے میں لفظ امت آیا ہے، جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۳۸ میں ہے:  
وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَّمٌ أُمَّتًا لَكُمْ.  
کوئی روئے زمین پر چلنے والا اور کوئی پرندہ جو اپنے دو پرو کے ساتھ پرواز کرتا ہے ایسا نہیں جو تمہاری طرح کی امت نہ ہو۔

اس بنا پر جس طرح حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے ساتھی پروردگار کی لامتناہی لطف و کرم کے سائے میں طوفان کے بعد ان تمام مشکلات کے باوجود سلامتی و برکت کے ساتھ جیتے رہے اسی طرح مختلف قسم کے جانور جو حضرت نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کشتی سے اترے تھے خدا کی طرف سے سلامتی اور حفاظت کے ساتھ اور اس کے لطف کے بسائے میں زندگی بسر کرتے رہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: اس تمام تر صورت حال کے باوجود آئندہ پھر انہیں مومنین کی نسل سے کئی امتیں وجود میں آئیں گی جنہیں ہم انواع و اقسام کی نعمتیں بخشیں گے لیکن وہ غرور و غفلت میں ڈوب جائیں گی، اس کے بعد ہمارا دردناک عذاب انہیں پہنچے گا (وَأُمَّمٌ سَمْتَعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ)۔

لہذا ایسا نہیں کہ صالح لوگوں کا یہ انتخاب اور طوفان کے ذریعے نوع انسانی کی اصلاح کوئی آخری اصلاح ہے بلکہ رشد و تکامل کے آخری مرحلہ کو پہنچنے تک انسان اپنے ارادے کی آزادی سے سوء استفادہ کی بنا پر کبھی کبھی شر و فساد کی راہ پر قدم رکھے گا اور پھر سزا اور عذاب کا وہی پروگرام اس جہان میں اسے دامنگیر ہوگا۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ مذکورہ جملے میں لفظ ”سنمتعہم“ (عنقریب انہیں انواع و اقسام کی نعمتوں سے بہرہور کرینگے) آیا ہے اور پھر بلا فاصلہ ان کے لئے عذاب و سزا کی بات کی گئی ہے، یہ اس طرح اشارہ ہے کہ کم ظرف اور ضعیف الایمان لوگوں کو نعمت فراوان میسر آجائے تو ان میں شکر گزار یا اور اطاعت کا جذبہ بیدار ہونے کی بجائے اکثر طغیان و غرور

کے جذبات ابھر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ بندگی خدا کے رشتوں کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔  
مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ایک قول نقل کیا ہے جو بہت جازب ہے، وہ کہتا ہے:  
”ہلک المستمعون فی الدنيا لان الجهل یغلب علیہم والغفلة، فلا یتفکرون الا فی الدنيا و عمارتھا وملاذھا“۔  
صاحبان نعمت دنیا میں ہلاک اور گمراہ ہوئے ہیں کیونکہ جہالیت اور غفلت نے ان پر غلبہ کیا ہے اور دنیا اور اس کی لذت کے علاوہ انہیں کوئی فکر نہیں۔

یہ حقیقت دنیا کے سرمایہ دار اور دولت مند ممالک کی زندگی میں اچھی طرح دیکھی جاسکتی ہے کہ وہ زیادہ تر برائی مینہی غوطہ زن ہیں نہ صرف یہ کہ وہ دنیا کے مستضعف اور محروم انسانوں کے نارے میں سوچتے نہیں بلکہ الٹا ہر روز ان کا خون چوسنے کے لیے نئی نئی سازشیں کرتے رہتے ہیں لہذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خدا انہیں جنگوں اور دیگر المناک حوادث سے دوچار کرتا ہے جو وقتی طور پر ان سے یہ نعمتیں سلب کرتا ہے نہ اس لیے ہوتا ہے کہ شاید وہ بیدار ہوں۔

آخری زیر بحث آیت جس میں اس سورہ میں جاری حضرت نوح (علیہ السلام) کا وقعہ ختم ہوتا ہے تمام مذکورہ واقعات کی طرف عمومی اشارہ ہوتا ہے: یہ سب غیب کی خبر ہے کہ جو (اے پیغمبر) ہم تجھ پر وہی کرتے ہیں (تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْعِيبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ)، قبل ازینتم اور تمہاری قوم اس سے ہرگز آگاہ نہ تھے (مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا)۔ جو کچھ تم نے سنا اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اور اپنی دعوت کے دوران نوح کو پیش آمدہ تمام مشکلات اور اس کی استقامت دکھاؤ کیونکہ آخر کار کامیابی پر بیزگاروں ہی کے لئے ہے (إِ فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ)۔

چند اہم نکات

#### ۱۔ انبیاء کے سچے واقعات

قرآن حکیم نے انبیاء کے سچے واقعات پیش فرمائے ہیں، زیر نظر آخر میں آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان واقعات کو ہر قسم کی تحریف اور انحراف سے پاک بیان کرنا صرف وہی آسمانی کے ذریعے ممکن ہے ورنہ گزشتہ لوگوں کی کتب تاریخ میں اس قدر افسانے اور خرافات شامل ہیں کہ حق و باطل میں تمیز ممکن نہیں اور جتنی تاریخ قدیم ہوتی جاتی ہے اتنا ہی غلط ملط زیادہ ہوتی جاتی ہے، لہذا انبیاء اور گزشتہ اقوام کی انحراف سے پاک سرگزشت بیان کرنا خود حقانیت قرآن اور پیغمبر اسلام (علیہ السلام) کی صداقت کی نشانی ہے۔ (۱)

۱۔ اس سلسلے میں تفصیل کے لئے کتاب ”قرآن و آخرین پیغمبر“، ملاحظہ فرمائیں۔

#### ۲۔ انبیاء اور علم غیب

بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف آخری زیر بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علم غیب رکھتے تھے البتہ یہ آگاہی وحی الہی کے ذریعے ہوتی تھی اور اتنی ہی جتنی خدا چاہتا تھا یہ نہیں کہ وہ اپنی طرف سے کچھ جانتے تھے اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آیات میں علم غیب کی نفی ہوئی ہے تو وہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا علم ذاتی نہیں ہے بلکہ صرف خدا کی طرف سے ہے۔

#### ۳۔ درس کی ہمہ گیری

زیر بحث آخری آیت ایک اور حقیقت بھی واضح کرتی ہے کہ انبیاء اور گزشتہ اقوام کے واقعات قرآن میں صرف امت اسلامی کو درس دینے کے لئے بیان نہیں کئے بلکہ ایک طرح سے یہ پیغمبر اکرم (ص) کی دلجوئی اور تسلی کے لئے بھی ہیں اور اس آپ کے ارادے اور دل کو تقویت بھی مقصود ہے کیونکہ آپ بھی نوع انسانی میں سے ہیں اور آپ کو بھی خدا کے مدرسے سے اسی طرح درس لینا چاہیئے، اپنے زمانے کے طاغوتوں کے خلاف قیام کے لئے زیادہ تیار ہونا چاہیئے اور راستے میں موجود کثیر مشکلات سے نہیں ڈرنا چاہیئے یعنی جیسے ان تمام ابتلا اور مشکلوں کے باوجود حضرت نوح (علیہ السلام) استقامت کا مظاہرہ کرتے تھے اور ان کی مشہور طویل ترین عمر میں بہت ہی کم لوگ ایمان لائے پھر بھی وہ خوشدل تھے اسی طرح آپ بھی کسی حالت میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔  
یہاں حضرت نوح (علیہ السلام) کی تعجب خیز اور عبرت انگیز داستان کو چھوڑتے ہوئے ہم ایک اور عظیم پیغمبر حضرت

بود (علیہ السلام) کہ جن کے نام سے یہ سورہ موسوم ہے کی طرف آتے ہیں۔

۵۰ وَإِلَىٰ عَادِ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ۔

۵۱ يَا قَوْمِ لَأَسْأَلَنَّكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَىٰ الَّذِي فَطَرَنِي أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔

۵۲ وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ۔

ترجمہ

۵۰۔ (ہم نے قوم) عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا، (اس نے ان سے) کہا: اے میری قوم! اللہ کی پرستش کرو کیونکہ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں تم صرف تہمت لگاتے ہو۔

۵۱۔ اے میری قوم! میں تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا میری اجرت اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا سمجھتے نہیں ہو؟۔

۵۲۔ اور اے میری قوم! اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو پھر اس کی طرف رجوع کرو، تاکہ وہ آسمان سے (بارش) پیہم تمہاری طرف بھیجے اور تمہاری میں مزید قوت کا اضافہ کرے اور (حق سے) منہ نہ پھیرو اور گناہ نہ کرو۔

بہادر بت شکن

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس سورت میں پانچ عظیم انبیاء کی دعوت، اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات اور دعوت کے نتائج کا تذکرہ ہے گزشتہ آیات میں حضرت نوح (علیہ السلام) کے بارے میں گفتگو تھی اور اب حضرت ہود (علیہ السلام) کی باری ہے۔

یہ تمام انبیاء ایک ہی منطق اور ایک ہی ہدف کے حامل تھے، انہوں نے نوع بشر کو ہر طرح کی قید و بند سے نجات دلانے اور توحید کی طرف، اس کی تمام شرائط کے ساتھ، دعوت دینے کے لئے قیام کیا، ایمان، خلوص، جدوجہد اور راہ خدا میں استقامت ان سب کا شعار تھا، ان سب کے خلاف مختلف اقوام کا رویہ بہت تنگ اور سخت تھا انہوں نے انبیاء کو طرح طرح سے ستایا اور ان کو جبر و استبداد روا رکھا۔

زیر نظر پہلی آیت میں اس سلسلے میں فرمایا گیا ہے: ہم قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا (وَإِلَىٰ عَادِ أَخَاهُمْ هُودًا)۔

یہاں حضرت ہود (علیہ السلام) کو بھائی کہا گیا تھا، یہ تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ عرب اپنے تمام اہل قبیلہ کو بھائی کہتے تھے کیونکہ نسب کی اصل میں سب شریک ہوتے ہیں، مثلاً بنی اسد کے شخص کو ”خواسدی“ کہتے ہیں اور مذحج قبیلہ کے شخص کو ”اخومذحج“ کہتے ہیں، یا ہوسکتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ حضرت ہود (علیہ السلام) کا سلوک اپنی قوم سے دیگر انبیاء کی طرح بالکل برادرانہ تھا نہ کہ حاکم کا سا بلکہ ایسا بھی نہیں جو باپ اپنی اولاد سے کرتا ہے بلکہ آپ کا سلوک ایسا تھا جو ایک بھائی دوسرے بھائیوں سے کرتا ہے کہ جس میں کوئی امتیاز اور برتری کا اظہار نہ ہو۔

حضرت ہود (علیہ السلام) نے بھی اپنی دعوت کا آغاز دیگر انبیاء کی طرح کیا، آپ کی پہلی دعوت توحید اور ہر قسم کے شرک کی نفی کی دعوت تھی، ہود چنے ان سے کہا: ”اے میری قوم! خدا کی عبادت کرو“ (قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ)۔

”کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اللہ اور معبود لائق پرستش نہیں“ (مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ)، ”بتوں کے بارے میں تمہارا اعتقاد غلطی اور اشتباہ پر مبنی ہے اور اس میں تم خدا پر افتراء باندھتے ہو“ (إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ)۔

یہ بت خدا کے شریک ہیں نہ خیر و شر کے منشاء و مبداء اور ان سے کوئی کام بھی نہیں ہوسکتا، اس سے بڑھ کر کیا افتراء اور تہمت ہوگی کہ اس قدر بے وقعت موجودات کے لئے تم اتنے بڑے مقام و منزلت کا اعتقاد رکھو۔

اس کے بعد حضرت ہود (علیہ السلام) نے مزید کہا: اے میری قوم! میں اپنی دعوت کے سلسلے میں تم سے کوئی توقع نہیں رکھتا تم سے کسی قسم کی اجرت نہیں چاہتا کہ تم یہ گمان کرو کہ میری یہ داد و فریاد اور جوش و خروش مال و مقام کے حصول کے لئے ہے یا تم خیال کرو کہ تمہیں مجھے کوئی بہاری معاوضہ دینا پڑے گا کہ جس کی وجہ سے تم تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتے ہو (يَا قَوْمِ لَأَسْأَلَنَّكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا)، میری اجرت صرف اس ذات پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، جس نے مجھے روح و جسم بخشے ہیں اور تمام چیزیں جس نے مجھے عطا کی ہیں وہی جو میرا خالق و رازق ہے (إِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَىٰ الَّذِي فَطَرَنِي)، میں اگر تمہاری بدایت و سعادت کے لئے کوئی قدم اٹھاتا ہوں تو وہ اصولاً اس کے حکم کی اطاعت میں ہوتا ہے لہذا اجرو جزا بھی میں اسی سے چاہتا ہوں نہ کہ تم سے، علاوہ ازیں کیا تمہارے پاس اپنی طرف سے کچھ ہے جو تم مجھے دو، جو کچھ تمہارے پاس ہے اس کی طرف سے ہے، کیا سمجھتے نہیں ہے (أَفَلَا تَعْقِلُونَ)۔

آخر میں انہیں شوق دلانے کے لئے اور اس گمراہ قوم میں حق طلبی کاجذبہ بیدار کرنے کے لئے تمام ممکن وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے مشروط طور پر مادی جزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو اس جہان میں خدا مومنین کو عطا فرماتا ہے ، ارشاد ہوتا ہے: اے میری قوم ! اپنے گناہوں پر خدا سے بخشش طلب کرو ( وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ )، پھر توبہ کرو اور اس کی طرف لوٹو اُو ( ثُمَّ تَوْبُوا إِلَيْهِ )، اگر تم ایسا کرلو تو وہ آسمان کو حکم دے گا کہ وہ بارش کے حیات بخش قطرے پیہم تمہاری طرف بھیجے ( يُرْسِلُ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ) (۱) ، تاکہ تمہارے کھیت اور باغات کم آبی یا بے آبی کا شکار نہ ہوں اور ہمیشہ سرسبز وشاداب رہیں، علاوہ ازیں تمہارے ایمان، تقویٰ، گناہ سے پرہیز اور خدا کی طرف رجوع اور توبہ کی وجہ سے تمہاری قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے گا ( وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ )۔

یہ کبھی گمان نہ کرو کہ ایمان وتقویٰ سے تمہاری قوت میں کمی واقع ہوگی ایسا ہرگز نہیں بلکہ تمہاری جسمانی و روحانی قوت میں اضافہ ہوگا، اس کمک سے تمہارا معاشرہ آبادتر ہوگا، جمعیت کثیر ہوگی، اقتصادی حالات بہتر ہوں گے اور تم طاقتور، آزاد اور خود مختار ملت بن جاؤ گے، لہذا راہ حق سے روگردانی نہ کرو اور شاہراہ گناہ پر قدم نہ رکھو (وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ)

.....

۱۔ ”مدرار“ جیسے کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے ”در“ کے مادہ سے ”پستان سے دودھ گرنے“ کے معنی میں ہے، بعد از انبارش برسنے کے معنی میں بھی بولا جائے لگا، یہ بات جاذب نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ آسمان سے تم پر بارش برسائے گا بلکہ فرمایا گیا ہے کہ آسمان کو تم پر برسائے گا یعنی اس قدر بارش برسے گی کی گویا سارا آسمان برس رہا ہے، نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”مدرار“ مبالغہ کا صیغہ ہے اس سے انتہائی تاکید ظاہر ہوتی ہے۔

۱۔ تمام انبیاء کی دعوت کا خمیر توحید ہے

تاریخ انبیاء نشاندہی کرتی ہے کہ ان سب نے اپنی دعوت کا آغاز توحید سے اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کی نفی سے کیا، درحقیقت انسانی معاشرے کی کسی قسم کی اصلاح اس دعوت کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ معاشرے کی وحدت، ہمکاری، تعاون، ایثار اور فداکاری سب ایسے امور ہیں جو توحید معبود کے سرچشمے سے سیراب ہوتے ہیں، ربی بات شرک کی تو وہ ہر قسم کی پراگندگی، انتشار، تضاد، اختلاف، خود غرضی، خود پرستی اور انحصار طلبی کا سرچشمہ ہے اور ان مفاہیم کا شرک و بت پرستی کے وسیع مفہوم سے تعلق کوئی پوشیدہ نہیں ہے۔

جو شخص خود محور اور خود غرض غرض ہو وہ صرف اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور اسی بنا پر وہ مشرک ہے، توحید ایک شخص کے قطرہ وجود کو معاشرے کے وسیع سمندر میں شامل کر دیتی ہے، موحد ایک عظیم وحدت کے سوا کچھ نہیں دیکھتا یعنی وہ سارے انسانوں اور بندگان خدا کو ایک معاشرے کی صورت میں دیکھتا ہے۔ جو برتری کے خوابشمن ہیں وہ شرک کی ایک اور قسم سے وابستہ ہیں، اسی طرح جو ہمیشہ اپنے ہم نوع افراد سے جنگ کرتے رہتے ہیں اور اپنے مفادات کو دوسرے کے فائدے سے جدا سمجھتے ہیں تو یہ دوگانگی یا چند گانگی سوائے شرک کے مختلف چہروں کے اور کچھ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اپنے وسیع اصلاحی پروگراموں کو سب انبیاء نے یہیں سے شروع کیا، ان کی پہلی دعوت توحید تھی۔ توحید یعنی توحید معبود پھر توحید کلمہ، توحید عمل اور توحید معاشرہ۔

۲۔ سچے رہبر اپنے پیروکاروں سے جزا نہیں چاہتے

ایک حقیقی پیشوا اور رہبر اس صورت میں ہر قسم کے اتہام سے بچ کر انتہائی آزادی سے اپنے مسلک پر کار بند رہ سکتا ہے، اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے اور اپنے پیروکاروں کی ہر قسم کی کجروی کی اصلاح کر سکتا ہے جب وہ ان سے کوئی مادی وابستگی اور احتیاج نہ رکھتا ہو ورنہ وہی احتیاج ان کے دست و پا کی زنجیر بن جائے گی اور اس کی زبان و فکر کی بندش کا سامان ہوجائے گا، منحرف اور کج رو لوگ اسی طریقے سے اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے، مادی امداد منقطع کرنے کی دھمکی دےں گے یا امداد بڑھانے کی پیش کش کریں گے، کوئی رہبر کتنا ہی صاف دل اور مخلص کیوں نہ ہو پھر بھی انسان ہوتا ہے، اور ہوسکتا ہے اس مرحلہ پر اس کے قدم ڈگمگائیں۔

اسی بنا پر مندرجہ بالا آیات اور قرآن کی دیگر آیات میں ہے کہ انبیاء اپنی دعوت کی ابتدا میں صراحت سے اعلان کرتے اور بتاتے تھے کہ وہ مادی احتیاج اور اجر کی توقع اپنے پیروکاروں سے نہیں رکھتے، انبیاء کا یہ کردار تمام رہبروں کے لئے نمونہ اور ماڈل ہے خصوصاً روحانی اور مذہبی رہبروں اور رہنماؤں کے لئے۔

البتہ چونکہ وہ اپنا تمام وقت اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں صرف کرتے ہیں لہذا ان کی ضروریات صحیح طریقے پر پوری ہونا چاہئیں، امدادی وسائل اور اسلامی بیت المال ایسی افراد کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مہیا کیا گیا ہے اور بیت المال کی تشکیل کا ایک فلسفہ اور وجہ یہی ہے -

۳۔ گناہ معاشرے کی تباہی

مندرجہ بالا آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں روحانی اور مادی مسائل میں ایک واضح تعلق موجود ہے، یہاں گناہ سے استغفار، خدا کی طرف رجوع اور توبہ کو آبادی، خوشی، شادابی اور قوت میں اضافے کے ذریعے کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے -

یہ حقیقت قرآن کی اور بہت سی آیات میں بھی نظر آتی ہیں، منجملہ ان کے سورہ نوح میں اس عظیم پیغمبر کی زبانی فرمایا گیا ہے:

قُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلُ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَيَبْنِيَنَّ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا.

ان سے میں نے کہا اپنے گناہوں سے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں استغفار کرو کہ وہ بخشنے والا ہے تاکہ وہ پے در پے تم پر آسمان سے بارش برسائے اور مال و اولاد کے ذریعے تمہاری مدد کرے اور تمہارے لئے باغات اور نہریں مہیا کرے - (نوح: ۱۰-۱۲)

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں ہے کہ :

ربیع بن صبیح کہتا ہے کہ میں حسن (علیہ السلام) کے پاس تھا، ایک شخص دروازے سے داخل ہوا، اس نے اپنی آبادی کی خشک سالی کی شکایت کی، حسن (علیہ السلام) نے اس سے کہا: استغفار کرو دوسرا آیا اس نے فقر وفاقہ کی شکایت کی، اس سے بھی کہا: استغفار کرو، تیسرا آیا، اس نے کہا: دعا کریں خدا مجھے بیٹا عطا کرے، اس بھی کہا: استغفار کرو، ربیع کہتا ہے کہ میں (تعجب کیا اور) اس سے کہا: جو شخص آپ کے پاس آتا ہے اور وہ کوئی مشکل پیش کرتا ہے اور نعمت کا تقاضا کرتا ہے اسے یہی حکم دینے جارہے ہو اور سب سے کہتے ہو کہ استغفار کرو اور خدا سے بخشش طلب کرو، اس نے میرے جواب میں کہا: جو کچھ میں نے کہا ہے اپنی طرف سے نہیں کہا، میں یہ مطلب کلام خدا سے لیا ہے اور یہ وہی بات ہے جو وہ اپنے پیغمبر نوح سے کہتا ہے، اس کے بعد انہوں نے سورہ نوح کی ان (مذکورہ) آیات کی تلاوت کی -

جن لوگوں کی عادت ہے وہ ایسے مسائل کو معمولی سمجھتے ہوئے گزر جاتے ہیں وہ ان امور میں موجود ایک روحانی تعلق جانے بغیر ان کے قائل ہوجاتے ہیں اور مزید کوئی تجربہ و تحلیل نہیں کرتے لیکن اگر زیادہ غور و فکر سے کام لیا جائے تو ہمیں ان امور کے درمیان تربیتی رشتے نظر آئیں گے جن کی طرف توجہ کرنے سے مادی اور روحانی مسائل کو آپس میں اس طرح مالا یا جاسکتا ہے جیسے ایک کپڑے کے ریشے آپس میں ملے ہوتے ہیں یا جیسے کسی درخت کی جڑ تناور پھل پھول آپس میں مربوط ہوتے ہیں -

کونسا ایسا معاشرہ ہے جو گناہ، خیانت، نفاق، چوری، ظلم اور تن پروری سے آلودہ ہو اور پھر بھی وہ آباد اور پربرکت رہے -

کونسا معاشرہ ہے جو تعاون و ہمکاری کی روح گنوا بیٹھے جنگ، نزاع اور خونریزی اس کی جگہ لے لے اور پھر بھی اس کی زمینیں سرسبز و شاداب ہوں اور وہ اقتصادی طور پر خوشحال ہو -

کونسا معاشرہ ہے جس کے لوگ طرح طرح کی ہوا و بوس میں آلودہ ہوں پھر بھی وہ طاقتور ہو اور دشمن کے مقابلے میں پامردی سے کھڑا ہوسکے -

صراحت سے کہنا چاہئے کہ کوئی ایسا اخلاقی مسئلہ نہیں مگر یہ کہ وہ لوگوں کی مادی زندگی پر مفید اور اصلاحی اثر کرے، اسی طرح کوئی صحیح اعتقاد اور ایمان ایسا نہیں کہ جو معاشرے کو آباد، آزاد، بااستقلال اور طاقتور بنانے میں موثر ہو -

جو لوگ اخلاقی مسائل، مذہبی عقیدہ اور توحید پر ایمان کو مادی مسائل سے جدا کر کے دیکھتے ہیں انہوں نے نہ معنوی اور روحانی مسائل کو اچھی طرح سے پہچانا ہے اور نہ مادی مسائل کو، اگر دین لوگوں میں تکلفات اور تشریفات، ظاہری آداب اور مفہوم و معنی سے خالی شکل میں ہو تو واضح ہے کہ معاشرے کے مادی نظام میں اس کی کوئی تاثیر نہیں ہوگی، لیکن اگر روحانی اعتقادات روح انسانی کی عمیق گہروٹیوں میں اس طرح سے اتر جائے کہ اس کے اثرات ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، زبان اور جسم کے تمام ذرات میں ظاہر ہوں تو ان اعتقاد کے معاشرے پر اصلاحی آثار کسی سے مخفی نہیں رہیں گے -

ہوسکتا ہے مادی برکات کے نزول سے استغفار کے تعلق کے بعض مراحل میں ہم صحیح طور پر نہ سمجھ سکیں لیکن اس

میں شک نہیں کہ اس کے بہت سے حصے ہمارے لئے قابل فہم ہیں -  
دور حاضر میں ہمارے اسلامی ممالک ایران کے اسلامی انقلاب میں ہم نے اچھی طرح مشاہدہ کیا ہے کہ اسلامی اعتقادات اور اخلاقی اور روحانی قوت کس طرح دور حاضر کی طاقتور ترین اسلحہ، طاقتور افواج اور استعماری سپر طاقتوں پر کامیاب ہوگی یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ دینی عقائد اور مثبت روحانی اخلاق کس حد تک اجتماعی اور سیاسی مسائل میں کارگر ہیں -

۴۔ ”یزدکم قوۃ الٰہی قوتکم“ سے کیا مراد ہے؟

اس جملے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ خداوند عالم توبہ اور استغفار کے نتیجے میں تمہاری قوت میں قوت کا اضافہ کرے گا -

بعض نے اس جملے کو انسانی قوت میں اضافے کی طرف اشارہ سمجھا ہے (جیسا کہ سورہ نوح کی آیات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے) -

بعض نے معنوی طاقت میں مادی طاقت کے اضافے کی طرف اشارہ سمجھا ہے -  
لیکن آیت کی تعبیر مطلق ہے اور ہر قسم کی مادی اور معنوی طاقت میں اضافے کا مفہوم اس میں شامل ہے اور اس میں ان تمام تفاسیر کا مفہوم موجود ہے -

#### تفسیر نمونہ جلد 09

۵۳ قَالُوا يَا هُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِبَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ۔  
۵۴ اِنْ نَقُولُ اِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوْءٍ قَالَ اِنِّيْ اَشْهَدُ اللّٰهَ وَاَشْهَدُوْا اَنِّيْۤ اَبْرِيْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۔  
۵۵ مِنْ دُوْنِهِ فِكْيُوْدِيْنَ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنظَرُوْنَ۔  
۵۶ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اَخَذُ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلِيٌّ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔  
۵۷ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اُبْلَغْتُكُمْ مَا اُرْسَلْتُ بِهٖ اِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَہٗ شَيْئًا اِنَّ رَبِّيْ عَلِيٌّ كُلُّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ۔

ترجمہ

۵۳۔ انہوں نے کہا: اے ہود! تو ہمارے لئے کوئی دلیل نہیں لایا، ہم اپنے خداؤں کو تیری بات پر نہیں چھوڑتے اور ہم (بالکل) تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے -

۵۴۔ ہم (تیرے بارے میں) صرف یہ کہتے ہیں ہمارے بعض خداؤں نے تجھے نقصان پہنچایا ہے (اور تیری عقل چھین لی ہے)، (ہود نے) کہا: میں خدا کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جنہیں تم (خدا کا) شریک قرار دیتے ہو ان سے بیزار ہوں -

۵۵۔ وہ جو اس (خدا) کے علاوہ ہیں (کہ جنہیں تم سوچتے ہو) اب جب کہ ایسا ہے تو تم سب مل کر میرے خلاف سازش کرو (لیکن جان لو کہ تم سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا)

۵۶۔ (کیونکہ) میں نے اللہ پر توکل کر لیا ہے جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے کوئی چلنے پھرنے والا ایسا نہیں جس پر وہ تسلط نہیں رکھتا (لیکن ایسا تسلط جو عدالت پر مبنی ہے کیونکہ) میرا پروردگار صراطِ مستقیم پر ہے -

۵۷۔ اور اگر تم منہ موڈ لو تو جو پیغام میرے ذمہ تھا وہ میں نے تم تک پہنچا دیا ہے اور خدا دوسرے گروہ کو تمہارا جانشین کر دے گا اور تم اسے ذرہ بھر نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے، میرا پروردگار وہ چیز کا محافظ اور نگہبان ہے -

حضرت بود (علیہ السلام) کی قوی منطق

اب دیکھتے ہیں کہ اس سرکش اور مغرور قوم نے، یعنی قوم عاد نے اپنے بھائی بود، ان کے پند و نصائح اور ہدایت و رہنمائی کے مقابلہ میں کیا رد عمل ظاہر کیا۔

”انہوں نے کہا: اے ہود! تو ہمارے لئے کوئی وضوح دلیل نہیں لائے“ (قَالُوا يَا هُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ) ، ہر گز تیری باتوں پر اپنے بتوں اور خداؤں کا دامن نہیں چھوڑے گے ( وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ ) اور ہم ہر گز تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے ( وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ) ۔

ان تین غیر منطقی جملوں کے بعد انہوں نے مزید کہا: ”ہمارا خیال ہے کہ تو دے وانیہ ہو گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ تو ہمارے خداؤں کے غضب کا شکار ہوا ہے اور انہوں نے تیری عقل کو آسیب پہنچایا ہے“ ( إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ) ۔

اس میں شک نہیں کہ جیسے تمام انبیاء کا طریقہ کار ہوتا ہے اور ان کی ذمہ داری ہے حضرت ہود نے انہیں اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے کئی ایک معجزے دیکھائے ہوئے تھے، لیکن انہوں نے اپنے کبر و غرور کی وجہ سے دیکر ہٹ دھرم قوموں کی طرح معجزات کا انکار کیا اور انہیں جادو قرار دیا اور انہیں اتفاقی حوادث گردانا کی جنہیں کسی معاملے میں دلیل قرار نہیں دے جا سکتا ۔

ان باتوں سے قطع نظر بت پرستی کی نفی کے لئے تو کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور جو شخص بھی تھوڑی سی عقل شعور رکھتا ہو اور اپنے آپ کو تعصب سے دور کر لے تو وہ اچھی طرح سے اس کا بطلان سمجھ سکتا ہے، فرض کریں کہ اس کے لئے دلیل کی ضرورت ہے تو کیا یہ مسئلہ منطقی و عقلی دلائل کے علاوہ کسی معجزہ کا بھی محتاج ہے ۔

دوسرے لفظوں میں جو کچھ حضرت ہود (علیہ السلام) کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں آیا ہے وہ خدائے یگانہ کی طرف دعوت، اس کی طرف بازگشت، بگناہوں سے استغفار اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کی نفی ہے، یہ سب ایسے مسائل ہیں جنہیں عقلی دلیل سے بالکل ثابت کیا جا سکتا ہے ۔

لہذا اگرچہ ”بینۃ“ سے نفی سے ان کی مراد عقلی دلیل کی نفی تھی، بہر حال انہوں نے یہ جو کہا تھا کہ ہم برگز تیری باتوں کی وجہ سے اپنے بتوں کو فراموش نہیں کریں گے ان کی ہٹ دھرمی کی بہترین دلیل ہے کیونکہ عقل مند اور حق جو انسان حق کی بات کسی کی طرف سے ہو اسے قبول کر لیتا ہے، خصوصاً یہ جملہ کہ انہوں نے حضرت ہود (علیہ السلام) کو ”جنون“ کہ تہمت لگائی ۔ اور ”جنون“ بھی وہ جو ان کے زعم میں ان کے خداؤں کے غضب کا نتیجہ تھا، ان کے بیہودہ پن اور خرافات پرستی کی خود ایک بہترین دلیل ہے ۔

بے جان اور بے شعور پتھر اور لکڑیاں جو خود اپنے ”بندوں“ کی مدد کی محتاج ہیں وہ ایک عقلمند انسان سے کس طرح اس کا عقل و شعور چھین سکتی ہے ۔

علاوہ ازیں ان کے پاس ہود (علیہ السلام) کے دیوانہ ہونے کی کونسی دلیل تھی، سوائے اس کے کہ انہوں نے ان کی سنت شکنی کی اور ان کے ماحول کے بیہودہ رسم و رواج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، اگر یہ دیوانگی کی دلیل ہے تو پھر تمام مصلحین جہان اور انقلابی لوگ جو غلطیوں اور طریقوں کے خلاف قیام کرتے ہیں سب دیوانے ہونے چاہیں ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، گزشتہ سور اور آج کی تاریخ نیک اندیش اور بدعت شکن مردوں اور عورتوں کی طرف یہ نسبت دئے جانے سے بھری پڑی ہے، کیونکہ وہ خرافات اور استعمار اور اس کے ہتھکنڈوں اور شکنجوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ۔

بہر حال حضرت ہود (علیہ السلام) کی ذمہ دارہ تھی کہ اس گمراہ اور ہٹ دھرم قوم کو دندان شکن جواب دیتے، ایسا جواب جو منطق کی بنیاد پر بھی ہوتا اور طاقت سے بھی ادا ہوتا، قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے ان کے جواب میں چند جملے کہے: ”مِنْ خَدَا كُوْا بِى كُوَابِى كَلْ لَّ بَلَا تَا هُوْا وَاوْر تَم سَب بْهِي كُوَاه رِبُو كَه مِيْن اَنْ بَتُوْا وَاوْر تَم هَارِے خَدَاُوْا سَه بِيْزَار هُوْا“ ( قَالَ اِنِّيْ اَشْهَدُ اللّٰهَ وَاَشْهَدُوْا اَنِّيْ بَرِيْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ مَن دُوْنَه )، یہ اس طرف اشارہ تھا کہ اگر یہ بت طاقت رکھتے ہیں تو ان سے کہو کہ مجھے ختم کر دیں، میں جو ان کے خلاف علی الاعلان جنگ کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہوں اور یہ اعلانیہ ان سے بیزار ہوں اور تنفر کا اعلان کر رہا ہوں تو وہ کیوں خاموش اور معطل ہیں، کس چیز کے منتظر ہیں اور کیوں مجھے نابود اور ختم نہیں کرتے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا کہ نہ فقط یہ کہ ان سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ تم بھی اتنی کثرت کے باوجود کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے ”اگر سچ کہتے ہو تو تم سب ہاتھوں میں ہاتھ دے کر میرے خلاف جو سازش کر سکتے ہو کر گزرو اور مجھے لمحہ بھر کی بھی مہلت نہ دو“ ( فَكَيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُوْنَ ) ۔

میں تمہاری اتنی کثیر تعداد کو کیوں کچھ نہیں سمجھتا اور کیوں تمہاری طاقت کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، تم کہ جو میرے خون کے پیاسے ہو اور ہر قسم کی طاقت رکھتے ہو، اس لئے کہ میرا رکھو الا اللہ ہے، وہ کہ جس کی قدرت سب طاقتوں سے بالاتر ہے، ”میں نے خدا پر توکل کیا ہے جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے“ ( اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلٰى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ) ۔

یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ، یہ اس امر کی نشانی ہے کہ میں نے دل کسی اور جگہ نہیں باندھ رکھا، اگر صحیح طور پر سوچو تو یہ خود ایک قسم کا معجزہ ہے کہ ایک انسان تن و تنہا بہت سے لوگوں کے بیہودہ عقائد کے خلاف اٹھ کھڑا ہو جب کہ وہ طاقتور اور متعصب بھی ہوں یہاں تک کہ انہیں اپنے خلاف قیام کی تحریک کرے اس کے باوجود اس میں خوف و خطر کے کوئی آثار نظر نہ آئیں اور پھر نہ اس کے دشمن اس کے خلاف کچھ کر سکتے ہوں۔ پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ نہ صرف تم بلکہ ”عالم وجود میں کوئی چلنے پھرنے والا نہیں کہ جو خدا کے قبضہ قدرت اور فرمان کے ماتحت نہ ہو“ اور جب تک وہ نہ چاہے ان سے کچھ نہیں ہو سکتا (مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا)۔

لیکن یہ بھی جان لو کہ میرے خدا کی قدرت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کود سری اور خود خوابی کہ بنیاد پر عمل میں آئے اور وہ اسے غیر حق صرف کرے بلکہ ”میرا پروردگار ہمیشہ صراطِ مستقیم اور جادہ عدل پر ہے“ اور وہ کوئی کام حکمت کے برخلاف انجام نہیں دیتا (إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ)۔

دو اہم نکات

### ۱۔ ”ناصیۃ“ کا مفہوم

”ناصیۃ“ اصل میں سر کے اگلے حصے کے بالوں کے معنی میں ہے اور ”نصا“ (بروزن ”نصر“) کے مادہ سے اتصال اور پیوستگی کے مفہوم میں آیا ہے، ”اخذ ناصیۃ“ (سر کے اگلے حصے کے بال پکڑنا) کسی چیز پر تسلط اور قہر و غلبہ کے لئے کنایہ ہے، یہ جو مذکورہ آیت میں خدا فرماتا ہے کہ ”کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر یہ کہ ہم اس کی ”ناصیۃ“ پکڑ لیتے ہیں“ ہر چیز پر اس کی قدرت قاہرہ کا اشارہ ہے یعنی کوئی موجود اس کے ارادے کے سامنے ٹھہرنے کی تاب نہیں رکھتا کیونکہ عام طور پر جب کسی انسان یا حیوان کے سر کے اگلے بالوں کو پکڑ لیا جائے تو اس میں مقابلے کی طاقت نہیں رہتی۔

یہ تعبیر اس لئے ہے کہ مغرور مستکبرین، خود پسند بت پرست اور ظالم حکومت کے خواہاں یہ نہ سوچیں کہ اگر چند دن کے لئے انہیں موقع مل گیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ پروردگار کے خلاف کچھ قیام کرنے لگیں، انہیں اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور مرکب غرور سے نیچے اترنا چاہیئے۔

### ۲۔ ”ان ربی علیٰ صراطِ مستقیم“ کا مطلب

یہ جملہ نہایت خوبصورت ہے اور خدا کی ایسی قدرت جو عدالت امیز ہے اس کے بارے میں یہ زیبا ترین تعبیرات میں سے ہے کیونکہ عموماً طاقتور جھوٹے اور ظالم ہوتے ہیں لیکن اللہ اپنی بے انتہا قدرت کے باوجود ہمیشہ عدالت کی صراطِ مستقیم پر ہے، اس کا راستہ ہمیشہ حکمت، نظم اور حساب و کتاب کا صاف و شفاف راستہ ہے۔

اس نکتہ کو بھی نگاہ سے دور نہیں رہنا چاہیئے کہ حضرت ہود (علیہ السلام) کی باتیں مشرکین کے سامنے یہ حقیقت بیان کر رہی تھیں کہ ہٹ دھرم دشمن جس قدر اپنی ہٹ دھرمی میں اضافہ کریں ایک حقیقی رہبر کو چاہیئے کہ وہ اپنی استقامت و پامردی میں اتنا ہی اضافہ کرے، قوم نے حضرت ہود (علیہ السلام) کو بتوں سے بہت زیادہ خانف کرنے کی کوشش کی تھی لہذا انہوں نے بھی اس کے مقابلے میں انہیں شدید ترین طریقے سے خدا کی قدرت قاہرہ سے ڈرایا۔ آخر کا حضرت ہود (علیہ السلام) ان سے کہتے ہیں: اگر تم راہ حق سے روگردانی کرو گے تو اس میں مجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچادیا ہے (فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ)، یہ جو اس طرف اشارہ ہے کہ گمان نہ کرو کہ اگر میری دعوت قبول نہ کی جائے تو میرے لئے کوئی شکست ہے، میں نے اپنا فریضہ انجام دے دیا ہے اور فریضے کی انجام دہی کامیابی ہے اگرچہ میری دعوت قبول نہ کی جائے۔

دراصل یہ سچے رہبروں اور راہ حق کے پیشواؤں کے لئے ایک درس ہے کہ انہیں اپنے کام پر کبھی بھی خستگی و پریشانی کا احساس نہیں ہونا چاہیئے چاہے لوگ ان کی دعوت قبول نہ کریں۔

جیسا کہ بت پرستوں نے آپ کو دھمکی دی تھی، اس کے بعد آپ انہیں شدید طریقے سے عذاب الہی کی دھمکی دیتے ہوئے کہتے ہیں: اگر تم نے دعوت حق قبول نہ کی تو خدا عنقریب تمہیں نابود کر دے گا اور کسی دوسرے گروہ کو تمہارا جانشین بنا دے گا اور تم اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے (وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا)۔

یہ قانون خلقت ہے کہ جس وقت لوگ نعمت ہدایت یا خدا کی دوسری نعمتیں قبول کرنے کے اہل نہ ہوں تو وہ انہیں اٹھا لیتا



ہے اور ان کی جگہ کسی دوسرے اہل گروہ کو لے آتا ہے۔  
 اور یہ بھی جان لو کہ میرا پروردگار ہر چیز کا محافظ ہے اور ہر حساب و کتاب کی نگہداری کرتا ہے ( اِنَّ رَبِّيْ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ خَفِيْظٌ )، نہ موقع اس کے ہاتھ سے جاتا ہے اور نہ وہ موقع کی مناسبت کو فراموش کرتا ہے، نہ وہ اپنے انبیاء اور دوستوں کو طاق نسیاں کرتا ہے اور نہ کسی شخص کا حساب و کتاب اس کے علم سے اوجھل ہوتا ہے بلکہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز پر مسلط ہے۔

۵۸ وَ لَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنَا هُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ  
 ۵۹ وَ تِلْكَ اَعَادٌ جَحْدُوْا بٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهُ وَ اتَّبَعُوْا اَمْرًا كَلْبًا جَبَّارٍ عَنِيْدٍ۔  
 ۶۰ وَ اتَّبَعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الْاِلٰهَ اَعَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ الْاَبْعَدُ لِعٰدٍ قَوْمٍ هُوْدٍ۔

ترجمہ

۵۸۔ اور جس وقت ہمارا فرمان آپہنچا تو ہود اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے انہیں اپنی رحمت سے ہم نے نجات دی اور عذاب شدید سے انہیں بچالیا۔  
 ۵۹۔ اور یہ قوم عاد ہی تھی کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر ستمگر، حق کے دشمن کے حکم کی پیروی کی۔  
 ۶۰۔ اس جہان میں ان کے پیچھے لعنت (اور رسوائی رہی) اور قیامت میں (کہا جائے گا کہ) جان لو کہ عاد نے اپنے پروردگار سے کفر و انکار کیا، دُور ہو عاد قوم ہود (خدا کی رحمت اور خیر و سعادت سے)

اس ظالم قوم پر۔ ابدی لعنت

قوم عاد اور ان کے پیغمبر حضرت ہود (علیہ السلام) کی سرکشت سے مربوط آیات کے آخری حصے میں ان سرکشوں کی، دردناک سزا اور عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن پہلے کہتا ہے: جب ان کے عذاب کے بارے میں ہمارا حکم آپہنچا تو ہود اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لاکے تھے ہماری ان پر رحمت اور لطف خاص نے انہیں نجات بخشی (وَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا)، پھر مزید تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے: اور ہم نے ان صاحب ایمان لوگوں کو شدید اور غلیظ عذاب سے رہائی بخشی ( وَنَجَّيْنَا هُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ )۔  
 یہ امر جاذب نظر ہے کہ بے ایمان، سرکش اور ظالم افراد کے لئے عذاب و سزا بیان کرنے سے پہلے صاحب ایمان قوم کی نجات کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ خیال پیدا نہ ہو جیسا کہ مشہور ضرب المثل ہے کہ عذاب الہی کے موقع پر خشک و تر سب جل جاتے ہیں کیونکہ وہ حکیم و عادل ہے اور محال ہے کہ وہ ایک بھی صاحب ایمان شخص کو بے ایمان اور گنہگار لوگوں کے درمیان عذاب کرے، بلکہ رحمت الہی ایسے افراد کو عذاب و سزا کے نفاذ سے پہلے ہی امن و امان کی جگہ پر منتقل کر دیتی ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ اس سے پہلے کی طوفان آنے حضرت نوح (علیہ السلام) کی کشتی تیار تھی اور اس سے پہلے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کے شہر تباہ و برباد ہوں حضرت لوط (علیہ السلام) اور آپ کے انصار راتونرات حکم الہی سے وہاں سے نکل آئے۔

اس سلسلے میں کہ لفظ ”نجینا“ کا اس جملے سے کیوں تکرار کیا گیا مختلف تفسیریں ہیں۔

بعض کا نظریہ ہے کہ پہلے مرحلے میں ”نجینا“ دنیاوی عذاب سے نجات پانے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے مرحلے میں آخرت کے عذاب کی طرف کہ جو ”غلیظ“ ہونے کی صفت سے بھی پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔  
 بعض دوسرے مفسرین نے ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ رحمت الہی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اگر فوراً لفظ عذاب کا تکرار ہوتا تو مناسب نہ تھا، رحمت کہاں اور عذاب غلیظ کہاں، لہذا ”نجینا“ کا تکرار ہوا تاکہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ ہو جائے اور عذاب کی شدت اور تاکید میں بھی کسی قسم کی کمی نہ آئے۔  
 اس نکتے کی طرف بھی توجہ رہنا چاہیے کہ آیات قرآن میں چار مواقع پر عذاب کے لئے ”غلیظ“ کی صفت استعمال کی گئی ہے (۱) ان آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب غلیظ کا ربط جہان آخرت کے ساتھ ہے، خصوصاً سورہ ابراہیم کی آیات جن میں عذاب غلیظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے صراحت سے دوزخیوں کی حالت بیان کر رہی ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ دنیاوی عذاب کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو پھر بھی عذاب آخرت کے مقابلے میں خفیف ہے کم اہمیت کا حامل ہے۔

یہ مناسبت بھی قابل ملاحظہ ہے کہ جیسا کہ انشاء اللہ سورہ قمر اور سورہ حاقہ میں آئے گا قوم عاد کے لوگ سخت اور بلند

قامت تھے، ان کے قدکو کھجور کے درختوں سے تشبیہ دی گئی ہے، اسی مناسبت سے ان کی عمارتیں مضبوط، بڑی اور اونچی تھیں یہاں تک کہ قبل اسلام کی تاریخ میں ہے کہ عرب بلند اور مضبوط عمارتوں کی نسبت قوم عادہی کی طرف دیتے ہوئے انہیں ”عادی“ کہتے تھے، اسی لئے ان پر آنے والا عذاب بھی انہی کی طرح غلیظ اور سخت تھا، جیسا کہ مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں آئے گا۔

اس کے بعد قوم عاد کے گناہوں کا خلاصہ تین امور میں بیان کیا گیا ہے:

پہلا: یہ کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور بٹ دھرمی کے ساتھ اپنے پیغمبر کی دعوت کے منکر ہو گئے جو کہ واضح دلیل اور مدرک تھا ( وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ )۔

دوسرا: یہ کہ وہ عملی لحاظ سے بھی انبیاء کے خلاف عصیان و سرکشی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ( وَعَصَوْا رَسُولَهُ )، یہاں ”رسل“ جمع کی صورت میں بیان ہوا ہے، ایسا یا تو اس بنا پر ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی حقیقت کی طرف تھی یعنی توحید اور اس کی شاخیں۔ لہذا ایک پیغمبر کا انکار تمام پیغمبروں کے انکار کے مترادف ہے، یا اس بنا پر کہ حضرت ہود (علیہ السلام) انہیں گزشتہ انبیاء پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے اور وہ انکار کرتے تھے۔ تیسرا: گناہ ان کا یہ تھا کہ وہ حکم خدا کو چھوڑ کر حق دشمن ظالموں کی اطاعت کرتے تھے ( وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ )۔ ترک ایمان، انبیاء کی مخالفت اور حق دشمن ظالموں کی پیروی سے بڑھ کر کونسا گناہ تھا۔

”جبار“ اس شخص کو کہتے ہیں جو غضب سے مارتا، قتل کرتا اور نابود کرتا ہے اور حکم عقل کا پیرو نہیں ہوتا، دوسرے لفظوں میں ”جبار“ اسے کہتے ہیں جو دسروں کو اپنی پیروی پر مجبور کرے یا جو اپنی بڑائی اور تکبر کے ذریعے اپنا عیب چھپانا چاہے، اور ”عنید“ وہ ہے جو حق و حقیقت کی بہت زیادہ مخالفت کرے اور کسی صورت میں حق کو قبول نہ کرے۔

یہ دو صفات ہر زمانے کے طاغوتوں اور متکبرین کی واضح صفات میں سے ہیں، کبھی بھی ان کے کان حق بات سننے کو تیار نہیں ہوتے اور اپنے مخالف سے قساوت، بے رحمی اور سختی سے پیش آتے ہیں اور اسے ختم کر دیتے ہیں۔ یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اگر جبار کا یہی معنی ہے تو پھر قرآن کی سورہ حشر آیہ ۲۳ میں اوج دیگر مصادر اسلامی میں خدا کی ایک صفت ”جبار“ کیوں ذکر ہوئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل لغت میں جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں ”جبار“ یا مادہ ”جبر“ سے قہر و غلبہ اور قدرت کے معنی میں ہے اور یا ”جبران“ کے مادہ سے کسی نقص کے برطرف کرنے کے معنی میں ہے۔ لیکن ”جبار“ چاہے پہلے معنی میں ہوا دوسرے معنی میں، دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے کٹھی مذمت کی صورت میں اور وہ اس موقع پر جب کوئی انسان اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرے، تکبر کے ذریعے اور غلط دعویٰ کر کے اپنے کمی اور نقائص کی تلافی کرنا چاہے یا اپنے خواہش سے دوسرے کو مقہور اور ذلیل کرنا چاہے، یہ معنی قرآن کی بہت سے آیات میں آیا ہے، کبھی اسے دیگر قابل مذمت صفات کے ہمراہ بیان کیا گیا ہے، مثلاً مندرجہ بالا آیت میں ”عنید“ کے ساتھ مل کر آیا ہے، سورہ مریم آیہ ۳۲ میں پیغمبر خدا حضرت عیسیٰ کی زبانی آئی ہے کہ:

وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا۔

اور خدا نے مجھے جبار اور شقی قرار نہیں دیا۔

یا بنی اسرائیل کے حالات میں بیت المقدس کے ظالم ساکنین کے بارے میں ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا:

ان فیہا قوماً جبارین۔

اس سرزمین پر ظالم اور ستم پیشہ قوم رہتی ہے (مائدہ: ۲۲)

کبھی لفظ ”جبار“ انہیں دونوں مادوں سے مدح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس حوالے سے ”جبار“ اسے کہا جاتا ہے جو لوگوں حاجات اور نقائص کی تلافی کرتا ہو، اسی طرح اس جو جو بڈیوں کو جوڑتا ہو یا یہ کہ اتنی چبے پناہ قدرت کا مالک ہو کہ اس کا گیر اس کے سامنے خاضع اور ذلیل ہو لیکن وہ کسی پر ظلم نہ کرنا چاہے یا اپنی قدرت سے استفادہ نہ کرنا چاہے، اسی بنا پر جب ”جبار“ اس معنی میں ہوتو دوسری صفات مدح ساتھ ہوتی ہے، جیسا کہ سورہ حشر کی آیہ ۲۳ میں ہے:

الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ السَّلَامِ الْمُؤْمِنِ الْمُهَيْمِنِ الْعَزِيزِ الْجَبَّارِ الْمُتَكَبِّرِ۔

وہ پاک و منزہ فرمانروا ہے کہ جس سے اس کے بندے کبھی ظلم نہیں دیکھتے اور نگہبان و محافظ ہے، ناقابل شکست ہے، قدرت مند ہے اور برتر ہے۔

واضح ہے کہ قدوس، سلام اور مومن جیسے صفات کبھی صورت ”جبار“ بمعنی ”ظالم“ اور ”متکبر“ بمعنی ”اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والا“ سے مناسبت نہیں رکھتیں، یہ عبارت اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ یہاں ”جبار“ دوسرے معنی

میں ہے -

بعض حضرات نے چونکہ ”جبار“ کے صرف کچھ مواقع استعمال نگاہ میں رکھے ہیں اور اس کے لغوی اور متعدد معانی پر غور نہیں کیا لہذا ان کا خیال یہ ہے کہ اس لفظ کا خدا کے لئے استعمال صحیح نہیں ہے (یہی صورت ان کے نزدیک لفظ ”متکبر“ کی ہے) لیکن اس کے اصلی لغوی مفہوم کو نظر میں رکھنے سے اعتراض برطرف ہوجاتا ہے (2)

زیر بحث آخری آیت جہاں حضرت ہود (علیہ السلام) اور قوم عاد کی داستان ختم ہو رہی ہے ان کے برے اور نادرست اعمال کا نتیجہ یوں بیان کیا گیا ہے: وہ ان کے اعمال کی وجہ سے اس دنیا میں ان پر لعنت و نفرین ہوئی اور ان کے مرنے کے بعد ان کے برے نام اور رسوا کن تاریخ کے سوا ان کی کوئی چیز باقی نہ رہی ( وَأُتْبِعُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً )، اور قیامت کے دن کہا جائے گا کہ جان لو! قوم عاد نے اپنے پروردگار کا انکار کیا تھا ( وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ )، دور ہوجا عاد قوم ہود رحمت پروردگار سے ( أَلَا يُعَذِّبُ لِعَادِ قَوْمِ هُودٍ )۔

باوجود یکہ لفظ ”عاد“ اس قوم کے تعارف کے لئے کافی ہے لیکن مندرجہ بالا آیت میں عاد کے ذکر کے بعد ”قوم ہود“ کے الفاظ بھی آئے ہیں جن سے تاکید بھی ظاہر ہوتی ہے اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دلسوز پیغمبر حضرت ہود (علیہ السلام) کو یہ سب تکلیفیں پہنچائیں، انہیں تہمتیں دیں اور اسی بنا پر رحمت الہی سے دور ہیں -

.....

۱۔ سورہ ابراہیم: ۱۷، لقمان: ۲۴، اور فصلت: ۵۰۔

2۔ کتاب تاج العروس از زبیدی اور مفردات از راغب، اور تفسیر مجمع البیان اور تفسیر المنار کا زیر بحث آیات اور سورہ حشر کی آخری آیات کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں ۔

۱۔ قوم عاد تاریخ کی نگاہ میں

بعض مغربی مورخین جن میں اسپرینگل بھی شامل ہے نے کوشش کی ہے کہ قوم عاد کا تاریخی طور پر انکار ہی کر دیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آثار اسلامی کے علاوہ اس کا کہیں ذکر نہیں اور انہیں کتب عہد قدیم (تورات وغیرہ) میں اس کا نام و نشان نہیں ملا، لیکن ایسے ماخذ موجود ہیں جو نشانہ دہی کرتے ہیں کہ قصہ عاد عرب کے زمانہ جاہلیت میں مشہور تھا اور قبل اسلام کے شعراء نے قوم ہود کے بارے میں گفتگو کی ہے، یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بلند اور مضبوط عمارتوں کی نسبت ”عاد“ کی طرف دیتے ہوئے انہیں ”عادی“ کہتے تھے -

بعض مورخین کا خیال ہے کہ لفظ ”عاد“ کا اطلاق دو قبیلوں پر ہوتا ہے، ایک قبیلہ کا تعلق تاریخ سے ہے، یہ جزیرہ عربستان میں زندگی گزارتا تھا، یہ قبیلہ ختم ہو گیا اور اس کے آثار بھی مٹ گئے، تاریخ بشر میں ان کی زندگی کے چند ناقابل اطمینان افسانوں کے اور کوئی چیز محفوظ نہیں، ان مورخین نے قرآن میں سورہ نجم آیہ ۵۰ کی تعبیر ”عاد الاولیٰ“ کو اسی طرف اشارہ سمجھا ہے -

رہے وہ لوگ جن کا تعلق تاریخ انسانی کے دور سے ہے تو احتمال یہ ہے کہ وہ میلاد مسیح سے کوئی ۷۰۰ سال قبل یا اس سے بھی پہلے تھے، اس قوم کو بھی عاد کہتے تھے، یہ قوم سرزمین احقاف یا یمن میں رہتی تھی، یہ طویل القامت، قوی جسم اور طاقتور لوگ تھے، اسی وجہ سے وہ بڑے جنگجو سمجھے جاتے تھے -

علاوہ ازیں ان لوگوں نے تمدن و ثقافت میں بہت ترقی کی، یہ لوگ آباد شہروں، سرسبز زمینوں اور شاداب باغات کے مالک تھے، جیسا کہ قرآن ان کی توصیف میں کہتا ہے:

التي لم يخلق مثلها في البلاد۔

ان کی نظیر دنیا کے دیگر شہروں میں پیدا نہیں ہوئی تھی - (فجر: ۸)

اسی بنا پر بعض مستشرقین نے کہا ہے کہ قوم عاد بربوت کے علاقہ میں زندگی بسرتی تھی (یہ علاقہ حضر موت یمن کے نواح میں ہے) اور آتش نشانیوں کی وجہ سے ان میں سے بہت سے لوگ ختم ہو گئے اور باقی ادھر ادھر منتشر ہو گئے - بہر حال یہ قوم ایک عرصہ تک ناز و نعمت میں زندگی بسر کرتی رہی لیکن جیسا کہ زیادہ تر ناز و نعمت میں پلنے والے لوگوں کا شیوہ ہے، وہ غرور غفلت میں مست ہو گئے اور دوسروں پر ظلم و ستم ڈھا کر اور استعماری ہتھکنڈے اختیار کر کے انہوں نے اپنی طاقت سے غلط فائدہ اٹھایا، مستکبرین اور جبارین عنید کو انہوں نے اپنا پیشوا بنایا، دین بت پرستی کو رائج کیا اور اپنے پیغمبر ہود (علیہ السلام) کی پند و نصیحت اور ان کے نظریات و افکار واضح کرنے اور ان کے لئے کی گئی اتمام حجت کی سعی و کاوش کو انہوں نے نہ صرف ذرہ بھر کوئی حیثیت نہ دی بلکہ اس عظیم مرد حق طلب

کیا آواز خاموش کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کبھی انہیں دیوانگی اور حماقت سے نسبت دی اور کبھی اپنے خداؤں کے غضب سے انہیں ڈرایا لیکن آپ پہاڑ کی طرح اس مغرور اور طاقتور قوم کے مقابلے میں ڈٹے رہے، آخر کار تقریباً چار ہزار افراد کو آپ نے پاکباز بنایا اور انہیں اپنے دین حق کی طرف لے آئے لیکن دوسرے لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور عناد پر باقی رہے۔

جیسا کہ سورہ ذارعات، حاقہ اور قمر میں آئے گا، آخر کار بہت شدید اور تباہ کن طوفان سات راتیں اور چھ دن ان پر مسلط رہا، اس طوفان نے ان کے محلات برباد کر دیے اور ان کی لاشیں خزانکے پتوں کی طرح ہوا کی تیز لہروں نے ادھر ادھر بکھیر دیں، سچے مومنین کو پہلے ہی وہاں سے نکال لیا گیا تھا، خدائے تعالیٰ نے انہیں نجات دی اور ان کی زندگی تمام جابروں اور خودسروں کے لئے ایک عظیم درس عبرت قرار پائی۔ (1)

۲۔ قوم عاد پر ابدی لعنت

یہ تعبیر اور ایسی دیگر تعبیرات مختلف اقوام کے لئے قرآن کی کئی ایک آیات میں آئی ہیں، ان اقوام کے کچھ حالات بیان فرما کر اس طرح سے فرمایا گیا ہے مثلاً:

الْأَبْعَدَا لِيُؤْمِدَ (بود: ۶۸)

الْأَبْعَدَا لِمَدِينٍ كَمَا بَعْدَتْ تَمُودُ (بود: ۹۵)

فَبَعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ (مومنون: ۴۱)

فَبَعْدًا لِقَوْمٍ لَّيُؤْمِنُونَ۔ (مومنون: ۲۴)

اور اسی طرح حضرت نوح (علیہ السلام) کی داستان میں ان کی قوم کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں:

وَقِيلَ بَعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (بود: ۴۴)

ان تمام آیات میں نفیرین ایک طرح سے رحمت خدا سے دوری کی علامت ہے، ان لوگوں کے لئے جنہوں نے بہت بڑے بڑے گناہ انجام دیے ہیں۔

آج بھی بالکل اسی طرح سرکش، استعمارگر، ستم پیشہ افراد اور گروہوں کے خلاف نعرے لگائے جاتے ہیں البتہ یہ قرآنی شعار اس قدر موثر اور جامع ہے کہ جو صرف ایک پہلو کے حامل نہیں ہے کیونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ ”فلان گروہ دور ہو“ تو اس کی رحمت الہی سے دوری بھی شامل ہے، سعادت سے دوری بھی، ہر قسم کی خیر و برکت اور نعمت سے دوری بھی اور بندگان خدا سے دوری بھی، البتہ ان کا خیر و سعادت سے دور ہونا رد عمل ہے ان کے خدا اور خلق خدا سے روحانی، فکری اور عملی طور پر اندرونی اعتبار سے دور ہونے کا، کیونکہ ہر قسم کا نظریہ اور عمل موت کے بعد دوسرے گھر میں اور دوسرے جہان میں اپنا عکس رکھتا ہے جو بالکل اس کے مشابہ ہے، اس بنا پر اس جہان کی دوریاں آخرت میں خدا کی رحمت، عفو، بخشش اور نعمات سے دوری کا سرچشمہ ہے۔ (2)

.....

1۔ تفسیر المیزان، تفسیر مجمع البیان اور کتاب اعلام القرآن۔

2۔ مندرجہ بالا آیت میں لفظ ”بعدا“ ترکیب نحوی کے اعتبار سے جملہ ”ابعدہم اللہ“ کا مفعول مطلق ہے اور یہ جملہ مقدر ہے، البتہ قاعدتا ”بعدا“ کی بجائے ”ابعدا“ ہونا چاہیے کیونکہ ”ابعد“ کا مصدر ”ابعدا“ ہے لیکن بعض اوقات مفعول مطلق ذکر کرتے وقت باب افعال کے مصدر کی بجائے ثلاثی مجرد لے آتے ہیں مثلاً:-  
واللہ انبتکم من الارض نباتاً (غور کیجنے گا)

تفسیر نمونہ جلد 09

۶۱ وَ اِلٰی تَمُوْدَ اٰخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تَوْبُوا

إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُجِيبٌ.

ترجمہ

۶۱۔ قوم (قوم) ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا، اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی پرستش کرو کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس کی آباد کاری تمہارے سپرد کی، اس سے بخشش طلب کرو، پھر اس کی طرف توبہ کرو اور رجوع کرو کہ میرا پروردگار (اپنے بندوں کے) نزدیک اور (ان کے تقاضوں کو) قبول کرنے والا ہے۔

قوم ثمود کی داستان شروع ہوتی ہے

قوم عاد کے حالات اپنے تمام تر عبرت انگیز درس کے ساتھ بطور اختصار تمام ہوئے، اب قوم ثمود کی باری ہے، تواریخ کے مطابق یہ قوم مدینہ اور شام کے درمیان وادی القریٰ میں رہتی تھی، یہاں ہم پھر دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید جب ان پیغمبر حضرت صالح (علیہ السلام) کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو انہیں ”بھائی“ کے طور پر یاد کرتا ہے، یہ کتنی عمدہ، موثر اور خوبصورت تعبیر ہے، اس کے بعض مطالب ہم نے گزشتہ آیات کے ذیل میں اشارہ کیا ہے، درد دل رکھنے والا مہربان بھائی کہ جو خیر خواہی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، ”ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا“ (وَالِیٰ ثَمُوْدَ اٰخَاهُمْ صَالِحًا)۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت صالح (علیہ السلام) کا اصولی لائحہ عمل بھی دیگر انبیاء جیسا ہے، وہ لائحہ عمل جس کا آغاز توحید سے اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کی نفی سے ہوتا ہے، وہ شرک اور بت پرستی جو انسان کی تمام مشکلات کا خمیر ہے۔

اس نے کہا: اے میری قوم! خدا کی پرستش کرو کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں (قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ)۔ اس کے بعد ان میں حق شناسی کی تحریک پیدا کرنے کے لئے انہیں پروردگار کی اہم نعمتیں کہ جو ان کے پورے وجود پر محیط ہیں کا ایک پہلو یاد دلایا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے (عَبْرَةُ هُوَ اُنْشَاَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ)۔

بے قدر و قیمت خاک کہاں اور یہ وجود عالی اور بدیع و عمدہ خلقت کہاں، کیا کوئی عقل اجازت دیتی ہے کہ انسان ایسے خالق و پروردگار کو جو یہ قدرت رکھتا ہے اور جس نے یہ نعمت بخشی ہے اسے چھوڑ کر ان تمسخر آمیز بتوں کے پیچھے جائے۔

نعمت خلقت کی طرف اشارہ کرنے بعد زمین میں موجود دوسری نعمت سرکش یاد دلانی گئی ہیں وہ ایسی ذات ہے جس نے زمین کی تعمیر اور آباد کاری تمہارے سپرد کی ہے اور اس کے وسائل اور ذرائع تمہیں بخشے ہیں (وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا)۔ لفظ ”استعمار“ اور ”اعمار“ لغت عرب میں دراصل زمین کی آباد کاری کسی کو سپرد کر دینے کے معنی میں ہے اور یہ بات طبعی و فطری ہے کہ اس کا لازمہ ہے کہ ضروری وسائل بھی اسے مہیا کئے جائیں، یہ وہ چیز ہے کہ جو ارباب لغت مثلاً راعب نے مفردات اور دوسرے بہت سے مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں کہی ہے۔ آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ خدا نے تمہیں طولانی عمر دی ہے، البتہ متون لغت کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

بہر حال یہ امر دونوں معانی کے لحاظ سے قوم ثمود کے بارے میں صادق آتا ہے کیونکہ ان کی آباد اور سرسبز و شاداب زمین اور پر نعمت باغات بھی تھے، یہ لوگ زراعت میں نئی نئی ایجادات کرتے تھے اور بہت محنت صرف کرتے تھے، علاوہ ازیں ان کی عمریں لمبی اور قوی جسم تھے، مضبوط عمارتیں بنانے میں بھی انہوں نے بیت ترقی کی تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ۔

پہاڑوں کے وسط میں پر امن گھر بناتے تھے، (حجر: ۸۲)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ خدا یہ نہیں کہتا کہ خدا نے زمین کو آباد کیا اور تمہارے اختیار میں دے دیا بلکہ کہتا ہے کہ زمین کی آبادی اور تعمیر تمہارے سپرد کردی، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وسائل و ذرائع ہر لحاظ سے مہیا ہے لیکن تمہیں کام اور کوشش کر کے زمین کو آباد کرنا ہے اور اس کے منابع اور ذرائع اپنے ہاتھ میں کرنا ہے اور کوشش کئی بغیر تمہیں اپنا حصہ نہیں مل سکتا۔

اس حقیقت کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک قوم اور ملت کو آباد کاری کا موقع ملنا چاہیئے، کام اس کے سپرد

کیا جانا چاہیئے اور ضروری وسائل اور سازوسامان اس کے اختیار میں دیا جانا چاہیئے۔  
 ”اب جب ایسا ہے تو اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور خدا کی طرف رجوع کرو اور پلٹ آؤ کہ میرا پروردگار اپنے بندوں کے قریب ہے اور ان کی درخواست قبول کرتا ہے (فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ)۔

قرآن اور ہمارے زمانے کا استعمار

جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھا ہے کہ خدا کے پیغمبر حضرت صالح (علیہ السلام) اپنی گمراہ قوم کی تربیت مکمل کرنے کے لئے ان سے خاک سے انسان کی عظیم خلقت اور زمین کی آباد کاری کے لئے اس کے وسائل و ذخائر سے سپرد کئے جانے کے بارے میں گفتگو کی ہے، یہ لفظ استعمار اگرچہ مفہوم کے اعتبار سے ایک خاص زیبائی اور کشش رکھتا ہے، اس میں تعمیر و آباد کاری کا مفہوم بھی مضمر ہے، تقویض اختیارات کا بھی اور وسائل و ذرائع مہیا ہونے کا بھی لیکن ہمارے زمانے میں اس لفظ کا مفہوم اس طرح سے مسخ ہو گیا ہے اور قرآنی مفہوم کے بالکل الٹ ہو گیا ہے۔ لفظ ”استعمار“ ہی نہیں جو اس منحوس انجام کو پہنچنا ہے بہت سے کلمات چاہے وہ فارسی کے ہوں یا عربی کے یا دوسری زبانوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ اسی طرح مسخ، تحریف اور تضاد کا شکار ہو گئے ہیں، عربی زبان کے الفاظ ”حضارت“، ”ثقافت“ اور ”حریت“ اور فارسی زبان میں ”تمدن“ ”روشن فکری“، ”آزادی“ ”آزادگی“ ”ہنر“ اور ”ہنر مندی“ اس قسم کی مثالیں ہیں، ان تحریفوں کے نتیجے میں خود فراموشی، مادہ پرستی، فکری غلامی، انکار حقیقت اور ہر قسم کا پھیلاؤ، عجلت پسندی اور بے توجہی جنم لیتی ہے۔

بہر حال ہمارے زمانے میں استعمار کا حقیقی مفہوم بڑی سیاسی و صنعتی طاقتوں اور سوپر طاقتوں کا مستضعف اور کمزور قوتوں پر غلبہ ہے جس کا ماحول یہ ہے کہ استعماری طاقتیں مستضعف اور کمزور قوتوں کے ہاں لوٹ مار کرتی ہیں، انہیں غارت کرتی ہیں، ان کا خون چوستی ہیں اور ان کی زندگی کے وسائل غصب کرتی ہیں۔ استعمار کی کئی روپ ہیں، کبھی یہ ثقافت و تہذیب کا روپ دہار لیتا ہے، کبھی فکری و نظری حوالے سے استحصال کرتا ہے، کبھی اقتصادی، کبھی سیاسی اور کبھی فوجی حوالے سے سامنے آتا ہے، یہ استعمار ہی ہے جس نے ہماری آج کی دنیا کا چہرہ تاریک کر دیا ہے، آج کی دنیا میں ہر چیز پر اقلیت کا قبضہ ہے اور بہت بڑی اکثریت تمام چیزوں سے محروم ہے، یہ استعمار ہی جنگوں، ویرانیوں، تباہ کاریوں اور اسلحہ کی کمر شکن دوڑ کا سرچشمہ ہے۔ جو لفظ قرآن نے اس مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے وہ ”استضعاف“ ہے کہ جو ٹھیک اس معنی کا سانچہ ہے یعنی ضعیف کرنا، اس لفظ کے وسیع مفہوم میں فکری، سیاسی، اقتصادی اور دیگر حوالوں سے کمزور اور ضعیف کرنا شامل ہے۔ ہمارے زمانے میں استعمار کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ خود لفظ استعمار بھی استعماری ہو گیا ہے کیونکہ اس کا لغوی مفہوم بالکل الٹ گیا ہے۔

بہر حال استعمار کے حوالے سے ایک غم انگیز طویل داستان وجود میں آئی ہے، کہا جاسکتا ہے کہ اس داستان میں پوری انسانی تاریخ سمائی ہوئی ہے، اگرچہ استعمار ہمیشہ چہرہ بدلتا رہتا ہے لیکن صحیح طور پر معلوم نہیں کہ انسانی معاشرے میں سے کب اس کی ریشہ کنی ہوگی اور کب انسانی زندگی باہمی تعاون و احترام اور اصول امداد باہمی کے بنیاد پر استوار ہوگی تاکہ تمام میدانوں میں انسانی پیشرفت کا عمل شروع ہوسکے۔

۶۲ قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّ لَنَا لَأَلْفَ شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ۔  
 ۶۳ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَبْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ۔  
 ۶۴ وَيَا قَوْمِ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمْسُوهَا بِسَوْءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ۔  
 ۶۵ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَلِكَ وَعَدُّ غَيْرٌ مَّكْدُوبٍ۔

ترجمہ

۶۲۔ انہوں نے کہا: اے صالح (علیہ السلام)! اس سے پہلے تو ہماری امید کا سرمایہ تھا، کیا تو ہمیں ان کی پرستش سے روکتا ہے جن کی ہمارے آباؤ و اجداد پرستش کرتے تھے اور ہمیں اس چیز کے بارے میں شک ہے جس کی طرف تو دعوت دیتا ہے۔

۶۳۔ اس نے کہا: اے میری قوم! کیا میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس کی رحمت بھی میرے شامل حال ہو (تو میں اس کی پیغام رسانی سے روگردانی کر سکتا ہوں)؟ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اس کے مقابلے میں کون میری مدد کر سکتا ہے، لہذا تمہاری باتیں سوائے تمہارے زیاں کار ہونے کے بارے میں میرے اطمینان کے میرے

لئے اور کوئی اضافہ نہیں کرتیں۔

۱۶۴۔ میری قوم!، یہ ناقہ خدا جو تمہارے لئے دلیل اور نشانی ہے، اسے چھوڑ دو کہ کدا کی زمین میں چرنے میں مشغول رہے اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ ورنہ بہت جلدی خدا کا عذاب گھیر لے گا۔

۶۵۔ (لیکن) انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں اور اس نے ان سے کہا (تمہاری مہلت کا وقت ختم ہو گیا ہے) تین دن تک اپنے گھروں میں فائدہ اٹھالو (اس کے بعد خدائی عذاب آجائے گا) یہ ایسا وعدہ ہے کہ جس میں جھوٹ نہیں ہوگا۔

تفسیر

اب ہم دیکھیں گے کہ حضرت صالح (علیہ السلام) کے مخالفین ان کی زندہ اور حقیقت پسندانہ منطق کا کیا جواب دیتے ہیں۔ انہوں نے حضرت صالح (علیہ السلام) کو غیر موثر بنانے کے لئے یا کم از کم ان کی باتوں کو بے تاثیر کرنے کے لئے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا، وہ آپ کو دھوکا دینا چاہتے تھے، ”کہنے لگے: اے صالح! اس سے پہلے تو ہماری امیدوں کا سرمایہ تھا“ مشکلات میں ہم تیری پناہ لیتے تھے، تجھ سے مشورہ کرتے تھے، تیرے عقل و شعور پر ایمان رکھتے تھے، اور تیری خیر خواہی اور ہمدردی میں ہمیں ہرگز کوئی شک نہ تھا (قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا) لیکن افسوس کہ تم نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا، دین بت پرستی کی اور ہمارے خداؤں کی مخالفت کر کے کہ جو ہمارے بزرگوں کا رسم رواج تھا اور ہماری قوم کے افتخارات میں ست تھا تو نے ظاہر کر دیا کہ تو بزرگوں کے احترام کا قائل ہے نہ ہماری عقل پر تمہیں کوئی اعتماد ہے اور نہ ہی تو ہمارے طور طریقوں کا حامی ہے، ”کیا سچ مچ تو ہمیں ان کی پرستش سے روکنا دینا چاہتا ہے جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے“ (أَتُنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا)۔

حقیقت یہ ہے کہ جس یکتا پرستی کے دین کی طرف تو دعوت دینا ہے ہم اس کے بارے میں شک و تردد میں ہی، نہ سرف ہمیں شک ہے بلکہ اس کے بارے میں ہم بدگمان بھی ہیں (وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ)۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ گمراہ قوم اپنے غلط اور نادرست افکار و اعمال کی توجیہ کے لئے اپنے بڑوں کا سہارا لیتی ہے ان کے تقدس کے ہالہ میں چھپنے کی کوشش کرتی ہے، یہ وہی پرانی منطق ہے جو تمام منحرف قوموں نے قدیم زمانے سے اپنے خرافات کی توجیہ کے لئے اختیار کی، یہی منطق آج بھی ایٹم اور خلاء کے دور میں پوری قوت سے باقی ہے۔

لیکن خدا کے یہ عظیم پیغمبر ان کی ہدایت سے مایوس نہ ہوئے اور ان کی پر فریب باتوں کا ان کی عظیم روح پر ذرہ برابر اثر نہ ہوا، انہوں نے اپنی مخصوص قناعت کے ساتھ انہیں جواب دیا، ”کہا: اے میری قوم! دیکھو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس کی رحمت میرے شامل حال ہو، اور اس نے میرے دل کو روشن اور فکر کو بیدار کیا ہو اور میں ایسے حقائق سے آشنا ہوا ہوں جن سے پہلے آشنا نہ تھا تو کیا میں پھر بھی سکوت اختیار کر سکتا ہوں اور کیا اس صورت میں میں پیام الہی نہ پہنچاؤں اور انحراف اور برائیوں کے خلاف جنگ نہ کروں“ (قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَأَتَانِي مِنْهُ رَحْمَةٌ، اس عالم میں ”اگر میں فرمان خدا کی مخالفت کروں تو کون شخص ہے جو اس کے عذاب و سزا کے مقابلے میں میری مدد کر سکتا ہے“، فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ، لیکن جان لو کہ تمہاری اس قسم کی باتیں اور بڑوں کی روش سے استدلال وغیرہ کا مجھ پر اس کے سوا اور کوئی اثر نہیں ہوگا کہ تمہارے زیاں کار ہونے کے بارے میں میرا ایمان بڑھے گا (فَمَا تَزِيدُونِي غَيْرَ تَحْسِيرٍ)۔

اس کے بعد آپ نے اپنی دعوت کی حقانیت کے لئے معجزے اور نشانی کے لئے نچاندہی کی، ایسی نشانی جو انسانی قدرت سے ماوراء ہے اور صرف قدرت الہی کے سہارے پیش کی گئی ہے، ان سے کہا: ”اے میری قوم! یہ ناقہ الہی تمہارے لئے آیت اور نشانی ہے“ (وَيَا قَوْمِ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ)، ”اسے چھوڑ دو کہ یہ بیابانوں چراگاہوں میں گھاس پھوس کھائے“ (فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ)، ”اور اسے ہرگز کوئی تکلیف نہ پہنچانا، اگر ایسا کرو گے تو فوراً تمہیں دردناک عذاب الہی گھیر لے گا“ (وَلَا تَمْسُوْهَا بِسُوْءٍ فَيَأْخُذْكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ)۔

ناقہ صالح

لغت میں ”ناقہ“ اونٹنی کے معنی میں ہے، مندرجہ بالا آیت میں اور قرآن کی بعض دیگر آیات میں اس کی اضافت خدا کی طرف سے کی گئی ہے، (۱) یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہ اونٹنی کچھ خصوصیات رکھتی تھی، اس طرف توجہ کرتے ہوئے مندرجہ بالا آیت میں اس کا ذکر آیات الہی اور دلیل حقانیت کے طور پر آیا ہے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ اونٹنی ایک عام اونٹنی نہ تھی اور ایک حوالے سے یا کئی حوالوں سے معجزہ کے طور پر تھی، لیکن آیات میں یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ نہیں آیا کہ اس ناقہ کی خصوصیات کیا تھیں، اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام اونٹنی نہ تھی۔

بس یہی ایک چیز قرآن میں دو مواقع پر موجود ہے کہ حضرت صالح (علیہ السلام) نے اس ناقہ کے بارے میں اپنی قوم کو

بتایا کہ اس علاقے میں پانی کی تقسیم ہونا چاہیئے، ایک دن ناقہ کا حصہ ہے اور ایک دن لوگوں کا، آیت کے الفاظ ہیں:

هَذِهِ نَاقَةُ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبٌ يَوْمَ مَعْلُومٍ. (شعراء: ۱۵۵)

نیز سورہ قمر کی آیہ ۲۸ میں :

وَنَبِّئُهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُحْتَضَرٌ .

سورہ شمس میں بھی اس امر کی طرف اشارہ موجود ہے:

فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا . (شمس: ۱۳)

لیکن یہ بات پوری طرح مشخص نہیں ہوسکی کہ پانی کی یہ تقسیم کس طرح خارق عادت تھی، ایک احتمال یہ ہے کہ وہ اونٹنی بہت زیادہ پانی پیتی تھی اس طرح سے کہ چشمہ کا تمام پانی اس کے لئے مخصوص ہوجاتا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ جس وقت وہ پانی پینے کے لئے آتی تو دوسرے جانور پانی پینے کی جگہ پر آنے کی جرات نہ کرتے ۔

ایک سوال یہ ہے کہ یہ جانور تمام پانی سے کس طرح استفادہ کرتا تھا، اس سلسلے میں یہ احتمال ہے کہ اس بستی کا پانی کم مقدار میں ہو، جیسے بعض بستیوں میں ایک ہی چھوٹا سا چشمہ ہوتا ہے اور بستی والے مجبور ہوتے ہیں کہ دن بھر کا پانی ایک گڑھے میں اکٹھا کریں تاکہ کچھ مقدار جمع ہوجائے اور اسے استعمال کیا جاسکے ۔

لیکن دوسری طرف سورہ شعراء کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود تھوڑے پانی والے علاقے میں زندگی بسر نہیں کرتی تھی، بلکہ وہ لوگ تو باغوں، چشموں، کھیتوں اور نخلستان کے مالک تھے، قرآن کہتا ہے:

أُنْتَرِكُونَ فِي مَا هَآهِنَا أَمِينِينَ، فِي جَنَاتٍ وَعُيُونٍ، وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضْبِيًّا. (شعراء: ۱۴۶، تا ۱۴۸)

بہرحال جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ ناقہ صالح کے بارے میں اس مسئلے پر قرآن نے اجمالاً ذکر کیا ہے لیکن بعض روایات جو شیعہ اور سنی دونوں طرق سے نقل ہوئی ہیں میں ہے کہ اس ناقہ کے عجائب خلقت میں سے تھا کہ وہ پہاڑ کے اندر سے باہر نکلی، اس کے بارے میں کچھ اور خصوصیات بھی منقول ہیں جن کی وضاحت کا یہ موقع نہیں ہے ۔

بہر کیف حضرت صالح (علیہ السلام) جیسے عظیم نبی نے اس ناقہ کے بارے میں بہت سمجھایا بجھایا مگر انہوں نے آخر کار ناقہ کو ختم کردینے کا مصمم ارادہ کرلیا، کیونکہ اس کی خارق عادت اور غیر معمولی خصوصیات کی وجہ سے لوگوں میں بیداری پیدا ہو رہی تھی اور حضرت صالح (علیہ السلام) کی طرف مائل ہو رہے تھے لہذا قوم ثمود کے کچھ سرکشوں نے جو حضرت صالح (علیہ السلام) کی دعوت کے اثرات کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے اور وہ برگز لوگوں کی بیداری نہیں چاہتے تھے کیونکہ خلق خدا کی بیداری سے ان کے استعماری اور استثماری مفادات کو نقصان پہنچاتا تھا، ناقہ کو ختم کرنے کی سازش تیار کی، کچھ افراد کو اس کام پر مامور کیا گیا، آخر کار ان میں سے ایک نے ناقہ پر حملہ کیا اور اس پر ایک یا کئی وار کئے اور اسے مار ڈالا (فَعَقَرُوهَا) ۔

”عقروہا“ ”عقر“ (بروزن ”ظلم“) کے مادہ سے ہے، اس کا معنی ہے کسی چیز کی اساس اور جڑ، ”عقرة البعير“ کا معنی ہے ”میں نے اونٹ کا سر قلم کر دیا اور اسے نحر کر دیا“ اونٹ کو قتل کرنا چونکہ اس کے اصل وجود کو ختم کر دینے کا سبب بنتا ہے لہذا یہ مادہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے، کبھی نحر کرنے کی بجائے اونٹ کی کوچینکاٹنے یا اس کے ہاتھ پاؤں قطع کرنے کے معنی میں بھی لیا گیا ہے، دراصل ان تمام معانی کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے اور ان سب کا ایک ہی نتیجہ ہے (غور کیجئے گا) ۔

.....

۱۔ ادبی اصطلاح میں یہ ایک تشریحی اضافت ہے جو کسی چیز کے شرف اور اہمیت کی دلیل ہے، مندرجہ بالا آیت میں اس کے دو نمونے نظر آتے ہیں ”ناقۃ اللہ“ اور ”ارض اللہ“، دیگر مواقع پر ”شہر اللہ“ اور ”بیت اللہ“ وغیرہ آتے ہیں ۔

مکتب کا رشتہ

یہ امر توجہ طلب ہے کہ اسلامی روایات میں ہے جس نے ناقہ کو مارا تھا وہ صرف ایک شخص تھا لیکن اس کے باوجود قرآن اس کام کی نسبت حضرت صالح (علیہ السلام) کے تمام مخالفین کی طرف دیتا ہے اور جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے: ”فَعَقَرُوهَا“ ۔

یہ اس بنا پر ہے کہ قرآن کسی امر پر باطنی طور پر راضی ہونے اور اس کے مکتبی رشتے کو اس میں شرکت سمجھتا ہے، درحقیقت اس کام کی سازش انفرادی نہ تھی، یہاں تک کہ جس نے اس پر عمل کیا تھا اس نے فقط اپنی قوت کے سہارے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پیچھے جمعیت کی طاقت تھی اور وہی اسے حوصلہ دے رہی تھی، یقیناً ایسے کام کو انفرادی قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ ایک گروہی اور جماعتی کام شمار ہوگا ۔



امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وانما عقر ناقۃ ثمود رجل واحد فعمهم الله بالعذاب لما عموه بالرضا -

ناقہ صالح کو ایک شخص نے قتل کیا تھا، خدا نے تمام سرکش قوم کو عذاب کیا کیونکہ وہ سب اس پر راضی تھے (1) - اسی مضمون کی یا اس کی مانند متعدد دیگر روایات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں، ان سے اسلام کے نزدیک مکتبی رشتے اور فکری ہم آہنگی کی بنیاد پر بننے والے پروگراموں کی بہت زیادہ اہمیت واضح ہوتی ہے، نمونہ کے طور پر ان روایات کا کچھ حصہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم

من شهد امرأ فکرمه کان کمن غاب عنه، ومن غاب عن امر فرضیه کان کمن شهده.

جو شخص کسی کام کو دیکھے لیکن اس سے متنفر ہو تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو اس سے غائب ہو اور جو کسی کام سے غائب ہو لیکن دلی طور پر اس پر راضی ہو تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو اس وقت حاضر تھا اور اس میں شریک تھا - (2)

امام علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

لو ان رجلا قتل فی المشرق فرضی بقتله رجل بالمغرب لکان الرضی عند الله عز وجل شریک القاتل.

جب کوئی شخص مشرق میں قتل ہو اور ایک شخص مغرب میں رہتے ہوئے اس کے قتل پر راضی ہو تو خدا کے ہانوں قاتل کا شریک ہے - (3)

حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

الراض بفعل قوم کالدخل معهم فیہ وعلی کل داخل فی باطل اثمان اثم العمل بہ واثم الرضا بہ.

جو شخص کسی گروہ کے فعل پر راضی ہو وہ اس شخص کی طرح ہے جو اس کام میں ان کا شریک ہو لیکن جس نے عملاً شرکت کی ہے اس کے دو گناہ ہیں، ایک عمل گناہ کا اور دوسرا اس عمل پر راضی ہونے کا گناہ ہے - (4)

مکتبی اور فکری رشتے کی گہرائی کو جاننے کے لئے اور سمجھنے کے لئے اس میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں، نہج البلاغہ میں موجود حضرت علی علیہ السلام کے اس پر معنی اور بلا دینے والے کلام کی طرف توجہ کرنا کافی ہے:

جب حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) نے میدان جمل میں جنگ کی آگ بھڑکانے والے باغیوں پر فتح پالی اور آپ کے اصحاب و انصار شرک و جاہلیت کے خلاف اسلام کی اس کامیابی پر خوش ہوئے تو ان میں سے ایک شخص عرض کرنے لگا:

میری کتنی خواہش تھی کہ میرا بھائی اس میدان میں موجود ہوتا اور وہ بھی دشمن پر آپ کی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا -

امام (علیہ السلام) نے اس کی طرف رخ کیا اور فرمایا:

اھوی اخیک معنا؟

یہ بتاؤ کہ تمہارے بھائی کا دل اور آرزو ہمارے ساتھ تھی؟

فقال نعم.

اس نے عرض کیا: جی ہاں -

تو امام (علیہ السلام) نے فرمایا:

فقد شهدنا

(فکر مت کرو) وہ بھی اس میدان میں شریک تھا -

اس کے بعد آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

ولقد شهدنا فی عسکرنا هذا اقوام فی اصلاب الرجال وارجام النساء سیر عف بہم الزمان ویقوی بہم الایمان.

تجھے اس سے بھی بڑھ کر بتاؤں، آج ہمارے لشکر میں ان گروہوں نے بھی شرکت کی ہے جو ابھی اپنے باپوں کے صلب اور ماؤں کے رحم میں ہیں (اور ابھی انہوں نے اس دنیا میں قدم نہیں رکھا) لیکن وقت گزرنے کے ساتھ عنقریب وہ دنیا میں آئیں گے اور ان کی قوت و طاقت سے قوت ایمان میں اضافہ ہوگا - (5)

اس میں شک نہیں کہ جو لوگ کسی کام میں شریک ہوتے ہیں اور اس کی تمام مشکلات و زحمات کو برداشت کرتے ہیں وہ ایک خاص امتیاز کے حامل ہیں لیکن اس کامیابی یہ نہیں کہ دوسرے بالکل اس میں شریک نہیں ہوتے بلکہ کیا اس زمانے میں اور کیا آئندہ زمانوں میں جو اشخاص بھی فکر و نظر اور مکتب و مذہب کے اعتبار سے اس کام سے منسلک ہیں وہ ایک

لحاظ سے اس میں شریک ہیں -

یہ مسئلہ شاید کسی عالمی مکتب میں اپنی نظیر و مثیل نہ رکھتا ہو، جو کہ ایک اہم اجتماعی حقیقت کی بنیاد پر استوار ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ طرزِ فکر میں دوسروں سے مشابہت رکھتے ہیں اگرچہ ان کے انجام دئے ہوئے کسی معین کام میں شریک نہ ہوں تاکہ ہم یقینی طور اپنے ماحول اور زمانے میں اس سے ملتے جلتے کام انجام دیں گے کیونکہ انسان کے اعمال ہمیشہ اس کے افکار کا پرتو ہوتے ہیں، ممکن نہیں کہ انسان کسی مکتب کا پابند ہو اور وہ اس کے عمل میں واضح نہ ہو۔

اسلام پہلے قدم پر ہی روح انسانی میں اصلاحات جاری کرتا ہے تاکہ مرحلہ عمل کی خود بخود اصلاح ہو جائے، جو دستور ہم نے ستور بالا میں ذکر کیا ہے اس کے مطابق جب ایک مسلمان کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں نیک کام یا بد کام انجام پارہا ہے تو اس کے بارے میں فوراً ایک صحیح موقف اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اپنے قلب و روح کو نیکیوں کا ہمنوا بناتا ہے اور برائیوں سے نفرت کرتا ہے، یہ اندرونی کاوش یقیناً اس کے اعمال پر اثر انداز ہوگی اور اس کا فکری تعلق ایک عملی رشتے کی صورت میں نمودار ہو جائے گا۔

آیت کے آخر میں حضرت صالح (علیہ السلام) نے قوم کی سرکشی، نافرمانی اور اس کے ہاتھوں قتلِ ناقہ کے بعد اسے خطرے سے آگاہ کیا اور ”کہا کہ پورے تین دن تک اپنے گھروں میں جس نعمت سے چاہو استفادہ کرو اور جان لو کہ ان تین دنوں کے بعد عذاب الہی آکے رہے گا“ (فَقَالَ تَمَتُّوْا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ)، ”اس بات کو حتمی سمجھو، میں جھوٹ نہیں کہہ رہا یہ ایک سچا اور حقیقی وعدہ ہے“ (ذٰلِكَ وَاعْدُوْا غَيْرُ مَكْدُوْبٍ)۔

.....

- 1- نہج البلاغہ، کلام ۲۰۱۔
- 2- وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۴۰۹۔
- 3- وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۴۱۰۔
- 4- وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۴۱۱۔
- 5- نہج البلاغہ، کلام ۱۲۔

#### تفسیر نمونہ جلد 09

۶۶ قَلَمًا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَمِن خِزْيِ يَوْمِئِذٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ۔  
۶۷ وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ۔  
۶۸ كَأَن لَّمْ يَعْنُوا فِيهَا آلَانَ ثُمُودَ كَفَرُوا رَبَّهُمْ أَلَا بُعْدًا لِّثُمُودَ۔

ترجمہ

۶۶ جب (اس قوم کی سزا کے بارے میں) ہمارا حکم آپہنچا تو صالح اور اس پر ایمان لانے والوں کو ہم نے اپنی رحمت کے ذریعے (اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی) کیونکہ تیرا پروردگار قوی اور ناقابل شکست ہے۔  
۶۷ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں (آسمانی) صیحہ نے آلیا اور وہ اپنی ہی گھروں میں منہ کے بل گر کر مر گئے۔  
۶۸ اس طرح سے کہ گویا وہ ان گھروں کے باسی ہی نہ تھے، جان لو کہ قوم ثمود نے اپنے پروردگار کا انکار کیا تھا، دور ہو قوم ثمود (رحمت پروردگار سے)۔

قوم ثمود کا انجام

ان آیت میں اس سرکش قوم (قوم ثمود) پر تین دن کی مدت ختم ہونے پر نزول عذاب کی کیفیت بیان کی گئی ہے: اس گروہ پر عذاب کے بارے میں جب ہمارا حکم آپہنچا تو صالح اور اس پر ایمان لانے والوں کو ہم نے اپنی رحمت کے زیر سایہ نجات بخشی (قَلَمًا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا)۔

انہیں نہ صرف جسمانی و مادی عذاب سے نجات بخشی بلکہ ”رسوائی، خواری اور بے آبروئی سے بھی انہیں نجات عطا کی کہ جو اس روز اس سرکش قوم کو دامنگیر تھی“ (وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ) - (۱)

کیونکہ تیرا پروردگار ہر چیز پر قادر اور ہر کام پر تسلط رکھتا ہے، اس کے لئے کچھ محال نہیں ہے اور اس کے ارادے کے سامنے کوئی طاقت کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی (إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ)، لہذا کثیر جمعیت کے عذاب الہی میں مبتلا ہونے سے صاحب ایمان گروہ کو کسی قسم کی کوئی مشکل اور زحمت پیش نہیں ہوگی، یہ رحمت الہی ہے جس کا تقاضا ہے کہ بے گناہ گنہگاروں کی آگ میں نہ جلیں اور بے ایمان افراد کی وجہ سے مومنین گرفتارِ بلا نہ ہوں۔ لیکن ظالموں کو صیحہ آسمانی نے گھیر لیا، اس طرح سے کہ یہ چیخ نہایت سخت اور وحشتناک تھی، اس کے اثر سے وہ سب کے سب گھروں ہی میں زمین پر گر کر مر گئے، (وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ)۔ وہ اس طرح مرے اور نابود ہوئے اور ان کے آثار مٹے کہ گویا وہ اس سرزمین میں کبھی رہتے ہی نہ تھے، (كَأَنَّ لَمْ يَغْنُوا فِيهَا)۔

جان لو کہ قوم ثمود نے اپنے پروردگار سے کفر کیا تھا اور انہوں نے احکام الہی کو پس پشت ڈال دیا تھا (أَلَا إِنَّ تَمُودَ كَفَرُوا رَبَّهُمْ)۔

دور ہو قوم ثمود، اللہ کے لطف و رحمت سے اور ان پر لعنت ہو (أَلَا بُعْدًا لِثَمُودَ)۔

۱۔ ”خزئی“ لغت میں شکست کے معنی میں ہے کہ جو انسان پر آتی ہے، چاہے خود اس کے اپنے ذریعہ ہو یا کسی دوسرے کی وجہ سے نیز ہر قسم کی رسوائی اور بہت زیادہ ذلت بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ مومنین کے لئے رحمت الہی

ان آیات میں ہم پھر دیکھتے ہیں کہ رحمت الہی مومنین پر اس قدر مہربان ہے کہ نزول عذاب سے پہلے خدا تعالیٰ انہیں امن و امان کی جگہ منتقل کر دیتا ہے اور ہر خشک وتر کو عذاب اور سزا میں مبتلا نہیں کرتا۔ البتہ ممکن ہے کہ حوادث ناگوار مثلاً سیلاب، وبائی بیماریاں اور زلزلے وغیرہ ایسا رخ اختیار کر لیں کہ ہر چھوٹے بڑے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں لیکن یہ حوادث یقینی طور پر عذاب الہی کے حوالے سے نہیں ہوتے ورنہ عدالت الہی کی منطق میں محال ہے کہ ایک بھی بے گناہ شخص لاکھوں گنہگاروں کے ساتھ جرم میں گرفتار ہو۔ یہ بات البتہ پورے طور پر ممکن ہے کہ کچھ افراد ایک گنہگار جماعت میں رہتے ہوئے خاموش رہیں اور وہ برائی کے خلاف مقابلے کے بارے میں اپنی ذمہ داری پوری نہ کریں اور وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں لیکن اگر وہ اپنی ذمہ داری پر عمل کریں تو پھر محال ہے کہ وہ حادثہ جو عذاب کے طور پر نازل ہو انہیں دامنگیر ہو، (خدا شناسی سے مربوط مباحث میں نزول بلا اور حوادث کے مابین رابطے کے حوالے سے ہم نے اس موضوع سے متعلق کتب میں تفصیلی بحث کی ہے) - (1)

۲۔ ”صیحہ“ سے کیا مراد ہے

”صیحۃ“ لغت میں ”بہت بلند آواز“ کو کہتے ہیں جو عام طور پر کسی انسان یا جانور کے منہ سے نکلتی ہے لیکن اس کامفہوم اسی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی ”نہایت بلند آواز“ اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ آیات قرآنی کے مطابق چند ایک گنہگار قوموں کو صیحہ آسمانی کے ذریعے سزا ہوئی، ان میں سے ایک یہی قوم ثمود تھی، دوسری قوم لوط (حجر: ۷۳) اور تیسری قوم شعیب (ہود: ۹۴)۔ قرآن کی دوسری آیات سے قوم ثمود کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اسے صاعقہ کے ذریعے سزا ہوئی، ارشاد الہی ہے: فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَتَمُودَ (فصلت: ۱۳) یہ نشاندہی کرتی ہے کہ ”صیحۃ“ سے مراد ”صاعقۃ“ کی وحشتناک آواز ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صاعقہ کی وحشتناک آواز کسی جمعیت کو نابود کر سکتی ہے؟ اس کا جواب مسلماً مثبت ہے کو

کہ ہم جانتے ہیں کہ آواز کی لہریں جب ایک معین حد سے گزر جائیں تو شیشے کو توڑ دیتی ہیں، یہاں تک کہ بعض عمارتوں کو تباہ کر دیتی ہیں اور انسانی بدن کے اندر کے آرگنائزم کو بے کار کر دیتی ہیں۔  
ہم نے سنا کہ جب ہوائی جہاز صوتی دیوار توڑ دیتے ہیں (اور آواز کی لہروں سے تیز رفتار سے چلتے ہیں) تو کچھ لوگ بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں یا عورتوں کے حمل ساقط ہو جاتے ہیں یا ان علاقوں میں موجود عمارتوں کے تمام شیشے ٹوٹ جاتے ہیں۔

فطری اور طبیعی ہے کہ اگر آواز کی لہروں کی شدت اس سے بھی زیادہ ہو جائے تو آسانی سے ممکن ہے کہ اعصاب میں، دماغ کی رگوں میں اور دل کی ڈھڑکن میں تباہ کن اختلال پیدا ہو جائے جو انسانوں کی موت کا سبب بن جائے۔  
آیات قرآنی کے مطابق اس دنیا کا اختتام بھی ایک عمومی صیحہ کے ذریعے ہوگا، ارشاد الہی ہے:  
مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ (یسین: ۴۹)  
جیسا کہ قیامت بھی ایک بیدار کرنے والی صیحہ سے شروع ہوگی، قرآن کہتا ہے:  
إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ۔ (یسین: ۵۳)

۳۔ سزا صرف مادی پہلو سے نہیں

زیر بحث آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ سرکشوں اور طغیان گروں کی سزا نہ صرف مادی پہلو نہیں رکھتی بلکہ معنوی پہلو کی بھی حامل ہے کیونکہ ان کا رسوا کن انجام اور مرگبار سرنوشت کا تذکرہ تاریخ کا رسوا کر دینے والا باب بن جائے گا جب کہ اہل ایمان کا ذکر تاریخ میں سنہری حروف میں رقم ہوگا۔

۴۔ ”جاٹمین“ کا مفہوم

”جاٹم“ مادہ ”جٹم“ (بروزن خشم) سے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے معنی میں ہے، اسی طرح منہ کے بل گرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

”جاٹمین“ کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ صیحہ آسمانی ان کی موت کا سبب بنی لیکن ان کے بے جان جسم زمین پر گرے پڑے تھے، البتہ چند ایک روایات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ صاعقہ کی آگ نے انہیں جلا کر خاکستر کر دیا لیکن یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ صدائے صاعقہ کا وحشتناک اثر فوراً ظاہر ہو جاتا ہے جب کہ اس کے جلانے کے آثار خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو عمارتوں کے اندر ہوں، بعد میں ظاہر ہوتے ہیں۔

۵۔ ”یغنا“ کا مطلب

”یغنا“ ”غنی“ کے مادہ سے، کسی مکان میں اقامت کے معنی میں ہے اور بعید نہیں کہ ”غنا“ کا اصلی مفہوم بے نیازی کے معنی سے لیا گیا ہو کیونکہ بے نیاز شخص مستقل گھر رہتا ہے اور وہ مجبور نہیں ہوتا کہ ایک گھر سے دوسرے میں منتقل ہوتا رہے۔

جملہ ”کان لم یغنا فیہا“ قوم ثمود اور اسی طرح قوم شعیب کے لئے آیا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی زندگی کا دفتر اس طرح سے لپیٹ دیا گیا کہ گویا وہ اس سرزمین میں رہتے ہی نہ تھے۔ (2)

۶۹ وَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامًا فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ  
۷۰ فَلَمَّا رَأَىٰ أَنِّيهِمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَحْزَنْ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ  
۷۱ وَأَمْرًا تُهَيِّئُ فَاصْبِرْ إِنَّا بِأَسْحَابِ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ  
۷۲ قَالَتْ يَا وَيْلَتَا أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ  
۷۳ قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ

ترجمہ

۶۹۔ ہمارے بھیجے ہوئے بشارت لے کر ابراہیم کے پاس آئے، کہا: سلام، (اس نے بھی) کہا: سلام اور زیادہ دیر نہ لگی کہ (ان کے لئے) بھنا ہوا گوسالہ لے آیا۔

۷۰۔ (لیکن) جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھتے (اور وہ اسے نہیں کھاتے) تو انہیں بڑا سمجھا اور دل میں احساس خوف کیا (مگر) انہوں نے اس سے (جلد ہی) کہا: ڈرئے نہیں ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

۷۱۔ اور اس کی بیوی کھڑی تھی وہ بنسی تو ہم نے اسے اسحاق کی اور اس کے بعد یعقوب کی بشارت دی ۔  
 ۷۲۔ اس نے کہا: وائے بو مجھ پر، کیا میں بچہ جنوں گی جب کہ میں بوڑھی عورت ہوں اور میرا یہ شوہر بھی بوڑھا ہے،  
 یہ تو واقعاً عجیب بات ہے ۔  
 ۷۳۔ انہوں نے کہا کیا حکم خدا پر تعجب کرتی ہو، یہ خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں جو تم اہل بیت پر کیونکہ خدا  
 حمید اور مجید ہے ۔

.....

1۔ تفسیر نمونہ، ج ۷، ص ۱۱۳ (اردو ترجمہ) پر بھی کچھ توضیحات آئی ہیں جو ایسی آیات سے فہم مقصود کے لئے موثر ہیں، فارین  
 کرام! اس سلسلے میں کتاب ”آفریدگار جہان“ اور ”در جستجوی خدا“ کی طرف رجوع کریں ۔  
 2۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ، ج ۶، ص ۲۱۰، (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں ۔

ابراہیم بت شکن کی زندگی کے کچھ حالات

اب ابراہیم جیسے بہادر بت شکن کی زندگی کے کچھ حالات کی باری ہے ۔  
 البتہ اس عظیم پیغمبر کی بھر پور زندگی کے بارے میں زیادہ تفصیل قرآن کی دوسری سورتوں میں آئی ہے، مثلاً سورہ  
 بقرہ، آل عمران، نساء، انعام اور انبیاء وغیرہ، یہاں ان کی زندگی کا صرف ایک حصہ ذکر ہوا ہے جو قوم لوط کے واقعہ  
 سے اور اس سرکش گناہ آلود گروہ کے عذاب دئے جانے سے مربوط ہے ۔  
 پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس ایک بشارت لے کر آئے (وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ) ۔  
 جیسا کہ بعد کی آیات سے معلوم ہوگا یہ کدا کے بھیجے ہوئے وہی فرشتے تھے جو قوم لوط کو تباہ و برباد کرنے پر مامور  
 تھے لیکن پہلے وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس ایک پیغام دینے آئے تھے ۔  
 اس بارے میں کہ وہ کونسی بشارت لے کر آئے تھے، دو احتمالات ہیں اور ان دونوں کو جمع کرنے میں کوئی مانع نہیں ہے

پہلا احتمال یہ ہے کہ وہ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) اور حضرت اسحاق (علیہ السلام) کی پیدائش کی بشارت تھی کیوں  
 کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ایک طویل عمر گزر چکی تھی، ابھی تک ان کی کوئی اولاد نہ تھی، ان کی آرزو تھی  
 کہ ان کا ایک یا کئی بیٹے ہوں جو صاحب نبوت ہوں، اس لئے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) اور حضرت اسحاق (علیہ  
 السلام) کی پیدائش کی خبر ان کے لئے ایک عظیم بشارت تھی ۔  
 دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) قوم لوط کے فساد اور سرکشی سے بہت ناراحت تھے جب انہیں معلوم  
 ہوا کہ فرشتے ان کے بارے میں یہ حکم لائے ہیں تو انہیں راحت ملی ۔  
 بہر حال جب بھیجے ہوئے (رسولان) ان کے پاس آئے تو انہوں نے سلام کیا (قَالُوا سَلَامًا)، اس نے بھی ان کے جواب میں  
 سلام کہا (قَالَ سَلَامٌ) ۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ان کے لئے بھنا ہوا بچھڑا لے آئے (فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ) ۔  
 ”عجل“ کا معنی ”بچھڑا“ اور ”گوسالہ“ اور ”حنید“ کا معنی ہے ”بھنا ہوا“ بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ ”حنید“ پر  
 قسم کے بھنے ہوئے کو نہیں کہتے بلکہ صرف اسی گوشت کو کہتے ہیں جو پتھروں کے اوپر رکھا جائے اور اس کے  
 اطراف میں آگ روشن کی جائے لیکن آگ اس تک نہ پہنچے اور وہ خستہ اور بھنا ہوا ہو جائے ۔  
 اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہمان نوازی کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ جتنا جلدی ہوسکے مہمان کے لئے کھانا  
 تیار کیا جائے کیوں کہ مہمان جب کہیں سے آتا ہے خصوصاً اگر مسافر ہو تو عموماً تھکا ماندا اور بھوکا ہوتا ہے، اسے  
 کھانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور آرام کی بھی لہذا جلدی سے اس کے لئے کھانا تیار کیا جانا چاہیئے تاکہ وہ پھر آرام  
 کرسکے ۔

ہوسکتا ہے کہ بعض تنقید کریں کہ چند مہمانوں کے لئے ایک بچھڑا زیادہ ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے اول تو  
 مہمانوں کی تعداد قرآن نے صراحت سے بیان نہیں کی اور ان کی تعداد میں اختلاف ہے بعض نے تین، بعض چار، بعض نے  
 نو اور بعض نے گیارہ افراد لکھے ہیں اور اس سے زیادہ کا بھی احتمال ہے، دوسرا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام)  
 کے پیروکار اور دوست احباب بھی تھے اور کن اور جان پہچان والے بھی اور یہ معمول ہے کہ بعض اوقات مہمان کے آنے  
 پر مہمان کی ضرورت سے کئی گناہ زیادہ کھانا تیار کیا جاتا ہے اور سب اس سے استفادہ کرتے ہیں ۔  
 لیکن اس موقع پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے دیکھا کہ نو وارد کھانے کی طرف

سے ہاتھ ہی نہیں بڑھاتے، یہ صورت ان کے لئے بالکل نئی تھی، اس بنا پر آپ کو ان سے اجنبیت کا احساس ہوا، اور یہ معاملہ ان کی وحشت و پریشانی کا باعث بنا (فَلَمَّا رَأَىٰ أُيُوبَ لَمْ يَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَوَلَّىٰ سَئِئًا أَن يَبْسُطَ كِفْلَهُمْ وَمِنَ الْمُؤْمِنِينَ)۔ اس امر کا سرچشمہ ایک دیرینہ روایت ہے جو آج تک ان موقعوں میں پائی جاتی ہے جو گزشتہ اچھی روایات کی پابند رہتی ہیں اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص دوسرے کا کھانا کھالے یعنی اس کا نان و نمک کھالے تو اس کے بارے میں کوئی برا ارادہ نہیں کرتا، لہذا اگر کوئی واقعاً کسی کے بارے میں برا ارادہ رکھتا ہو تو کوشش کرتا ہے کہ اس کا نان و نمک نہ کھائے، اس لئے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ان مہمانوں کے بارے میں شک ہوا اور سوچا کہ ہوسکتا ہے یہ کوئی برا ارادہ رکھے ہوں۔

ان ”رسولوں“ کو یہ مسئلہ معلوم ہو گیا تو انہوں نے جلدی سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا شک دور کر دیا اور ”اس سے کہا: مت ڈریں ہم خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں“ اور ایک ظالم قوم کو عذاب کرنے پر مامور ہیں اور فرشتے غذا نہیں کھاتے (قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ لَّوْطٍ)۔

اس موقع پر ابراہیم کی بیوی (سارہ) جو وہاں کھڑی تھی ہنسی (وَأَمْرًا تَهُنَّ فَضَحِكَتْ)۔ شاید وہ اس لئے ہنسی ہوں کہ وہ بھی قوم لوط کے کرتوتوں سے سخت ناراحت اور پریشان تھیں اور ان کی سزا نزدیکی ہونے کا سن کر خوش ہوئیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ تعجب بلکہ وحشت کے باعث ہنسی ہوں کیوں کہ ہنسی صرف مسرت کے لمحات کے لئے مخصوص نہیں بلکہ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان شدت و وحشت و تکلیف پر ہنستا ہے، عربوں کی مشہور ضرب المثل ہے:

شر الشدائد ما يضحك.

بدترین مشکلات وہ ہیں جو انسان کو ہنسا دیں۔

یا ہوسکتا ہے کہ وہ اس بنا پر ہنسی ہوں کہ کھانا موجود ہے لیکن نووارد مہمان ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتے۔ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ بیٹے کی خوشخبری پر ہنسی تھیں اگرچہ ظاہر آیت اس تفسیر کی نفی کرتی ہے کیوں کہ اسحاق کی بشارت انہیں اس ہنسنے کے بعد دی گئی ہے ہاں البتہ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے انہوں نے ابراہیم کو بشارت دی ہو، سارا نے یہ بات سن لی ہو اور وہ اس احتمال پر خوش ہوئی ہوں کہ ان سے ابراہیم (علیہ السلام) کا فرزند ہوگا۔ لیکن انہوں نے تعجب کیا کہ کیا اس سن و سال میں ممکن ہے کہ ایک بوڑھی عورت اپنے بوڑھے شوہر کے بچے کو جنم دے، لہذا انہوں نے تعجب سے ان سے سوال کیا اور انہوں نے صراحت سے کہا: جی ہاں! یہ بچہ تجھی سے ہوگا، سورہ ذارعات کی آیات میں غور کرنے سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ یہاں پر ”ضحکت“ ”ضحک“ (بروزن ”درک“) کے مادہ سے عورتوں کے ماہواری کے معنی میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسی وقت سارا کو دوبارہ ماہواری شروع ہوگئی جب کہ پہلے ختم ہوچکی تھی اور وہ حد یاس تک پہنچ چکی تھیں اور یہ ماہواری بچہ کی پیدائش کے امکان کی نشانی ہے، لہذا انہوں نے سارا کو اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی تو پھر انہوں نے مسئلہ کو پوری طرح باور کیا، مفسرین نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ لغت عرب میں کہا جاتا ہے:

ضحك الارانب۔

یعنی۔ خرگوش کی ماہواری شروع ہوگئی۔

لیکن مختصر پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ احتمال بعید معلوم ہوتا ہے کیوں کہ: اولاً یہ نہیں سنا گیا کہ مادہ لغت عرب میں انسان کے بارے میں استعمال ہوا ہے، اسی لئے راغب نے مفردات میں جب یہ معنی ذکر کیا ہے تو صراحت سے کہا ہے کہ یہ لفظ ”ضحکت“ کی تفسیر نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے بلکہ اس لفظ کا معنی ہنسنے ہی ہے لیکن ہنسنے ہوئے اسے ماہواری بھی شروع ہوگئی اور یہ دونوں چیزیں آپس میں خلط ملط ہوگئیں۔

ثانیاً اگر یہ لفظ ایام ماہواری شروع ہونے کے بارے میں ہوتو پھر سارا کو اس کے بعد اسحاق کی بشارت پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے تھا کیوں کہ اس حالت میں بچہ جننا کوئی عجیب بات نہیں ہے، حالانکہ اسی آیت کے بعد والے جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف تعجب کیا بلکہ پکار کر کہا کہ وائے ہو مجھ پر کیا ممکن ہے کہ میں بوڑھی عورت بچہ جنوں؟

بہرحال یہ احتمال آیت کی تفسیر سے بہت بعید نظر آتا ہے۔

قرآن مزید کہتا ہے: اس کے بعد ہم نے اسے بشارت دی کہ اس سے اسحاق پیدا ہوگا اور اسحاق کے بعد اسحاق سے یعقوب

ہوگا ( فَبَشِّرْ نَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يُعْقُوبَ ) -

در حقیقت انہیں بیٹے کی بشارت بھی دی گئی اور پوتے کی بھی، ایک اسحاق اور دوسرا یعقوب، جو دونوں انبیاء خدا میں سے تھے -

ابراہیم کی بیوی سارا جو اپنی اور اپنے شوہر کی زیادہ عمر کی وجہ سے بچے کی پیدائش سے بہت مایوس اور ناامید ہو چکی تھیں ”بڑے تعجب آمیز لہجے میں پکاری: اے وائے ہو مجھ پر میں بچہ جنوں گی جب کہ میں بوڑھی ہوں اور میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، یہ بہت ہی عجیب معاملہ ہے ( قَالَتْ يَا وَيْلَتَا أَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ ) - وہ حق بجانب تھی کہ تعجب کرتی کیونکہ اول تو سورہ ذارعات کی آیہ ۲۹ کے مطابق وہ جوانی میں ہی بانجھ تھی اور ثانیاً جس روز اسے یہ خوشخبری دی گئی مفسرین کے بقول اور تورات کے سفر تکوین کے مطابق وہ نوے سال یا اس سے بھی زیادہ عمر کی تھی اور اس کے شوہر ابراہیم (علیہ السلام) اس وقت تقریباً سو سال یا اس سے بھی زیادہ عمر کے تھے - یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ سارا نے اپنے بڑھاپے سے بھی استدلال کیا اور اپنے شوہر کے بڑھاپے سے بھی حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ عورتوں کو عام طور پر پچاس سال کی عمر سے خون حیض بند ہو جاتا ہے کہ جو کہ بچہ جننے کے قابل نہ ہونے کی نشانی ہے، یہ عادت منقطع ہو جاتی ہے تو پھر اس کے بعد ان سے بچہ پیدا ہونے کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے لیکن طبی تجربات نشان دہی کرتے ہیں کہ مردوں میں باپ ہونے کے لئے لطفے کی صلاحیت زیادہ عمر میں بھی باقی رہتی ہے لیکن اس سوال کا جواب واضح ہے کہ اگرچہ مردوں میں اس کا امکان باقی رہتا ہے لیکن بہر صورت اس کے بارے میں بھی بہت زیادہ سن میں یہ احتمال کمزور پڑ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سورہ حجر کی آیہ ۵۴ کے مطابق اس بشارت پر خود حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے بڑھاپے کی وجہ سے تعجب کیا -

علاوہ ازیں نفسیاتی طور پر بھی شاید سارا نہیں چاہتی تھی کہ جرم ضعیفی صرف اپنی گردن پر لے لے -

بہر حال خدا نے بھیجے ہوئے فوراً اسے اس تعجب سے نکالا اور اس خاندان پر خدا تعالیٰ کی جو پہلے سے بہت زیادہ نعمتیں رہی ہیں اور جس طرح سے خدا انہیں حوادث کے چنگل سے معجزانہ طور پر نجات دلاتا رہا ہے اسے یاد دلایا اور اس سے کہا: کیا فرمان خدا پر تعجب کرتی ہو ( قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ )، حالانکہ خدا کی رحمت اور اس کی برکات تم اہل بیت پر تھیں اور ہیں (رَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ)، وہی خدا جس نے ابراہیم کو نمرود جیسے ظالم کے چنگل سے نجات بخشی اور آگ میں صحیح و سالم رکھا، وہ خدا جس نے بہادر بت شکن ابراہیم کو جب کہ اس نے تن تنہا طاغوتوں پر حملہ کیا ہمت، طاقت، استقامت اور عقل و دانائی عطا کی (3) یہ رحمت و فیضان الہی صرف اس روز اور اس دور کے لئے نہ تھا بلکہ اس خاندان پر اسی طرح جاری و ساری تھا اور ہے، پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اور ائمہ اہل بیت (علیہ السلام) سے بڑھ کر کیا برکت ہوگی جو کہ اس خاندان میں ظہور پذیر ہوئے -

یہاں مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ انسان کی بیوی بھی ”اہل بیت“ کے مفہوم میں داخل ہے، اور یہ لفظ اولاد اور ماں باپ کے لئے مخصوص نہیں ہے، یہ استدلال صحیح ہے بلکہ اگر یہ آیت نہ بھی ہوتی تو لفظ ”اہل“ کے مفہوم کے لحاظ سے یہ معنی درست ہے لیکن کوئی مانع نہیں کہ کچھ لوگ اہل بیت پیغمبر کا حصہ ہوں لیکن الگ مکتب و مذہب پر کاربند ہونے کی وجہ سے روحانی اعتبار سے اور معنوی لحاظ سے اہل بیت سے خارج ہو جائیں -

( اس کی مزید تشریح انشاء اللہ سورہ احزاب کی آیہ ۳۳ میں آنے گی )

آیت کے آخر میں فرشتوں نے زیادہ تاکید کے لئے کہا: ”وہ ایسا خدا ہے جو حمید اور مجید ہے“ ( إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ) -

در اصل پروردگار کی ان دو صفات کا ذکر گزشتہ جملے کی دلیل ہے کیونکہ ”حمید“ اسے کہتے ہیں جس کے اعمال قابل تعریف ہوں، خدا کا یہ نام اس کی فراوان نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ اپنے بندوں پر روا رکھتا ہے کہ جن کے جواب میں وہ اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں، نیز ”مجید“ اسے کہتے ہیں جو استحقاق سے پہلے بھی نعمت بخشتا ہے، کیا وہ خدا جو ان صفات کا حامل ہے اس سے عجیب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے خاندان کو ایسی نعمت (یعنی ابرو مند اولاد) عطا فرمائے -

.....

- 1- تفسیر نمونہ، ج ۷، ص ۱۱۳ (اردو ترجمہ) پر بھی کچھ توضیحات آئی ہیں جو ایسی آیات سے فہم مقصود کے لئے موثر ہیں، قارئین کرام! اس سلسلے میں کتاب ”آفریدگار جہان“ اور ”در جستجوی خدا“ کی طرف رجوع کریں -
- 2- اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ، ج ۶، ص ۲۱۰، (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں -
- 3- ممکن ہے ”رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم“ جملہ خریہ ہو اور اس مقام پر یہ بھی امکان ہے کہ یہ دعا نہ پہلو رکھتا ہو لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے -

۷۴ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ  
 ۷۵ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ.  
 ۷۶ يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ۔

ترجمہ

۷۴۔ جب ابراہیم کا خوف جاتا رہا اور اسے بشارت مل گئی تو ہمارے ساتھ قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگا۔  
 ۷۵۔ کیونکہ ابراہیم بردبار، ہمدرد اور (خدا کی طرف) بازگشت کرنے والا تھا۔  
 ۷۶۔ اے ابراہیم! اس سے صرف نظر کر لے کہ تیرے پروردگار کا فرمان آپہنچا اور (خدا کا) عذاب قطعی طور پر ان پر آئے گا اور وہ پلٹ نہیں سکتا۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابراہیم (علیہ السلام) بہت جلد نوازد مہمانوں کے بارے میں جان گئے کہ وہ خطرناک دشمن نہیں بلکہ پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں اور کود انہی کے بقول ایک ذمہ داری کی انجام دہی کے لئے قوم لوط کی طرف جارہے ہیں۔

ان کی طرف سے جب ابراہیم (علیہ السلام) کی پریشانی ختم ہوگئی اور ساتھ ہی انہیں صاحبِ شرف فرزند اور جانشین کی بشارت مل گئی تو فوراً وہ قوم لوط کی فکر میں پڑ گئے جن کی نابودی پر وہ فرستادگان مامور تھے، وہ اس سلسلے میں ان سے جھگڑنے لگے اور بات چیت کرنے لگے ( فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ )۔ (۱)  
 ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ایک آلودہ گناہ قوم کے بارے میں کیوں گفتگو کے لئے کھڑے ہو گئے اور پروردگار کے اس رسولوں کے ساتھ کہ جو فرمان خدا سے مامور تھے جھگڑنے لگے (یہی وجہ ہے کہ ”یجادلنا“ کی تعبیر استعمال ہوئی یعنی ہم سے مجادلہ کرتے تھے) حالانکہ ایسا ایک پیغمبر کی شان سے اور وہ بھی ابراہیم (علیہ السلام) جیسے باعظمت پیغمبر سے بعید ہے۔

اسی لئے قرآن فوراً بعد والی آیت میں کہتا ہے: ابراہیم بردبار، بہت مہربان، خدا پر توکل کرنے والا اور اس کی طرف بازگشت کرنے والا ہے (إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ)۔ (2)

دو اصل ان تین لفظوں میں مذکورہ سوال کا جواب دیا گیا ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے لئے ان صفات کا ذکر نشاندہی کرتا ہے کہ ان کا مجادلہ اور جھگڑنا ممدوح اور قابل تعریف ہے، یہ اس لئے کہ ابراہیم (علیہ السلام) پر یہ واضح نہیں تھا کہ خدا کی طرف سے عذاب کا قطعی فرمان صادر ہوچکا ہے، انہیں احتمال تھا کہ قوم کی نجات کے لئے ابھی امید کی کرن باقی ہے اور ابھی احتمال ہے کہ وہ بیدار ہو جائے لہذا ابھی شفاعت کا موقع باقی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سزا اور عذاب میں تاخیر کے خواستگار ہوئے کیونکہ وہ حلیم، اور بردبار تھے، وہ بہت مہربان بھی تھے اور ہر موقع پر خدا کی طرف رجوع کرنے والے بھی تھے۔

لہذا یہ جو بعض نے کہا کہ اگر ابراہیم (علیہ السلام) کا مجادلہ خدا کے ساتھ تھا تو اس کا کوئی معنی نہیں ہے اور اگر اس کے بھیجے ہوئے فرشتوں کے ساتھ تھا تو وہ بھی اپنی طرف سے کوئی کام انجام نہیں دے سکتے تھے اس لئے یہ مجادلہ کسی صورت میں صحیح نہیں ہوسکتا، اس کا جواب یہ ہے کہ ایک قطعی حکم کے مقابلے میں تو بات نہیں ہوسکتی لیکن غیر قطعی فرامین، شرائط وکوائف میں تبدیلی کی سورت میں بدلے جاسکتے ہیں کیونکہ ان میں بازگشت اور رجوع کی راہ بند نہیں ہوتی، دوسرے لفظوں میں ایسے فرامین مشروط ہوتے ہیں ناکہ مطلق۔

باقی رہا یہ احتمال کہ یہاں مجادلہ مومنین کی نجات کے لئے تھا تو یہاں سورہ عنکبوت کی آیت ۳۱، اور ۳۲ سے اشتباہ ہوا ہے جہاں فرمایا گیا ہے:



جب ہمارے رسول بشارت لے کر ابراہیم کے پاس آئے تو کہا: ہم اس بستی (قوم لوط کا شہر) والوں کو ہلاک کر دیں گے کیونکہ اس کے باسی ظالم ہیں، ابراہیم نے کہا: وہاں تو لوط رہتا ہے، انہوں نے کہا: ہم وہاں رہنے والوں سے بہت آگاہ ہیں، اسے اور اس کے خاندان کو ہم نجات دیں گے سوائے اس کی بیوی کے کہ جو قوم میں ہی رہے گی۔ یہ احتمال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بعد والی آیت سے کسی طرح مناسبت نہیں رکھتا، جس کے بارے میں ابھی ہم بحث کریں گے۔

بعد والی آیت میں ہے: رسولوں نے فوراً ابراہیم (علیہ السلام) سے کہا: اے ابراہیم! اس تجویز سے صرف نظر کرو اور شفاعت رہنے دو کیونکہ یہ اس کا موقع نہیں ہے (يَا اِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا)، کیونکہ تیرے پروردگار کا حتمی اور یقینی فرمان آپہنچا ہے (اِنَّهٗ قَدْ جَاءَ اَمْرٌ رَبِّكَ)، اور خدا کا عذاب بلاکلام ان پر آکر رہے گا (وَاِنَّهُمْ اَتَيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ)۔ ”ربک“ (تیرا رب) یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ یہ عذاب نہ سرف یہ کہ انتقامی حوالے سے نہیں تھا بلکہ اس کا سرچشمہ پروردگار کی صفت ربوبیت ہے جو بندوں کی تربیت و پرورش اور اجتماع انسانی کی اصلاح کی نشانی ہے۔

یہ بعض روایات میں ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے خدا کے رسولوں سے کہا: اگر قوم میں سو مومن افراد ہوئے تو پھر بھی ہلاک نہیں کرو گے؟ اس پر انہوں نے کہا: نہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے پوچھا: اگر پچاس افراد ہوئے؟ تو وہ کہنے لگے: نہیں، پوچھا: اگر تیس ہوئے؟ وہ بولے: نہیں، کہا اگر دس ہوئے؟ وہ کہنے لگے: نہیں، پوچھا: اگر پانچ ہوئے؟ انہوں نے کہا: نہیں، یہاں تک کہ پوچھا کہ: اگر ایک شخص بھی ان میں صاحب ایمان ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں، اس پر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: یقیناً لوط تو ان کے درمیان ہیں، انہوں نے جواب دیا: ہم خوب جانتے ہیں اسے اور اس کی بیوی کے سوا اس کے خاندان کو ہم نجات دیں گے۔ (3)

یہ روایت کسی طرح اس بات کی دلیل نہیں کہ مجادلہ سے مراد یہ گفتگو تھی بلکہ یہ گفتگو تو مومنین کے بارے میں تھی، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جو گفتگو کفار کے بارے میں کی وہ اس سے جدا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ سورہ عنکبوت کی مذکورہ آیات بھی اس تفسیر کے منافی نہیں ہے (غور کیجئے گا)

.....

- ۱۔ ”روع“ (بروزن ”نوع“) خوف و وحشت کے معنی میں ہے اور ”روع“ (بروزن ”نوح“) روح یا لوح کے ایک حصے کے معنی میں ہے جو خوف و وحشت کے نزول کا مرکز ہے (قاموس اللغت کی رجوع کریں)۔
- ۲۔ ”حلم“، ”حلم“ سے ہے، اس کا معنی ایک مقدس ہدف تک پہنچنے کے لئے بردباری اختیار کرنا اور ”آواہ“ اصل میں اس شخص کے معنی میں ہے جو بہت آہیں بھرتا ہو چاہے اپنی ذمہ داریوں کے خوف سے یا لوگوں کو گھیرے ہوئے مشکلات و مصائب کی وجہ سے اور ”منیب“، ”انابہ“ کے مادہ سے رجوع اور بازگشت کرنے کے معنی میں ہے۔
- ۳۔ تفسیر پرہان، ج ۲، ص ۲۲۶۔

۷۷ وَمَا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِوَىٰ هٰذَا بِهٖمْ وَّضَاقَ بِهٖمْ دَرْعًا وَقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ.

۷۸ وَجَاءَتْهٗ قَوْمُهٗ بُهْرًا عِوًا اِلَيْهٖ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ قَالَ يٰقَوْمِ هٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاَنْقُوْا اللّٰهَ وَلَا تَحْزَنُوْا فِىْ ضَعْفِى اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ.

۷۹ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا لَنَا فِىْ بَنَاتِكُمْ مِنْ حَقٍّ وَّاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَّا تُرِيْدُ.

۸۰ قَالَ لَوْ اَنْ لِّىْ بِكُمْ قُوَّةٌ اَوْ اٰوٰى اِلَى رُكْنٍ شَدِيْدٍ.

ترجمہ

۷۷ جب ہمارے رسول لوط کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے ناراحت ہوا اور اس کا دل پریشان ہوا اور کہا کہ آج کا دن سخت ہے۔

۷۸۔ اور اس کی قوم جلدی سے اس کے پاس آئی اور وہ پہلے سے برے کام انجام دیتی تھی، اس نے کہا: اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں جو تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں (ان سے ازدواج کرو اور برے اعمال چھوڑ دو) خدا سے ڈرو اور مجھے میری مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو، کیا تمہارے درمیان جو کوئی مرد رشید نہیں؟

۷۹۔ وہ کہنے لگے: تو جانتا ہے کہ ہم تیری بیٹیوں کے لئے حق (اور میلان) نہیں رکھتے اور تو اچھی طرح جانتا ہے ہم کیا چاہتے ہیں۔

۸۰۔ کہا (افسوس) اے کاش! میں تمہارے مقابلے میں کوئی طاقت رکھتا یا کوئی محکم سہارا اور مددگار مجھے میسر ہوتا

(تو اس وقت میں دیکھتا کہ تم جیسے برے لوگوں سے کیا سلوک کروں)۔

قوم لوط کی شرمناک زندگی

سورہ اعراف کی آیات میں قوم لوط کی سرنوشت کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی تفسیر ہم وہاں پیش کر چکے ہیں، یہاں انبیاء اور ان کی قوموں کی داستانوں کا سلسلہ جاری ہے، اسی مناسبت سے گزشتہ کچھ آیات حضرت لوط (علیہ السلام) اور ان کی قوم کی سرگزشت سے تعلق رکھتی تھیں، زیر نظر آیات میں اس گمراہ اور منحرف قوم کی زندگی کے ایک اور حصے سے پردہ اٹھایا گیا ہے تاکہ سارے انسانی معاشرے کی نجات و سعادت کے اصلی مقصد کو ایک اور زاوے سے پیش کیا جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جب ہمارے رسول لوط کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے پر بہت ہی ناراحت اور پریشان ہوئے، ان کی فکر اور روح مضطرب ہوئی اور غم و انداہ نے انہیں گھیر لیا (وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا)۔ اسلامی روایات اور تفاسیر میں آیا ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) اس وقت اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے اچانک انہوں نے خوبصورت نوجوانوں کو دیکھا جو ان کی طرف آرہے تھے، وہ ان کی ہاں مہمان ہونا چاہتے تھے، اب حضرت لوط (علیہ السلام) مہمانوں کی پذیرائی بھی چاہتے تھے لیکن اس حقیقت کی طرف بھی ان کی توجہ تھی کہ ایسے شہر میں جو انحراف جنسی کی آلودگی میں غرق ہے ان خوبصورت نوجوانوں کا انا طرح طرح کے مسائل کا موجب ہے اور ان کی آبرو ریزی کا بھی احتمال ہے، اس وجہ سے حضرت لوط (علیہ السلام) سخت مشکل سے دوچار ہو گئے، یہ مسائل روح فرسا افکار کی صورت میں ان کے دماغ میں ابھرے اور انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے آپ سے کہنا شروع کیا: آج بہت سخت اور وحشتناک دن ہے (وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ)۔

”سیء“ مادہ ”ساء“ سے ناراحت و پریشان ہونے کے معنی میں ہے۔

”ذرع“ کو بعض نے دل اور بعض نے خُلق کے معنی میں لیا ہے، اس بنا پر ”ضاق بہم ذرعاً“ کا مفہوم ہے: ان کا دل یا خُلق ان کے بن بلائے مہمانوں کے باعث ان سخت حالات میں بہت پریشان ہوا۔

لیکن فخر رازی نے اپنی تفسیر میں ازبری سے نقل کیا ہے کہ ایسے موقع پر ”ذرع“ طاقت کے معنی میں ہے، اور اصل میں اس کا مطلب ہے ”چلتے وقت اونٹ کے اگلے قدموں کے درمیان کا فاصلہ“۔

فطری اور طبعی امر ہے جب اونٹ کی پشت پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادیں تو وہ مجبوراً اپنے اگلے پاؤں کو زیادہ نزدیک کر کے رکھے گا اور چلتے وقت ان کے درمیان فاصلہ کم ہوگا، اسی مناسبت سے یہ تعبیر تدریجاً کسی حادثے کی سنگینی کی وجہ سے ہونے والی ناراحتی اور پریشانی کے معنی میں استعمال ہونے لگی۔ بعض کتب لغت مثلاً ”قاموس“ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعبیر ایسے مواقع پر استعمال ہوتی ہے جہاں حادثے کی شدت اتنی ہو کہ انسان کو کوئی چارہ کار سجھائی نہ دے۔

”عصیب“ ”عصب“ (بروزن ”اسپ“) کے مادہ سے ہے، اس کا معنی ہے کسی چیز کو ایک دوسرے سے باندھنا، سخت ناراحت کرنے والے حوادث چونکہ انسان کو ایک طرح سے لپیٹ دیتے ہیں اور گویا ناراحتی سے باندھ دیتے ہیں لہذا اس صورت حال پر ”عصیب“ کا اطلاق ہوتا ہے، نیز عرب گرم اور جلانے والے دن کو بھی ”یوم العصیب“ کہتے ہیں۔ بہر حال حضرت لوط (علیہ السلام) کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنے نووارد مہمانوں کے گھر لے جاتے لیکن اس بناء پر کہ وہ غفلت میں نہ رہیں راستے میں چند مرتبہ ان کے گوش گزار کر دیا کہ اس شہر میں شریر اور منحرف لوگ رہتے ہیں تاکہ اگر مہمان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو صورت حال کا اندازہ کر لیں۔

ایک روایت میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ جب تک یہ بیغمبر تین مرتبہ اس قوم کی برائی اور انحراف کی گواہی نہ دے انہیں عذاب نہ دیا جائے (یعنی۔ یہاں تک کہ ایک گنہگار قوم سے متعلق بھی حکم خدا عدالت کے ایک

عادلانہ فیصلے کی روشنی میں انجام پائے) اور ان رسولوں نے راستے میں تین مرتبہ لوط کی گواہی سن لی۔ (۱)

کئی ایک روایات میں آیا ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) نے مہمانوں کو اتنی دیر تک (کھیت میں) ٹھہرائے رکھا کہ رات ہو گئی تاکہ شاید اس طرح اس شریر اور آلودہ قوم کی آنکھ سے بچ کر حفظ آبرو کے ساتھ ان کی پذیرائی کر سکیں، لیکن جب ان کا دشمن خود اس کے گھر کے اندر موجود ہوتو پھر کیا کیا جاسکتا، لوط (علیہ السلام) کی بیوی کو جو ایک بے ایمان عورت تھی اور اس گنہگار قوم کی مدد کرتی تھی جب اسے ان نوجوانوں اور خوبصورت مہمانوں کے آنے کی خبر ہوئی تو چھت پر چڑھ گئی، پہلے اس نے تالی بجائی پھر آگ روشن کر کے اس کے دھوئیں کے ذریعے ان نے منحرف قوم کے بعض لوگوں کو آگاہ کیا کہ لقمہ تر جال میں پھنس چکا ہے۔ (۲)

یہاں قرآن کہتا ہے کہ وہ قوم حرص اور شوق کے عالم میں اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے بڑی تیزی سے لوط (علیہ

السلام) کی طرف آئی ( وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ ) -

وہی قوم کہ جس کی زندگی کے صفحات سیاہ اور ننگ و عار سے آلودہ تھے ”اور جو پہلے ہی سے برے اور قبیح اعمال انجام دی رہی تھی“ ( وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ )

حضرت لوط (علیہ السلام) اس وقت حق رکھتے تھے کہ لرزنے لگیں اور ناراحتی و پریشانی کی شدت سے چیخ و پکار کریں، انہوں نے کہا: میں یہاں تک تیار ہوں کہ اپنی بیٹیاں تمہارے نکاح میں دے دوں، یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں (قَالَ يَا قَوْمِ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ)

اُو اور خدا سے ڈرو، میری عزت و آبرو خاک میں نہ ملاؤ اور میرے مہمانوں کے بارے میں برا ارادہ کر کے مجھے رسوا نہ کرو“ ( فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِي فِي صَيْفِي ) -

اے وائے ”کیا تم میں کوئی رشید، عقلمند اور شائستہ انسان موجود نہیں ہے“ کہ جو اس ننگین اور شرمناک عمل سے روکے (أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ) -

مگر تباہ کار قوم نے نبی خدا حضرت لوط (علیہ السلام) کو بڑی بے شرمی سے جواب دیا: ”تو خود اچھی طرح جانتا ہے کہ ہمارا تیری بیٹیوں میں کوئی حق نہیں“ (قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكِ مِنْ حَقٍّ) ”اور یقیناً تو جانتا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں“ - (3) -

یہ وہ مقام تھا کہ اس بزرگوار پیغمبر نے اپنے آپ کو ایک محاصرے میں گھرا ہوا پایا اور انہوں نے ناراحتی و پریشانی کے عالم میں فریاد کی: اے کاش! مجھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ میں اپنے مہمانوں کا دفاع کر سکتا اور تم جیسے سرپھروں کی سرکوبی کر سکتا ( قَالَ لَوْ أَنِّي لِي بِكُمْ قُوَّةٌ )، یا کوئی مستحکم سہارا ہوتا، کوئی قوم و قبیلہ میرے پیروکاروں میں سے ہوتا اور میرے کوئی طاقتور ہم پیمان ہوتے کہ جن کی مدد سے تم منحرف لوگوں کا مقابلہ کرتا ( أَوْ آوَى إِلَيَّ رَجُلٌ شَدِيدٌ )

۱. مجمع البیان، مکرورہ آیت کے ذیل میں -

۲. المیزان، ج ۱، ص ۳۶۲ -

3. ”يُهْرَعُونَ“ ”اھراع“ کے مادہ سے دھکیلنے کے معنی میں ہے، گویا سرکش جنسی خواہش اس گمراہ قوم کو بٹی شدت سے حضرت لوط (علیہ السلام) کے مہمانوں کی طرف دھکیل رہی تھی -

چند قابل توجہ نکات

۱. حضرت لوط (علیہ السلام) کی بیٹیاں:

جس وقت قوم لوط نے حضرت لوط (علیہ السلام) کے گھر پر ہجوم کیا اور وہ ان کے مہمانوں پر تجاوز کرنا چاہتے تھے اس وقت آپ نے کہا: میری بیٹیاں تمہارے لئے پاک اور حلال ہیں، ان سے استفادہ کرو اور گناہ کے گرد چکر نہ لگاؤ۔

اس جملے نے مفسرین کے درمیان بہت سے سوالات اٹھا دئے ہیں -

پہلا یہ کہ بیٹیوں سے مراد کیا لوط (علیہ السلام) کی نسبی اور حقیقی بیٹیاں تھیں جب کہ تاریخ کے مطابق ان کی دو یا تین سے زیادہ بیٹیاں نہیں تھیں، لہذا انہوں نے اتنی کثیر جمعیت کے سامنے یہ تجویز کس طرح سے پیش کی، یا یہ کہ مراد تمام قوم اور شہر کی بیٹیاں تھیں کیونکہ معمول یہ ہے کہ قبیلہ کا بزرگ قبیلے کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں ہی قرار دیتا ہے -

دوسرا احتمال ضعیف نظر آتا ہے کیونکہ خلاف ظاہر ہے اور صحیح وہی پہلا احتمال ہے اور حضرت لوط (علیہ السلام)

کی یہ تجویز اس بنا پر تھی کہ ہجوم کرنے والے بستی کے چند افراد تھے نہ کہ سب کے سب، علاوہ ازیں وہ یہاں انتہائی قربانی کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے کہ میں یہاں تک تیار ہوں کہ گناہ کو روکنے اور اپنے مہمانوں کی عزت اور مرتبے کی حفاظت کے لئے اپنی بیٹیاں تمہارے نکاح میں دے دوں کہ شاید اس بے نظیر قربانی پر ان کے سونے ہوئے ضمیر بیدار

بوجائیں اور وہ راہ حق کی طرف پلٹ آئیں -

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت لوط (علیہ السلام) کی بیٹیوں جیسی باایمان لڑکیوں کی شادی بے ایمان کفار سے جائز تھی کہ آپ نے یہ تجویز پیش کی -

اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے :

ایک یہ کہ اسلام کی حضرت لوط (علیہ السلام) کے دین میں بھی آغاز میں اس قسم کا ازدواج حرام نہیں تھا - دوسرا یہ کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کی مراد مشروط ازدواج تھی (یعنی - مشروط بایمان) یعنی یہ میری بیٹیاں ہیں، او ایمان لے آؤ تاکہ میں انہیں تمہارے نکاح میں دے دوں - یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ نبی خدا حضرت لوط (علیہ السلام) پر یہ اعتراض کہ انہوں نے اپنی پاکیزہ بیٹیوں کے نکاح کی اوباش لوگوں سے تجویز کیونکر کی، درست نہیں ہے کیونکہ ان کی پیش کش مشروط تھی اور اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں ان کی ہدایت سے کس قدر لگاؤ تھا -

## ۲۔ ”اطہر“ کا مفہوم:

توجہ رہے کہ لفظ ”اطہر“ (پاکیزہ تر) کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ ان کا وہ برا اور شرمناک عمل پاک تھا اور ازدواج کرنا اس سے زیادہ پاک تھا بلکہ عربی زبان میں اور دیگر زبانوں میں ایسی تعبیر موازنے کے وقت استعمال میں کی جاتی ہے، مثلاً اگر کوئی شخص تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا ہو تو اسے کہتے ہیں: دیر سے پہنچنا بہتر ہے بالکل نہ پہنچے سے ”یا“ مشکوک غذا نہ کھانا بہتر ہے اس سے کہ انسان اپنی جان خطرے میں ڈال دے - ایک روایت میں بھی ہے کہ امام (علیہ السلام) نے خلفاء بنی عباس کی طرف سے احساس خطر اور شدتِ تقیہ کے موقع پر فرمایا:

واللہ افطریوما من شہر رمضان احب الی من ان یضرب عنقی -

ماہِ رمضان کا ایک دن کہ جب خلیفہ وقت نے عید کا اعلان کیا ہوا تھا حالانکہ اس روز عید نہیں، اس دن افطار کروں (اور پھر اس دن کی قضا کروں) اس سے بہتر ہے کہ مارا جاؤں - (1) حالانکہ نہ مارا جانا اچھا ہے اور نہ مقصد تک بالکل نہ پہنچنا، لیکن ایسے مقامات پر اس طرح کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے -

## ۳۔ ایک مرد رشید، کی نصیحت:

حضرت لوط (علیہ السلام) کا آخر کلام میں یہ کہنا کہ ”کیا تمہارے درمیان کوئی مرد رشید نہیں ہے“ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایک رشید انسان کا کسی قوم یا قبیلے میں ہونا بھی اس کے شرمناک اعمال سے اسے روکنے کے لئے کافی ہوتا ہے، یعنی ایک شخص بھی اگر عاقل اور رشدِ فکر رکھنے والا تمہارے درمیان ہوتا تو تم میرے گھر کی طرف میرے مہمانوں پر تجاوز کرنے کے ارادے سے اور بدنیتی سے ہرگز نہ آتے - اس سے انسانی معاشرے کی رہبری کے لئے ”رجل رشید“ کا اثر واضح ہوتا ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کے بہت سے نمونے ہم نے پوری تاریخ بشر میں دیکھے ہیں -

## ۴۔ انحراف کی انتہا:

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس گمراہ قوم نے حضرت لوط (علیہ السلام) سے کہا: ہم تیری بیٹیوں پر حق نہیں رکھتے یہ امر اس گروہ کی انتہائی انحراف کو ظاہر کرتا ہے یعنی گناہ میں ڈوبا ہوا ایک معاشرہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے، انہوں نے پاک و پاکیزہ صاحبِ ایمان لڑکیوں سے ازدواج کو بالکل قلمرو حق میں شمار نہیں کیا لیکن اس کے برعکس جنسی انحراف کو اپنا حق شمار کیا - گناہ کی عادت اور خو ہو جائے تو یہ مرحلہ اس قدر خطرناک مراحل میں سے ہے کہ یہاں پہنچ کر افراد شرمناک ترین اور قبیح ترین اعمال کو اپنا حق شمار کرتے ہیں اور پاکیزہ ترین طریقے سے جنسی تقاضوں کی تسکین کو ناحق سمجھتے ہیں -

## ۵۔ ”قوة“ اور ”رکن شدید“ کا مفہوم:

ایک حدیث میں امام صادق (علیہ السلام) سے مروی ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں فرمایا: ”قوة“ سے مراد وہی ”قائم“ ہے اور ”رکن شدید“ ان کے ۳۱۳ پار و انصار ہیں - (2)

ہوسکتا ہے یہ روایت عجیب معلوم ہو کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں حضرت لوط (علیہ السلام) ایسی شخصیت کی ایسے یار و انصار کے ساتھ ظہور کی آرزو کریں، لیکن جو روایات آیات قرآن کی تفسیر کے ذیل میں اب تک آئیں ہیں انہوں نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ عام طور پر ایک کلی قانون کو اس کے واضح مصداق کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے، دراصل حضرت لوط (علیہ السلام) یہ آرزو کرتے ہیں کہ اے کاش! مصمم ارادوں والے، جسمانی اور روحانی طور پر طاقتور کافی

تعداد میں مرد ہوتے ان کے مردوں کی طرح جو قیام مہدی (علیہ السلام) کے زمانے میں عالمی حکومت تشکیل دیں گے تو میں بھی حکومت الہی کی تشکیل کے لئے کام کرتا اور ان کی مدد سے فساد و انحراف کے خلاف جہاد کرتا اور اس قسم کے سرپہرے اور بے شرم افراد کی سرکوبی کرتا۔

1- وسائل، ج ۷، ص ۹۵۔

2- تفسیر برہان، ج ۲، ص ۲۲۸۔

## تفسیر نمونہ جلد 09

۸۱ قَالُوا يَا لَوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصِلُوا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرًا تَكُ إِتَهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ  
إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ۔  
۸۲ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَابًا مِّنْ سَجَابِلٍ مِّنْ مَّوَدِّ  
۸۳ مُسَوِّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ۔

ترجمہ

۸۱۔ انہوں نے کہا: اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے رسول ہیں، وہ ہرگز تجھ پر دسترس حاصل نہیں کر سکیں گے، وسط شب اپنے خاندان کے ساتھ (اس شہر سے) چلا جا اور تم میں سے کوئی بھی اپنی پشت کی طرف نگاہ نہ کرے، مگر تیری بیوی کہ وہ اسی بلا میں گرفتار ہوگی کہ جس میں لوگ گرفتار ہوں گے، ان کی وعدہ گاہ صبح ہے، کیا صبح نزدیک نہیں ہے۔  
۸۲ جب ہمارا فرمان آپنچا تو اس (شہر اور علاقے) کو ہم نے نہ وبالا کر دیا اور ان پر ہم نے مثیلے پتھروں کی بارش کی۔  
۸۳۔ (وہ پتھر کہ) جو تیرے پروردگار کے ہاں مخصوص تھے اور ایسا ہونا ستمگروں کے لئے بعید نہیں ہے۔

ظالموں کی زندگی کا اختتام

آخر کار پروردگار کے رسولوں نے حضرت لوط (علیہ السلام) کی شدید پریشانی دیکھی اور دیکھا کہ وہ روحانی طور پر کس اضطراب کا شکار ہیں تو انہوں نے اپنے اسرارِ کار سے پردہ اٹھایا اور ان سے ”کہا: اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، پریشان نہ ہو، مطمئن رہو کہ وہ ہرگز تجھ پر دسترس حاصل نہیں کر سکیں گے“

(قَالُوا يَا لَوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصِلُوا إِلَيْكَ)۔

یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ خدا کے فرشتے یہ نہیں کہتے کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ کہتے ہیں کہ اے لوط! یہ تجھ پر دسترس حاصل نہیں کر سکیں گے کہ تجھے کوئی نقصان پہنچے۔  
یہ تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ اپنے آپ کو لوط (علیہ السلام) سے جدا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ بہر حال وہ انہی کے مہمان تھے اور ان کی ہتکِ حرمت حضرت لوط (علیہ السلام) کی ہتکِ حرمت تھی یا یہ اس بنا پر کہ وہ حضرت لوط (علیہ السلام) پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ ہم خدا کے فرستادہ ہیں اور ہم تک ان کی دسترس نہ ہونا تو مسلم ہے یہاں تک کہ تو جو ان کا ہم نوع ہے تجھ تک بھی یہ نہیں پہنچ سکیں گے۔  
سورہ قمر کی آیہ ۳۷ میں ہے:

وہ لوط کے مہمانوں کے بارے میں تجاوز کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔  
یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ اس وقت حملہ آور قوم پروردگار کے ارادے سے اپنی بینائی کھو بیٹھی تھی اور حملے کی

طاقت نہیں رکھتی تھی، بعض روایات میں بھی ہے کہ ایک فرشتے نے مٹھی بھر مٹی ان کے چہروں پر پھینکی، جس سے وہ نابینا ہو گئے۔

بہر حال حضرت لوط (علیہ السلام) اپنے مہمانوں کے بارے میں ان کی ماموریت کے بارے میں آگاہ ہوئے تو یہ بات اس عظیم پیغمبر کے جلتے ہوئے دل کے لئے ٹھنڈک کے مانند تھی، ایک دم انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے دل سے گم کا بار گرا ختم ہو گیا اور ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی، ایسا ہوا جیسے ایک شدید بیمار کی نظر مسیح پر چاڑھے، انہوں نے سکہ کا سانس لیا اور سمجھ گئے کہ غم و اندوہ کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور بے شرم حیوان صفت قوم کے چنگل سے نجات پانے کا اور خوشی کا وقت آ پہنچا ہے۔

مہمانوں نے فوراً حضرت لوط (علیہ السلام) کو حکم دیا: تم اسی رات تاریکی شب میں اپنے خاندان کو اپنے ساتھ لے لو اور سرزمین سے نکل جاؤ (فَاسْرِبْ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ)۔ (۱)

لیکن یہ پابندی ہے کہ ”تم میں سے کوئی شخص پس پشت نہ دیکھے“ (وَلَا يَلْتَمِسْ مِنْكُمْ أَحَدٌ)، اس حکم کی خلاف ورزی فقط تمہاری معصیت کار بیوی کرے گی کہ جو تمہاری گنہگار قوم کو پہنچنے والے مصیبت میں گرفتار ہوگی (إِلَّا أَمْرًا تَكُنْ مِنْهُ مُصِيبًا مَا أَصَابَهُمْ)۔

”وَلَا يَلْتَمِسْ مِنْكُمْ أَحَدٌ“ کی تفسیر میں مفسرین نے چند احتمال ذکر کئے ہیں:

پہلا یہ کہ کوئی شخص پس پشت نہ دیکھے۔

دوسرا یہ کہ شہر میں مال اور وسائل لے جانے کی فکر نہ کرے بلکہ صرف اپنے آپ کو اس ہلاکت سے نکال لے جائے۔ تیسرا یہ کہ اس خاندان کے اس چھوٹے سے قافلے میں سے کوئی شخص پیچھے نہ رہ جائے۔ چوتھے یہ کہ تمہارے نکلنے کے وقت زمین ہلنے لگے گی اور عذاب کے آثار نمایاں ہو جائیں گے لہذا اپنے پس پشت نگاہ نہ کرنا اور جلدی سے دور نکل جانا۔

البتہ کوئی مانع نہیں کہ یہ سب احتمالات اس آیت کے مفہوم میں جمع ہوں۔ (۲)

پہلا یہ کہ ”وَلَا يَلْتَمِسْ مِنْكُمْ أَحَدٌ“ سے استثناء ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) ان کا خاندان، یہاں تک کہ ان کی بیوی بھی سب شہر سے باہر کی طرف نکلے اور کسی نے بھی رسولوں کے فرمان کے مطابق پس پشت نگاہ نہ کی سوائے حضرت لوط (علیہ السلام) کی بیوی کے کیونکہ اسے اپنی قوم سے بڑا لگاؤ اور دلی وابستگی تھی اور وہ ان کے انجام سے پریشان تھی، وہ لحظہ بھر کے لئے رکی اور پس پشت دیکھا، ایک روایت کے مطابق شہر پر برسنے والے پتھروں میں سے ایک پتھر اسے لگا اور اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”فاسر باہلک“ سے استثناء ہے یعنی اپنی بیوی کے سوا تمام خاندان کو ساتھ لے جاؤ، اس صورت میں لوط (علیہ السلام) کی بیوی شہر ہی میں رہ گئی تھی، البتہ پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بالآخر انہوں نے لوط (علیہ السلام) سے آخری بات کہی: نزولِ عذاب کا لمحہ اور وعدہ کی تکمیل کا موقع صبح ہے اور صبح کی پہلی شعاع کے ساتھ ہی اس قوم کی زندگی تباہ ہو جائے گی (إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ)۔ ابھی اٹھ کھڑے ہو اور جتنا جلدی ممکن ہو شہر سے نکل جاؤ ”کیا صبح نزدیک نہیں ہے“ (أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ)۔

بعض روایات میں ہے کہ جب ملائکہ نے کہا کہ عذاب کے وعدہ پر عملدار آمد صبح کے وقت تو حضرت لوط (علیہ السلام) کو جو اس آلودہ قوم سے سخت ناراحت اور پریشان تھے، وہی قوم کہ جس نے اپنے شرمناک اعمال سے ان کا دل مجروح کر رکھا تھا اور ان کی روح کو غم و انداہ سے بھر دیا تھا، فرشتوں سے خواہش کی کہ اب جب کہ انہوں نے نابود ہی ہونا ہے تو کیا ہی اچھا ہو کہ جلدی ایسا ہو لیکن انہوں نے حضرت لوط (علیہ السلام) کی دلجوئی اور تسلی کے لئے کہا: کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟

آخر کار عذاب کا لمحہ ان پہنچا اور لوط پیغمبر (علیہ السلام) کا انتظار ختم ہوا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جس وقت ہمارا فرمان آن پہنچا تو ہم نے اس زمین کو زیر و زبر کر دیا اور ان کے سروں پر مٹی لے پتھروں کی پیہم بارش برسانی (فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَابًا مِّنْ سَجِيلٍ مُّنْضُودٍ)۔

”سجیل“ اصل میں فارسی لفظ ہے کہ جو ”سنگ و گِل“ سے لیا گیا ہے، لہذا اس کا مطلب ہے ایسی چیز جو پتھر کی طرح بالکل سخت ہو اور ناہی گیلی مٹی ڈھیلی مٹی کی طرح بالکل ان دونوں کے درمیان ہو۔

”منضود“ کا مادہ ”نضد“ ہے اس کا معنی ہے یکے بعد دیگرے اور بے در پے آنا، یعنی پتھروں کی یہ بارش اس قدر تیز اور بے در پے تھی کہ گویا پتھر ایک دوسرے پر سوار تھے۔

لیکن یہ معمولی پتھر نہ تھے بلکہ تیرے پروردگار کے ہاں معنی اور مخصوص تھے (مُسَوَّمَةٌ عِنْدَ رَبِّكَ)، البتہ یہ تصور نہ کریں کہ یہ پتھر قوم لوط کے ساتھ ہی مخصوص تھے بلکہ ”یہ کسی ظالم قوم اور جمعیت سے دور نہیں ہیں“ (وَمَا هِيَ

مِنَ الظَّالِمِينَ بَعِيدٍ)۔

اس بے راہ رو اور منحرف قوم نے اپنے اوپر بھی ظلم کیا اور اپنے معاشرے پر بھی، وہ اپنی قوم کی تقدیر سے بھی کھیلے اور انسانی ایمان و اخلاق کا بھی مذاق اڑایا، جب ان کے بمردرد رہبر نے داد و فریاد کی تو انہوں نے کان نہ دھرے اور تمسخر اڑایا، اعلیٰ ڈھٹائی، بے شرمی اور بے حیائی یہاں تک اُن پہنچی کہ وہ اپنے رہبر کے مہمانوں کی حرمت و عزت پر تجاوز کے لئے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے ہر چیز کو الٹ کر رکھ دیا، ان کے شہروں کو بھی الٹ جانا چاہیئے تھا، فقط یہی نہیں کہ ان کے شہر تہ و بالا ہوجاتے بلکہ ان پر پتھروں کی بارش بھی ہونا چاہیئے تھی تاکہ ان کے آخری آثارِ حیات بھی درہم برہم ہوجائیں، اور وہ ان پتھروں میں دفن ہوجائیں اس طرح سے کہ ان کا نام و نشان اس سرزمین میں نظر نہ آئے صرف وحشتناک، تباہ و برباد بیابان، خاموش قبرستان اور پتھروں میں دبے ہوئے مردوں کے علاوہ ان میں کچھ باقی نہ رہے۔ کیا صرف قوم لوط کو یہ سزا ملنی چاہیئے، نہیں، یقیناً ہرگز نہیں بلکہ ہر منحرف گروہ اور ستم پیشہ قوم کے لئے ایسا ہی انجام انتظار میں ہے، کبھی سنگریزوں کی بارش کے نیچے، کبھی آگ اگلتے بموں کے نیچے اور کبھی معاشرے کے لئے تباہ کن اختلافات کے تحت، خلاصہ یہ کہ ہر ستمگر کو کسی نہ کسی صورت میں ایسے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

.....

۱۔ ”اسر“ ”اسراء“ کے مادہ سے رات کو چلنے کے معنی میں ہے لہذا لفظ ”لیل“ (رات) اس آیت میں زیادہ تاکید کے لئے اور ”قطع“ رات کی تاریکی کے معنی میں ہے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ رات کے سیاہ پردوں نے تمام جگہوں کو گھیر رکھا ہے اور یہ غافل قوم خوابیدہ یا مست شراب ہوس بازی ہے، چپکے سے ان میں سے نکل جاؤ۔

۲۔ اس بارے میں کہ ”الا امراتک“ میں استثناء کس جملے سے ہے، مفسرین نے دو احتمال ذکر کئے ہیں:

چند قابل توجہ نکات

۱۔ صبح کے وقت نزولِ عذاب کیوں؟

مندرجہ بالا آیات میں غور کرنے سے قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نزولِ عذاب کے لئے صبح کا وقت کیوں منتخب کیا گیا، رات کے وقت ہی عذاب کیوں نازل نہیں ہوا؟

ایسا اس لئے تھا کہ جب حضرت لوط (علیہ السلام) کے گھر پر چڑھ آنے والے افراد اندھے ہو گئے اور قوم کے پاس لوٹ کر گئے اور واقعہ بیان کیا تو وہ کچھ غور و فکر کرنے لگے کہ معاملہ کیا ہے، خدا نے صبح تک انہیں مہلت دی کہ شاید بیدار ہوجائیں اور اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں اور توبہ کریں یا یہ کہ خدا انہیں چاہتا تھا کہ رات کی تاریکی میں ان پر شب خون مارا جائے اسی بنا پر حکم دیا کہ صبح تک مامور عذاب سے ہاتھ روکے رکھیں۔

تفاسیر میں اس کے بارے میں تقریباً کچھ نہیں لکھا گیا لیکن جو کچھ ہم اوپر ذکر کیا ہے وہ اس سلسلے میں چند قابلِ مطالعہ احتمالات ہیں۔

۲۔ زیر وزیر کیوں کیا گیا:

ہم کہہ چکے ہیں کہ عذاب کی گناہ سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہونا چاہیئے، اس قوم نے انحراف جنسی کے ذریعے چونکہ ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیا تھا لہذا خدا نے بھی ان کے شہروں کو بھی زیر وزیر کر دیا، اور چونکہ روایات کے مطابق ان کے منہ سے ہمیشہ رکیک اور گندی گندگی کی بارش ہوتی رہتی تھی لہذا خدا نے بھی ان پر پتھروں کی بارش برسائی۔

۳۔ پتھروں کی بارش کیوں؟

کیا پتھروں کی بارش ان کے شہر زیر وزیر ہونے سے پہلے تھی یا اس کے ساتھ ساتھ یا اس کے بعد، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے اور آیاتِ الہی میں بھی اس سلسلے میں صراحت نہیں ہے کیونکہ یہ جملہ واؤ کے ساتھ عطف ہوا ہے کہ جس ست ترتیب معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن بعض مفسرین مثلاً المنار کا مولف معتقد ہے کہ پتھروں کی بارش یا زیر وزیر ہونے سے پہلے تھی یا ساتھ ساتھ اور اس کا فلسفہ یہ تھا کہ وہ افراد جو ادھر ادھر گوشہ و کنار میں تھے اور ملبے میں دفن نہیں ہوئے تھے وہ صحیح و سالم نہ رہیں اور وہ بھی اپنے برے اعمال کی سزا تک پہنچ جائیں۔

وہ روایت کہ جس میں ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کی بیوی نے آواز سنی تو سر پیچھے کی طرف پھیرا اور اسی

عالم میں اسے پتھر آگاور اسے مار ڈالا، نشاندہی کرتی ہے کہ یہ دونوں امور (زیروزبر ہونا اور پتھروں کی بارش) اکٹھے صورت پذیر ہوئے۔

اگر ان چیزوں سے صرف نظر لیں تو کوئی مانع نہیں کہ تشدید عذاب اور ان کے آثار محو کرنے کے لئے سنگریزے ان کے زیروزبر ہونے کے بعد ہی ان پر نازل ہوئے ہوں اس طرح سے کہ ان کا علاقہ ان کے نیچے چھپ جائے اور اس کے آثار مٹ جائیں۔

۴. پتھر نشاندار کیوں تھے؟

ہم نے کہا کہ: ”مسومة عند ربك“ کے جملے سے بات واضح ہوتی ہے کہ یہ پتھر خدا کے نزدیک مخصوص اور نشاندار تھے لیکن یہ کس طرح نشاندار تھے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان پتھروں میں کچھ ایسی علامتیں تھیں جو نشاندہی کرتی تھیں کہ یہ عام پتھر نہیں ہیں بلکہ خصوصیت سے عذاب الہی کے لئے نازل ہوئے ہیں تاکہ دوسرے پتھر گرنے سے اشتباہ نہ ہو، اسی لئے بعض دوسروں نے کہا کہ پتھر زمینی پتھروں جیسے نہیں تھے بلکہ وہ ایک طرح کے آسمانی پتھر تھے جو کرہ زمین کے باہر سے زمین کی طرف بھیجے گئے تھے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ علم پروردگار میں ان کی کچھ علامتیں تھیں کہ ان میں سے ہر ایک ٹھیک معین شخص اور معین مقام پر جاگرتا تھا، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدائی سزا اور عذاب اس قدر حساب شدہ ہے کہ یہ تک معین ہے کہ کس شخص کو کون سے پتھر کے ساتھ سزا دی جائے گی اور اس کا کوئی کام حساب اور ضابطے کے بغیر انجام نہیں پاتا۔

۵. ہم جنس کی طرف میلان کی حرمت۔

ہم جنس سے آمیزش، چاہے مردوں میں ہو یا عورتوں میں، اسلام میں بہت بڑے گناہوں میں سے شمار کی گئی ہے اور دونوں کے لئے حد شرعی معین ہے۔

مردوں میں ہم جنسی کا گناہ ہو تو فاعل ہو یا مفعول اسلام میں اس کی سزا قتل ہے اور فقہ میں اس اغلام اور قتل کے کئی طریقے بیان ہوئے ہیں، البتہ اس کی سزا کے لئے ضروری ہے کہ یہ گناہ معتبر اور قطعی ذرائع سے ثابت ہو کہ جو فقہ اسلامی میں اور معصومین کی روایات میں ذکر ہوئے ہیں، یہاں تک کہ سرف تین مرتبہ اقرار کرنا بھی کافی نہیں ہے کم از کم چار مرتبہ اس عمل کا اقرار ضروری ہے۔

باقی رہا عورتوں میں ہم جنسی گناہ کی سزا تو اس کے لئے چار مرتبہ اقرار کرنے یا چار عادل گواہوں کی گواہی سے ثابت ہونے کے بعد (فقہ میں مذکورہ شرائط کی روشنی میں) سوتازیانے ہیں، بعض فقہاء نے کہا ہے کہ شوہردار عورت یہ گناہ کرے تو اس کی حد قتل ہے۔

ان حدود کے اجراء کے لئے دقیق اور نپی تلی شرائط ہیں کہ جو فقہ اسلامی کی کتب میں موجود ہیں، وہ روایات کہ جو ہم جنسی کے گناہ کی مذمت میں پیشوایان اسلام کی طعف سے منقول ہیں اس قدر زیادہ اور بلا دینے والی ہیں کہ ان کے مطالعے سے ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ اس گناہ کی قباہت اور برائی اس قدر ہے کہ بہت کم گناہ اس کے برابر شمار کئے گئے ہیں۔

ان میں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت میں منقول ہے کہ :

لما عمل قوم لوط ما عملوا بکت الارض الی ربھا حتی بلغ ودعھا الی السماء، بکت السماء حتی بلغ ودعھا العرش، فوحي اللہ الی السماء ان احصیہم، وواحي الی الارض ان اخفی بہم۔

جب قوم لوط نے یہ قبیح و مل انجام دیا تو زمین نے اس قدر گریہ و بکا کیا کہ اس کے آنسو آسمان تک پہنچے اور آسمان نے اس قدر گریہ و بکا کیا کہ اس آنسو عرش تک پہنچے، اس وقت اللہ نے آسمان کو وحی کی کہ ان پر پتھر برسائے اور زمین پر وحی کی کہ انہیں نیچے کی طرف لے جا۔ (1)

ظاہر ہے کہ یہاں آنسو بہانا تشبیہ اور کنایہ کے طور پر ہے۔

ایک اور حدیث امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من جامع غلاما جاء يوم القيامة جنبا لا ينفیه ماء الدنيا و غضب اللہ علیہ و لعنه و اعدله جهنم و ساءت مصیرا... ثم قال ان الذکر فیہتر العرش لذلك۔

جو شخص کسی لڑکے کے ساتھ جنسی ملاپ کرے گا قیامت کے دن ناپاک اور مجنب عرصہ محشر میں پیش آئے گا یہاں تک کہ عالم دنیا کے تمام پانی اسے پاک نہیں کرسکیں گے اور خدا اس پر غضبناک ہوگا اور اسے اپنی رحمت سے دور



کرے گا اور اس پر لعنت کرے گا اور جہنم اس کے لئے تیار رکھی گئی ہے اور جہنم کس قدر بڑی جگہ ہے، اس کے بعد فرمایا: جب مذکر مذکر سے جنسی ملاپ کرے تو عرش خدا ہلنے لگتا ہے۔ (2) ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: جو لوگ یہ کام کرتے کرواتے ہیں وہ سدوم (قوم لوط) کے باقی ماندہ لوگ ہیں۔ سوال ہوا: وہی شہر سدوم جو زیر وزیر ہوا۔

فرمایا: ہاں، وہ چار شہر تھے سدوم، صریم، لانا اور غمیرا (عمورا)۔ (3) ایک اور روایت میں حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) سے منقول ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

میں نے پیغمبر سے سنا ہے کہ آپ کہہ رہے تھے:

لعن الله المتشبهين من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال۔

خدا کی لعنت ہو ان مردوں پر جو اپنے آپ کو عورتوں کے مشابہ کرتے ہیں (مردوں سے جنسی ملاپ کرواتے ہیں) اور خدا کی لعنت ہو ان عورتوں پر کہ جو اپنے آپ کو مردوں کی شبیہ بناتی ہیں۔ (4)

.....

1-تفسیر بریان، ج ۲، ص ۲۴۱۔

2-وسائل الشیعہ، ج ۱۴، ص ۲۴۹۔

3-وسائل الشیعہ، ج ۱۴، ص ۲۵۳۔

4-وسائل الشیعہ، ج ۱۴، ص ۲۵۵۔

ہم جنس پرستی کی حرمت کا فلسفہ

اگرچہ مغربی دنیا میں جہاں جنسی بے راہ روی بیت زیادہ ہے ایسی برائیوں سے نفرت نہیں کی جاتی یہاں تک کہ سننے میں آیا ہے کہ بعض ممالک مثلاً برطانیہ میں پارلیمنٹ نے اس کام کو انتہائی بے شرمی سے قانونی جواز دے دیا ہے لیکن ان برائیوں کے عام ہونے سے ان کی برائی اور قباحت میں ہرگز کوئی کمی نہیں آتی اور اس کے اخلاقی، نفسیاتی اور اجتماعی مفاہد اپنی جگہ پر موجود ہیں۔

بعض اوقات مادی مکتب کے بعض پیروکار جو اس قسم کی آلودگیوں میں مبتلا ہیں اپنے عمل کی توجیہ کے لئے کہتے ہیں کہ اس میں طبی نکتہ نظر سے کوئی خرابی نہیں ہے لیکن وہ یہ بات بھول چکے ہیں کہ اصولی طور پر ہر قسم کا جنسی انحراف انسانی وجود کے تمام ڈھانچے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کا اعتدال درہم برہم کردیتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسانی فطری اور طبعی طور پر اپنے صف مخالف کی میلان رکھتا اور یہ میلان انسانی فطرت میں بہت مضبوط جڑیں رکھتا ہے اور انسانی نسل کی بقا کا ضامن ہے، ہر وہ کام جو طبعی میلان سے انحراف کی راہ پر ہو انسان میں ایک قسم کی بیماری اور نفسیاتی انحراف پیدا کرتا ہے۔

وہ مرد جو جنس موافق کی طرف میلان رکھتا ہے اور وہ مرد کہ جو اپنے آپ کو اس کام کے لئے پیش کرتا ہے ایک کامل مرد نہیں ہے جنسی امور کی کتب میں ہم جنس پرستی (HOMOSEXUALISM) کو ایک اہم ترین انحراف قرار دیا ہے۔ اگر یہ کام جاری رہے تو جنس مخالف کے لئے انسان میں میلان آہستہ آہستہ ختم ہوجاتا ہے اور جو یہ کام کرواتا ہے ان میں رفتہ رفتہ زنانہ احساسات پیدا ہونے لگتے ہیں اور دونوں بیت زیادہ جنسی ضعف اور اصطلاح کے مطابق سردمزاجی میں گرفتار ہوجاتے ہیں، اس طرح سے کہ ایک مدت کے بعد وہ طبعی اور فطری (جنس مخالف سے ملاپ) پر اقدر نہیں رہتے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مرد اور عورت کے جنسی احساسات جہاں ان کے بدن کے آرگنزم میں موثر ہیں وہاں ان کے روحانی اور مخصوص اخلاقی پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، یہ بات واضح ہے کہ طبعی اور فطری احساسات سے محروم ہوکر انسان کے جسم اور روح پر کس قدر ضرب پڑتی ہے، یہاں تک کہ ممکن ہے کہ اس طرح کے انحراف میں مبتلا افراد اس قدر ضعف جنسی کا شکار ہوں کہ پھر اولاد پیدا کرنے کی طاقت سے بھی محروم ہوجائیں۔ اس قسم کے افراد عموماً نفسیاتی طور پر صحیح و سالم نہیں ہوتے اور اپنی ذات میں اپنے آپ سے ایک طرح کی بیگانگی محسوس کرتے ہیں اور جس معاشرے میں رہتے سہتے ہیں اس سے خود کو لاتعلق سا محسوس کرنے لگتے ہیں، ایسے افراد قوت ارادی کہ جو ہر قسم کی کامیابی کی شرط ہے آہستہ آہستہ کھو بیٹھتے ہیں اور ایک قسم کی سرگردانی اور پریشانی ان کی روح میں آشیانہ بنالیتی ہے۔

ایسے افراد اگر جلدی اپنی اصلاح کا ارادہ نہ کریں بلکہ لازمی طور پر جسمانی اور روحانی طبیب سے مدد نہ لیں اور یہ

عمل ان کی عادت کی شکل اختیار کر لے تو اس کا ترک کرنا مشکل ہو جائے گا۔  
بہر حال اگر مصمم ارادہ کر لیا جائے تو کسی حالت میں بھی یہ عادت ترک کرنے میں دیر نہیں لگتی، ارادہ بہر صورت قوی ہونا ضروری ہے۔

بہر کیف نفسیاتی سرگردانی انہیں تدریجاً منشیات اور شراب کی طرف لے جاتی ہے اور وہ مزید اخلاقی انحرافات کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ ایک اور بڑی بدبختی ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اسلامی روایات میں مختصر اور پر معنی عبارات کے ذریعے ان مفسد کی طرف اشاری کیا گیا ہے، ان میں سے ایک روایت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، کسی نے آپ سے سوال کیا:

لم حرم اللہ اللواط

خدا نے لواطت کو کیوں حرام کیا ہے؟

آپ نے فرمایا:

من اجل انه لو كان اتیان الغلام حلالا لاستغنى الرجال عن النساء وكان فيه قطع النسل وتعطيل الفروج وكان في اجازة ذلك فساد كثير۔

اگر لڑکوں سے ملاپ حلال ہوتا تو مرد عورتوں سے بے نیاز ہو جاتے (اور ان کی طرف مائل نہ رہتے) اور یہ چیز نسل انسانی کے منقطع ہونے کا باعث بنتی اور جنس مخالف سے فطری ملاپ کے ختم ہونے کا باعث بنتی اور یہ کام بہت سی اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں کا سبب بنتا ہے۔ (1)

اس نکتے کا ذکر بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام ایسے افراد کے لئے جن سزاؤں کا قائل ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ فاعل پر مفعول کی بہن، ماں اور بیٹی سے نکاح حرام ہے یعنی اگر یہ کام ازدواج سے پہلے صورت پذیر ہو تو یہ عورتیں اس کے لئے ابدی طور پر حرام ہیں۔

جس نکتے کا ہم آخر میں ذکر ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ جنسی انحراف کی طرف افراد کے میلان کے بہت سے علل و اسباب ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات ماں باپ کا اپنی اولاد سے سلوک یا ہم جنس اولاد کی نگرانی نہ کرنا، ان کے طرز معاشرت اور ایک ہی جگہ پر سونا وغیرہ بھی ہو سکتا ہے اس آلودگی کا ایک عامل بن جائے۔

بعض اوقات ممکن ہے کہ اس انحراف سے ایک اور اخلاقی انحراف جنم لے لے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قوم لوط کے حالات میں ہے کہ ان کے اس گناہ میں آلودہ ہونے کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ بخیل اور کنجوس لوگ تھے چونکہ ان کے شہر شام جانے والے قافلوں کے راستے میں پڑتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ مہمانوں اور مسافروں کی پذیرائی کریں لہذا ابتداء میں وہ اس طرح ظاہر کرتے تھے کہ وہ ان پر جنسی تجاوز کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ وہ مہمانوں اور مسافروں کو اپنے سے دور بھگائے نلیکن تدریجاً یہ عمل ان کی عادت بن گیا اور انحراف جنسی کے میلانات آہستہ آہستہ ان کے وجود میں بے دار ہو گئے اور معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ وہ سر سے لے کر پاؤں تک اس میں آلودہ ہو گئے۔ (2)

یہاں تک کہ فضول قسم کا مذاق جو کبھی کبھی لڑکوں یا لڑکیوں کے درمیان اپنے ہم جنسوں کے بارے میں ہوتا ہے بعض اوقات ان انحرافات کی طرف کھینچ لے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔

بہر حال پوری توجہ سے ان امور کا خیال رکھنا چاہئے اور جو اس گناہ میں آلودہ ہوں انہیں جلدی نجات حاصل کرنا چاہئے اور اس بارے میں خدا سے توفیق طلب کرنا چاہئے۔

.....

1۔ وسائل الشیعة، ج ۱۴، ص ۲۵۲۔

2۔ بحار، ج ۱۲، ص ۱۴۷۔

قوم لوط کا اخلاق

اسلامی روایات و تواریخ میں جنسی انحرافات کے ساتھ قوم لوط کے برے اور شرمناک اعمال اور گھٹیا کردار بھی بیان ہوا ہے، اس سلسلے میں سفینة البحار میں ہے:

قیل كانت مجالسهم تشتمل على انواع المناكير مثل الشتم والسخف والصفح والقمار وضرب المخراق وخذف الاحجار على من مر بهم وضرب المعازف والمزامير وكشف العورات۔

کہا گیا ہے کہ ان کی مجالس اور بیٹھکیں طرح طرح کے منکرات اور برے اعمال سے آلودہ تھیں، وہ آپس میں رکبیک جملوں، فحش کلامی اور پھبتیوں کا تبادلہ کرتے تھے، ایک دوسرے کی پشت پر مگے مارتے تھے طرح طرح کی آلاتِ موسیقی استعمال کرتے تھے اور لوگوں کے سامنے اپنی شرم گاہوں کا ننگا کرتے تھے۔ (1)

واضح ہے کہ اس قسم کے گندے ماحول میں ہر روز انحراف اور بدی نئی شکل میں رونما ہوتی ہے اور وسیع سے وسیع ہوتی چلی جاتی ہے، ایسے ماحول میں اصولی طور پر بُرائی کا تصور ختم ہوجاتا ہے اور لوگ اس طرح سے اس راہ پر چلتے ہیں کہ کوئی کام ان کی نظر میں برا اور قبیح نہیں رہتا، اس سے زیادہ بد بخت وہ قومیں ہیں جو و علم کی پیش رفت کے زمانے میں انہیں راہوں پر گامزن ہیں، بعض اوقات تو ان کے اعمال اس قدر شرمناک اور رسوا کن ہوتے ہیں کہ قوم لوط کے اعمال بھول جاتے ہیں۔

1۔ سفینة البحار، ص ۵۱۷۔

تفسیر نمونہ جلد 09

۸۴ وَاللّٰی مَدِیْنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰۤاَقُوْمُ اَعْبُدُوْا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُهٗ وَلَا تَتَّقُوا الْمَکِیَالَ وَالْمِیْرَانَ اِنِّیْ اُرَاکُمْ بِخَیْرِ وَاِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ  
۸۵ وَاِیۡۤاَقُوْمُ اُوْفُوْا الْمَکِیَالَ وَالْمِیْرَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوْا النَّاسَ اَشْیَآئَهُمْ وَلَا تَعْنُوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ۔  
۸۶ بَیِّنَةُ اللّٰهِ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ وَمَا اَنَا عَلَیْکُمْ بِحَفِیْظٍ

ترجمہ

۸۴۔ اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کراؤ، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں اور پیمانہ اور وزن کم نہ کرو (کم فروشی نہ کرو) میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور میں تمہارے لئے محیط ہوجانے والے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۸۵۔ اے میری قوم! پیمانہ اور وزن عدالت سے پورا کرو اور لوگوں کی اشیاء (اجناس) پر قابو نہ رکھو اور ان کے حق میں کمی نہ کرو اور زمین میں فساد نہ کرو۔

۸۶۔ خدا نے تمہارے لئے جو حلال سرمایہ باقی رکھا ہے وہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اور میں تمہارا پاسدار (اور تمہیں ایمان پر مجبور کرنے والا) نہیں ہوں۔

حضرت شعیب (علیہ السلام) کی سرزمین۔ مدین

قوم لوط کی عبرت انگیز داستان ختم ہونے پر قوم شعیب اور اہل مدین کی نوبت آئی ہے، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے توحید کا راستہ چھوڑ دیا تھا اور شرک و بت پرستی کی سنگلاخ زمین میں سرگرداں ہو گئے تھے، یہ لوگ نہ صرف بتوں کو پوجتے تھے بلکہ درہم و دینار اور اپنے مال و ثروت کی بھی پرستش کرتے تھے اور اسی لئے وہ اپنے کاروبار اور بارونق تجارت کو نادرستی، کم فروشی اور غلط طریقوں سے آلودہ کرتے تھے۔

ابتدا میں فرمایا گیا ہے: مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا (وَاللّٰی مَدِیْنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا)۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں لفظ ”اِخَاهُمْ“ (ان کا بھائی) اس بنا پر ہے کہ اپنی قوم سے پیغمبروں کی انتہائی محبت کو بیان کیا جائے، نہ صرف اس بناء پر کہ وہ افراد ان کے گروہ اور قبیلے سے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ان کے خیرخواہ اور ہمدرد بھائی کی طرح تھے۔

مدین (بروزن ”مَرِیْمَ“) حضرت شعیب (علیہ السلام) اور ان کے قبیلے کی آبادی کا نام ہے، یہ شہر خلیج عقبہ کے مشرق

میں واقع ہے، اس کے لوگ اولادِ اسماعیل میں سے تھے، مصر، لبنان اور فلسطین سے تجارت کرتے تھے۔ آج کل شہر مدین کا نام ”معان“ ہے، بعض جغرافیہ دانوں نے خلیج عقبی کے درمیان سے کوہ سینا تک زندگی بسر کرنے والوں پر مدین کے نام کا اطلاق کیا ہے۔ تورات میں بھی لفظ ”مدیان“ آیا ہے لیکن بعض قبائل کے لئے (البتہ ایک ہی لفظ شہر اور اہل شہر پر عام طور پر استعمال ہوجاتا ہے)۔ (۱)

اس پیغمبر اور ہمدرد و مہربان بھائی نے جیسا کہ تمام انبیاء کا آغازِ دعوت میں طریقہ ہے پہلے انہیں مذہب کے اساسی ترین رکن ”توحید“ کی طرف دعوت دی اور کہا: اے قوم! یکتا و یگانہ خدا کی پرستش کرو کہ جس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں (قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ)، کیونکہ دعوتِ توحید تمام طاغوتوں اور جہالت کی تمام سنتوں کو توڑنے کی دعوت ہے اور اس کے بغیر کسی قسم کی اجتماعی اور اخلاقی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ اس وقت اہل مدین میں ایک اقتصادی خرابی شدید طور پر رائج تھی جس کا سرچشمہ شرک اور بت پرستی کی روح ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خرید و فروخت کرتے وقت چیزوں کا پیمانہ اور وزن کم نہ کرو (وَلَا تَنفُسُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ)۔

”مکیال“ اور ”میزان“ پیمانہ اور ترازو کے معنی میں ہے اور انہیں کرنا اور کم فروشی لوگوں کے حقوق ادا نہ کرنے کے معنی میں ہے۔

ان دونوں کے کاموں کا ان کے درمیان رواج نشاندہی کرتا ہے کہ ان کے کاموں میں نظم و نسق، حساب و کتاب اور میزان و ترازو نہیں تھا اور ان کے سرمایہ دار معاشرے میں غارت گری، استثماری اور ظلم و ستم کا نمونہ تھا۔ یہ عظیم پیغمبر اس حکم کے بعد فوراً اس کے وہ علل و اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہیں: پہلے کہتے ہیں: اس نصیحت کو قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اچھائیوں کے دروازے تمہارے لئے کھل جائیں گے، تجارت کو فروغ حاصل ہوگا، چیزوں کی قیمتیں گر جائیں گی، معاشرے کو سُکھ چین نصیب ہوگا، خلاصہ یہ کہ ”میں تمہارا خیر خواہ ہوں“ اور مجھے اعتماد ہے کہ یہ نصیحت تمہارے معاشرے کے لئے خیر و برکت کا سرچشمہ بنے گی (إِنِّي أَنَا كُمْ بَخِيرٌ)۔

اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) کا مقصود یہ تھا کہ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نعمتِ فراواں اور خیرِ کثیر کے حامل ہو“ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ تم پستی کی طرف مائل ہو کر لوگوں کے حقوق ضائع کرو اور شرکِ نعمت کی بجائے کفرانِ نعمت کرو۔

دوسرا یہ کہ اس سے ڈرتا ہوں کہ شرک، کفرانِ نعمت اور کم فروشی پر اصرار کے نتیجے میں تمہیں محیط ہوجائے والے دن کا عذاب نہ آئے (وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُحِيطٍ)۔

یہاں ”محیط“ ”یوم“ کی صفت ہے یعنی ایک گھیر لینے والا دن، البتہ گھیر لینے والے دن سے مراد اس دن کا گھیر لینے والا عذاب ہے، ہوسکتا ہے یہ عذابِ اکرت کی طرف اشارہ ہو اور اسی طرح دنیا کے گھیر لینے والے عذاب اور سزا کی بھی نشاندہی ہو۔

لہذا تمہیں بھی ایسے کاموں کی ضرورت نہیں اور ان کاموں کے باعث عذابِ خدا بھی تمہاری گھات میں ہے اس لئے جس قدر جلد ممکن ہو اپنی حالت ٹھیک کرلو۔

بعد والی آیت پھر ان کے اقتصادی نظام کے بارے میں تاکید کر رہی ہے، اگر پہلے شعیب اپنی قوم کو کم فروشی سے منع کرچکے تھے تو آیت کے اس حصے میں لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے، فرمایا: اے قوم! پیمانہ اور میزان کو عدل سے پورا کرو (وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ)، قسط و عدل کا یہ قانون اور ہر شخص کو اس کے حق کی ادائیگی کا یہ ضابطہ تمہارے پورے معاشرے پر حکمران ہونا چاہیے۔

پھر اس کے آگے بڑھ کر فرمایا: لوگوں کی چیزوں اور اجناس پر عیب نہ رکھو اور ان میں سے کسی چیز کو کم نہ کرو (وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَانَهُمْ)۔

”بخس“ (بروزن ”نحس“) اصل میں ظلم کرتے ہوئے کم کرنے کے معنی میں ہے اور یہ جو ان زمینوں کو ”بخس“ کہا جاتا ہے کہ جو آبیاری کے بغیر کاشت ہوتی ہیں اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ ان کا پانی کم ہے (اور وہ صرف بارش سے استفادہ کرتی ہیں) یا اس لئے کہ ان کی پیداوار پانی والی زمینوں سے کم ہے۔

اس جملے کے مفہوم کی وسعت پر نگاہ ڈالیں تو یہ سب اقوام و ملل کے لئے تمام انفرادی اور اجتماعی حقوق کے احترام کی دعوت ہے، ”بخس حق“ ہر ماحول اور ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات بلا معاوضہ مدد یا کسی اور صورت میں تعاون اور قرض کے نام پر بھی حقوقِ غصب کئے جاتے ہیں (جیسا کہ آج کل

استعماری اور سامراجی طاقتوں کا طرزِ عمل ہے)۔

آیت کے آخر میں اس سے بھی اگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے: روئے زمین پر فساد نہ کرو (وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ)۔ کم فروشی کے ذریعے فساد اور برائی، لوگوں کے حقوق کو غصب کرنے کا فساد اور حقوق پر تجاوز کا فساد، معاشرتی میزان اور اعتدال کو درہم برہم کرنے کا فساد، اموال اور اشخاص پر عیب لگانے کا فساد۔ خلاصہ یہ کہ لوگوں کی حیثیت، آبرو، ناموس اور جان کے حریم پر تجاوز کرنے کا فساد۔

”لا تعتوا“ ”فساد نہ کرو“ کے معنی میں ہے، اس بناء پر اس کے بعد ”مفسدین“ کا ذکر زیادہ سے زیادہ تاکید کی خاطر ہے۔ مندرجہ بالا دو آیات سے یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہوتی ہے کہ توحید کا عقد اور ائیڈیالوجی کا معاملہ ایک صحیح و سالم اقتصاد کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے، نیز یہ آیات اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اقتصادی نظام کا درہم برہم ہونا معاشرے کی وسیع تباہی اور فساد کا سرچشمہ ہے۔

آخر میں انہیں یہ گوش گزار کیا گیا ہے کہ ظلم و ستم کے ذریعے اور استعماری ہتھکنڈوں سے بڑھنے والی دولت تمہاری بے نیازی اور استغنا کا سبب نہیں بن سکتی بلکہ حلال طریقے سے حاصل کیا ہوا جو سرمایہ تمہارے پاس باقی رہ جائے چاہے وہ تھوڑا ہی ہو اگر خدا اور اس کے رسول پر ایمان کے ساتھ ہو تو بہتر ہے (بَقِيَّةُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ)۔ ”بَقِيَّةُ اللَّهِ“ کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ تھوڑا حلال چونکہ خدا کے فرمان کے مطابق ہے لہذا ”بَقِيَّةُ اللَّهِ“ ہے اور یاس لئے ہے کہ حلال کی کمائی نعمتِ الہی دوام اور برکات کی بقا کا باعث ہے یا پھر یہ معنوی جزا اور ثواب کی طرف اشارہ ہے کہ جو ابد تک باقی رہتا ہے اگرچہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے فنا ہو جائے گا، سورہ کہف کی آیت ۴۶ میں ہے:

اور باقی رہنے والی نیکیاں تمہارے رب کے نزدیک انجام کی حیثیت سے بھی بہتر ہے اور امید و آرزو کے لحاظ سے بھی۔ یہ بھی اسی طرف اشارہ ہے۔

”إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“ (اگر تم ایمان رکھتے ہو)، یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ یہ حقیقت صرف وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو خدا، اس کی حکمت اور اس کے فرامین کے فلسفہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

متعدد روایات میں ہے کہ ”بَقِيَّةُ اللَّهِ“ صرف مہدی (علیہ السلام) یا بعض دوسرے ائمہ کے وجود کی طرف اشارہ ہے، ان روایات میں سے ایک کتاب ”اکمال الدین“ میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: اول ما ينطق به القائم عليه السلام حين خرج هذه الآية ”بَقِيَّةُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“۔ ثم يقال:

انا بقية الله و حجتہ و خليفته عليكم فلا يسلم عليه مسلم الا قال عليك يا بقية الله في ارضه۔

پہلی بات جو حضرت مہدی (علیہ السلام) اپنے قیام کے بعد کریں گے وہ یہ آیت ہوگی ”بَقِيَّةُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“۔ اس کے بعد کہیں گے:

میں بقية الله ہوں اور تم میں اس کی حجت اور خلیفہ ہوں، لہذا اس کے بعد کوئی شخص ایسا نہ ہوگا کہ جو اس طرح سے آپ (علیہ السلام) پر سلام نہ کرے گا: السلام عليك يا بقية الله في ارضه۔

یعنی۔ اے خدا کی زمین میں بقية الله! آپ پر سلام ہو۔ (2)

ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ آیاتِ قرآن اگرچہ خاص مواقع کے بارے میں نازل ہوئی ہیں ان کا مفہوم جامع ہے اور یہ ممکن ہے کہ بعد کے زمانوں میں وہ زیادہ اور وسیع مصداق پر منطبق ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ زیر بحث آیت میں قومِ شعیب مخاطب ہے اور ”بَقِيَّةُ اللَّهِ“ سے مراد حلال سرمایہ اور منافع اور جزائے الہی ہے لیکن ہر نفع بخش موجود کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بشر کے لئے باقی ہے اور خیر و سعادت کا باعث ہے اسے ”بَقِيَّةُ اللَّهِ“ شمار کیا جاسکتا ہے۔

تمام انبیائے الہی اور بزرگ ہادی ”بَقِيَّةُ اللَّهِ“ ہیں، اسی طرح جو مجاہد سپاہی کامیابی کے بعد میدان جنگ سے پلٹ آتے ہیں وہ بھی ”بَقِيَّةُ اللَّهِ“ ہیں۔

حضرت مہدی موعود چونکہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آخری پیشوا اور عظیم ترین انقلابی قائد ہیں ”بَقِيَّةُ اللَّهِ“ کے مصداق میں سے ایک روشن ترین مصداق ہیں اور ہر کسی سے بڑھ کر اس لقب کے اہل ہیں خصوصاً جب کہ آپ (علیہ السلام) انبیاء اور ائمہ کے واحد باقی ماندہ ہیں۔

زیر بحث آیت کے آخر میں حضرت شعیب (علیہ السلام) کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: میری ذمہ داری تو فقط ابلاغ، انذار اور کردار کرنا ہے ”اور میں تمہارے اعمال کا جواب دہ نہیں اور نہ میری یہ ذمہ داری ہے کہ تمہیں یہ راہ اختیار کرنے پر مجبور کروں“ تم ہو، یہ تمہاری راہ ہے اور یہ چاہ ہے (وما انا على کم بحفيظ)

.....  
۱. اعلام قرآن، ص ۵۷۳.

2- تفسیر صافی میں مذکورہ آیت کے ذیل میں یہ روایت نقل ہے -

۸۷ قالوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ.  
۸۸ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتِطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ.  
۸۹ وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ وَمَا قَوْمٌ لَوْطٍ مِنْكُمْ بَعِيدٍ.  
۹۰ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ.

ترجمہ

۸۷. انہوں نے کہا: اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں کی جن کی ہمارے اباؤ اجداد پرستش کرتے تھے اور جو کچھ ہم اپنے اموال کے لئے چاہتے ہیں اسے انجام نہ دیں، تو بُرد بار اور رشید مرد ہے۔  
۸۸. اس نے کہا: اے میری قوم! اگر میرے پاس پروردگار کی طرف سے واضح دلیل ہو اور اس نے مجھے اچھا رزق دیا ہو (تو کیا میں اس کے فرمان کے خلاف عمل کر سکتا ہوں؟) میں برگز نہیں چاہتا کہ جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں اس کا خود ارتکاب کروں میں سوائے اصلاح کے۔ جتنی کہ مجھ میں توانائی ہے۔ اور کچھ نہیں چاہتا اور مجھے اللہ کے علاوہ توفیق نہیں ہے میں نے اس پر توکل کیا ہے اور میری اسی کی طرف بازگشت ہے۔  
۸۹. اور اے میری قوم! مبادا میری دشمنی اور مخالفت کے نتیجے میں تم اس انجام میں گرفتار ہو جاؤ کہ جس میں قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح گرفتار ہوئی ہے اور قوم لوط تو تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔  
۹۰. اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو اور اس کی طرف رجوع اور توبہ کرو اور میرا پروردگار مہربان ہے اور (توبہ کرنے والوں بندونکو) دوست رکھتا ہے۔

ہٹ دھرموں کی بے بنیاد منطق

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس ہٹ دھرم قوم نے اس آسمانی مصلح کی دعوت کے جواب میں کیا رد عمل ظاہر کیا۔ وہ جو بتوں کو اپنے بزرگوں کے آثار اور اپنے اصلی تمدن کی نشانی خیال کرتے تھے اور کم فروشی اور دھوکا بازی سے معاملات میں بڑے بڑے فائدے اور مفادات اٹھاتے تھے حضرت شعیب (علیہ السلام) کے جواب میں کہا: اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں کی جن کی ہمارے اباؤ اجداد پرستش کرتے تھے (قالوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا)، اور یا اپنے اموال کے بارے میں اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھیں (أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ) ، تو تو ایک بُرد بار، حوصلہ مند سمجھدار آدمی ہے تجھ سے یہ باتیں بعید ہیں (إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ)۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے حضرت شعیب (علیہ السلام) کی نماز کا ذکر کیوں کیا؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ اس بنا پر تھا کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) زیادہ نماز پڑھتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ نماز انسان کو بُرے اور قبیح اعمال سے روکتی ہے لیکن وہ نادان لوگ کہ جو نماز اور ترک منکرات کے رابطے کو نہ سمجھ سکے انہوں نے اس بات کا تمسخر اڑایا اور کہا کہ کیا یہ ذکر و اذکار اور حرکات تجھے حکم دیتی ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کے طور طریقے اور مذہبی ثقافت کو پاؤں تلے روند دیں یا اپنے اموال کے بارے میں اپنا اختیار گنوا بیٹھیں۔ بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ ”صلوٰۃ“ دین و مذہب کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ دین کا واضح ترین سمبل نماز ہے۔

بہر حال اگر وہ صحیح طور پر غور و فکر کرتے تو حقیقت پالیتے کہ نماز انسان میں احساس مسئولیت، تقویٰ، پرہیزگاری، خداترسی اور حق شناسی زندہ کرتی ہے، اسے خدا کی اور اس کی عدالتِ عدل کی یاد دلاتی ہے، خود پسندی اور خودپرستی کا غبار اس کے صفحہ دل سے صاف کر دیتی ہے، اسے جہان محدود و آلودہ سے دنیائے ماوراء طبعیت، پاکیزوں اور نیکیوں کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اسی بنا پر اسے شرک، بت پرستی، بڑوں کی اندھی تقلید، کم فروشی اور طرح طرح کی دھوکے بازی سے باز رکھتی ہے۔

دوسرا سوال جو سامنے آتا ہے یہ ہے کہ کیا انہوں نے جملہ ”إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ“، (تو عاقل، فہمیدہ اور بردبار شخص

(ہے) اعترافِ حقیقت و ایمان کے طور پر کہا یا تمسخر و استہزاء کے طور پر؟ مفسرین نے دونوں احتمال ذکر کئے ہیں لیکن اگر پہلے آنے والے تمسخر آمیز جملے ”أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ“ کی طرف توجہ کریں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ جملہ بھی استہزاء کے طور پر کہا، ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ ایک حلیم و بردبار شخص وہ ہے کو کسی چیز کا جب تک کافی مطالعہ نہ کر لے اور اس کے صحیح ہونے کا اسے اطمینان نہ ہو جائے اس پر اظہارِ رائے نہیں کرتا اور ایک رشید و عاقل شخص وہ ہے کہ جو ایک قوم کے رسم و رواج کو پامال نہ کرے اور سرمایہ داروں سے عمل کی آزادی سلب نہ کرے، پس معلوم ہوتا ہے کہ نہ تمہارا کافی مطالعہ ہے، نہ تمہاری عقل و فہم درست ہے اور نہ تمہاری سوچ گہری ہے، کیونکہ درست عقل اور گہری سوچ تقاضا کرتی ہے کہ انسان اپنے بڑوں کی سنت سے دستبردار نہ ہو اور کسی کی آزادی عمل سلب نہ کرے۔

لیکن جنہوں نے ان کی باتوں کو حماقت پر محمول کیا تھا اور ان کی بے عقلی کی دلیل قرار دیا تھا انہیں حضرت شعیب (علیہ السلام) نے کہا: اے میری قوم! (اے وہ لوگو! کہ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں اور جو کچھ میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں وہی تمہارے لئے بھی پسند کرتا ہوں) اگر خدا نے مجھے واضح دلیل وحی اور نبوت دی ہو اور اس کے علاوہ مجھے پاکیزہ روزی اور حسبِ ضرورت مال دیا ہو تو کیا اس صورت میں صحیح ہے کہ میں اس کے فرمان کی مخالفت کروں یا تمہارے بارے میں کوئی غرض رکھوں اور تمہاری خیر خواہ نہ بنوں (قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا)۔ (۱)

اس جملے سے حضرت شعیب (علیہ السلام) یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کام میں میرا مقصد صرف روحانی، انسانی اور تربیتی ہے، میں ایسے حقائق کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے اور انسان ہمیشہ اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جسے نہیں جانتا۔

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ ان آیات میں ”یا قوم“ (اے میری قوم) کا تکرار ہوا ہے تاکہ قبولِ حق کے لئے ان کے جذبات اور میلانات کو نرم کیا جاسکے، حضرت شعیب (علیہ السلام) اس طرح سے انہیں سمجھانا چاہتے تھے کہ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں (چاہے یہاں ”قوم“ قبیلہ کے معنی میں ہو، طائفہ اور خاندان کے معنی میں ہو یا اس گروہ کے معنی میں ہو کس کے درمیان وہ زندگی گزارتے تھے اور انہی کا حصہ شمار ہوتے تھے)۔

اس کے بعد یہ عظیم پیغمبر مزید کہتے ہیں: یہ گمان نہ کرنا کہ میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں اور پھر خود اسی کی جستجو میں لگ جاؤں (وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَمْلِكُكُمْ إِلَيَّ مَا أَنْهَأَكُمْ عَنْهُ)۔

تمہیں کہوں کہ کم فروشی نہ کرو اور دھوکہ بازی اور ملاوٹ نہ کرو لیکن میں کوہِ اعمال انجام دوں کہ دولت و ثروت اکٹھی کرنے لگوں یا تمہیں تو بتوں کی پرستش سے منع کروں مگر خود ان کے سامنے سر تعظیم خم کروں، نہیں ایسا ہر گز نہیں۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت شعیب (علیہ السلام) پر الزام لگاتے تھے کہ کوہِ فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہے لہذا وہ صراحت سے اس امر کی نفی کرتے ہیں۔

آخر میں ان سے کہتے ہیں: میرا صرف ایک ہدف اور مقصد ہے اور وہ ہے اپنی قدرت و استطاعت کے مطابق تمہاری اور تمہارے معاشرے کی اصلاح (إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَنْطَعْتُ)۔

یہ وہی ہدف ہے جو تمام پیغمبروں کی پیش نظر رہا ہے۔ یعنی عقیدے کی اصلاح، اخلاق کی اصلاح، عمل کی اصلاح، روابط اور اجتماعی نظاموں کی اصلاح۔

اور اس ہدف تک پہنچنے کے لئے صرف خدا سے توفیق طلب کرتا ہوں (وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ)۔ اسی بنا پر اپنی ذمہ داری کی انجام دہی اور پیغام پہنچانے اور اس عظیم ہدف تک پہنچنے کے لئے ”صرف اس پر بھروسہ کرتا ہوں اور تمام چیزوں میں میری بازگشت اسی کی طرف ہے (عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَالْيَئِيسُ أُنِيبُ)، مشکلات کے حل کے لئے اس کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے کوشش کرتا ہوں اور اس راہ میں سختیاں گوارا کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

اس کے بعد انہیں ایک اخلاقی نکتے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی بغض و عداوت کی بنا پر یا تعصب اور ہٹ دھرمی سے اپنے تمام مصالح نظر انداز کر دیتا ہے اور انجام کو فراموش کر دیتا ہے، حضرت شعیب (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا: اے میری قوم! ایسا نہ ہو کہ میری دشمنی اور عداوت تمہیں گناہ، عصیان اور سرکشی پر ابھارے (وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي)، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہی بلائیں، مصیبتیں، تکلیفیں، عذاب اور سزائیں جو میں قوم نوح، قوم ہود یا قوم صالح کو پہنچیں وہ تمہیں بھی آئیں (أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ)، یہاں تک کہ قوم لوط کے شہروں کا زیر و زبر ہونا اور ان پر سنگباری کا واقعہ تم سے کوئی دور نہیں ہے (وَمَا

قَوْمٌ لَوْطٍ مِنْكُمْ بَیْعِدٍ، نہ ان کا زمانہ ان سے کوئی دور ہے اور نہ ان کے علاقے تم سے دور ہیں اور نہ ہی تمہارے اعمال اور گناہ ان سے کچھ کم ہیں۔

”مدین“ کہ جو قوم شعیب (علیہ السلام) کا مرکز تھا وہ قوم لوط کے علاقے سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا، کیونکہ دونوں شامات کے علاقوں میں سے تھے، زمانے کے لحاظ سے اگرچہ کچھ فاصلہ تھا تاہم اتنا نہیں کہ ان کی تاریخ فراموش ہو چکی ہوتی، باقی ربا عمل کے لحاظ سے تو اگرچہ قوم لوط کے جنسی انحرافات نمایاں تھے اور قوم شعیب (علیہ السلام) کے اقتصادی انحرافات زیادتی تھے اور ظاہراً بہت مختلف تھے لیکن دونوں معاشرے میں فساد پیدا کرنے، اجتماعی نظام خراب کرنے، اخلاقی فضائل کو نابود کرنے اور برائی پھیلانے میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ کبھی ہم روایات میں دیکھتے ہیں کہ ایک درہم سود کہ جس کا تعلق اقتصادی مسائل سے ہے کو، زنا کہ جو ایک جنسی آلودگی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ (2)

آخر میں حضرت شعیب (علیہ السلام) انہیں دو حکم اور دیتے ہیں کہ جو دراصل ان تمام تبلیغات کا نتیجہ ہیں کہ جو اس گمراہ قوم میں وہ انجام دے چکے تھے۔

پہلا یہ کہ ”خدا سے مغفرت طلب کرو تاکہ گناہ سے پاک ہو جاؤ اور شرک و بت پرستی اور معاملات میں خیانت سے کنارہ کش ہو جاؤ (وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ)۔“

دوسرا یہ کہ گناہ سے پاک ہونے کے بعد اس کی طرف پلٹ آؤ کیونکہ وہ پاک ہے اور تم بھی پاک ہو کر اس کی خدمت میں آؤ (ثُمَّ تَوْبُوا إِلَيْهِ)۔

دراصل استغفار، راہ گناہ سے کنارہ کشی، خود کو پاک کرنا اور توبہ اس ذات کی طرف بازگشت ہے کہ جو لامتناہی وجود ہے۔

اور جان لو کہ تمہارا گناہ کتنا ہی عظیم اور سنگین کیوں نہ ہو بازگشت کی راہ تمہارے سامنے کھلی ہوئی ہے کیونکہ میرا پروردگار رحیم بھی ہے اور بندوں کو دوست بھی رکھتا ہے (إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ)۔

”ودود“، ”ود“ کا صیغہ مبالغہ ہے جس کا معنی ہے ”محبت“، لفظ ”رحیم“ کے بعد اس لفظ کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ نہ فقط اپنی رحیمیت کی بناء پر توبہ کرنے والے گنہ گار بندوں پر توجہ رکھتا ہے بلکہ اس سے قطع نظر انہیں بہت دوست رکھتا ہے، کیونکہ یہ دونوں (یعنی - رحم اور محبت) خود بندوں کی استغفار اور توبہ قبول کرنے کا باعث ہیں۔

.....

۱. توجہ رکھنے کا مندرجہ بالا آیت میں جملہ شرطیہ کی جزا محذوف ہے اور اس کی جزا یہ ہے: افاعدل مع ذلک عما انا علیہ من عبادتہ وتبلیغ دینہ۔

۲. اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ”لا یجر منکم“ دو معنی میں آیا ہے، ایک ”لا یحلمنکم“ (یعنی - تمہیں نہ ابھارے)، اس صورت میں آیت ترکیب کے لحاظ سے اس طرح ہوگی ”لا یجر من“ فعل، ”شفاق“، فاعل، ”کم“ مفعول اور ”ان یصیبکم“ مصدری معنی رکھتا ہے اور دوسرا مفعول، نیز اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اے میری قوم! میری مخالفت تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تمہارا انجام قوم نوح وغیرہ کی طرح ہو، دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”تمہیں گناہ کی طرف نہ کھینچ کر لے جائے“، اس صورت میں ”یجر من“ فعل، ”شفاق“، فاعل، اور ”کم“ مفعول ہے اور ”ان یصیبکم“ اس کا نتیجہ ہے اور آیت کا معنی وہی ہوگا جو ہم متن میں بیان کر چکے ہیں۔

۹۱ قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفَقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ۔

۹۲ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَائِكُمْ ظَهْرِيًّا إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ۔

۹۳ وَيَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ۔

ترجمہ

۹۱۔ انہوں نے کہا: اے شعیب! بہت سی وہ باتیں جو تو کہتا ہے ہم نہیں سمجھ پاتے اور ہم تجھے اپنے مابین کمزور پاتے ہیں اور اگر تیرے چھوٹے سے قبیلے کا احترام پیش نظر نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کرتے اور تُو ہمارے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا۔

۹۲۔ اس نے کہا: اے قوم! کیا میرا چھوٹا سا قبیلہ تمہارے نزدیک خدا سے زیادہ عزت دار ہے جب کہ تم نے اس کے فرمان کو پس پشت ڈال دیا ہے، جو کچھ تم انجام دیتے ہو میرا پروردگار اس پر محیط ہے (اور اس سے آگاہ ہے)۔



۹۳۔ اے قوم! جو کچھ تم سے ہوسکے کرگزر اور میں بھی اپنا کام کروں گا اور عنقریب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ خوار ورسوا کرنے والا عذاب کس کے پیچھے آتا ہے اور کون جھوٹا ہے، تم انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

ایک دوسرے کو دھمکیاں

یہ عظیم پیغمبر۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) کہ انتہائی جچے ٹلے، بلیغ اور دلنشین کلام کی وجہ سے جن کا لقب ”خطیب الانبیاء“ ہے، (۱) ان کا کلام ان لوگوں کی روحانی و مادی زندگی کی راہیں کھولنے والا تھا، انہوں نے بڑے صبر، حوصلے، متانت اور دلسوزی کے ساتھ ان سے تمام باتیں کیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس گمراہ قوم نے انہیں کس طرح سے جواب دیا۔

انہوں نے چار جملوں میں جو ڈھٹائی، جہالت اور بے خبری کا مظہر تھے آپ کو جواب دیا۔ پہلے وہ کہنے لگے: اے شعیب! تمہاری زیادہ تر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں (قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ)، بنیادی طور پر تیری باتوں کا کوئی سر پیر ہی نہیں، ان میں کوئی خاص بات اور منطق ہی نہیں کہ ہم ان پر کوئی غور و فکر کریں، لہذا ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس پر ہم عمل کریں اس لئے تم اپنے آپ کو زیادہ نہ تھکاؤ اور دوسرے لوگوں کے پیچھے جاؤ۔

دوسرا یہ کہ ہم تجھے اپنے مابین کمزور پاتے ہیں (وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا)، لہذا اگر تم یہ سوچتے ہو کہ تم اپنی بے منطق باتیں طاقت کے بل پر منوا لو گے تو یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے۔ یہ گمان نہ کرو کہ اگر تم سے پوچھ گچھ نہیں کرتے یہ تمہاری طاقت کے خوف سے ہے ”اگر تیری قوم وقبیلے کا احترام پیش نظر نہ ہوتا تو ہم تجھے بدترین طریقے سے قتل کردیتے اور تجھے سنگسار کرتے (وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ)۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ انہوں نے حضرت شعیب (علیہ السلام) کے قبیلے کو ”رہط“ کے لفظ سے یاد کیا کہ جس کا لغت عرب میں تین سے کم تعداد سے لے کر سات یا دس یا بعض کے بقول زیادہ سے زیادہ چالیس افراد پر اطلاق ہوتا ہے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تیری قبیلے کی بھی ہماری نظر میں کوئی طاقت نہیں بلکہ دوسرے لحاظ ہیں جو ہمیں اس کام سے روکتے ہیں، یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ اگر تیری قوم اور خاندان کے ان چار افراد کا لحاظ نہ ہو تو ہم تیرا حق تیرے ہاتھ پر رکھ دیتے جب کہ دراصل اس کی قوم اور خاندان کے وہی چار افراد نہیں ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ طاقت کے لحاظ سے اہمیت نہیں رکھتے۔

آخر میں انہوں نے کہا: ٹوہمارے لئے کوہ طاقور اور ناقبل شکست شخص نہیں ہے (وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بَعِزٌّ)، اگرچہ تو اپنے قبیلے کے بزرگوں میں شمار ہوتا ہے لیکن جو پیروگرام تیرے پیش نظر ہے اس کی وجہ سے ہماری نگاہ میں تیری کوئی وقعت اور منزلت نہیں ہے۔

حضرت شعیب (علیہ السلام) ان کی باتوں کے نشتر اور توہین آمیز رویے سے (سیخ پا ہو کر) اٹھ کر نہ چلے گئے بلکہ آپ نے اسی طرح انہیں پُر منطق اور بلیغ پیرائے میں جواب دیا: اے قوم! کیا میرے قبیلے کے یہ چند افراد تمہارے نزدیک خدا سے زیادہ عزیز ہیں (قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ لِيَّ أَرْهَطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ)، تم میرے خاندان کی خاطر جو تمہارے بقول چند نفر سے زیادہ نہیں ہیں مجھے آزار نہیں پہنچاتے ہو، تو کیوں خدا کے لئے تم میری باتوں کو قبول نہیں کرتے ہو، کیا عظمتِ خدا کے سامنے چند افراد کی کوئی حیثیت ہے؟

کیا تم کدا کے کسی احترام کے قائل ہو ”جب کہ اسے اور اس کے فرمان کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے (وَآتَخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظَهْرًا)۔ (2)

آخر میں حضرت شعیب (علیہ السلام) کہتے ہیں: یہ خیال نہ کرو کہ خدا تمہارے اعمال کو نہیں دیکھتا اور تمہاری باتیں نہیں سنتا، یقین جانو کہ میرا پروردگار ان تمام اعمال پر محیط ہے جو تم انجام دیتے (إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ)۔ بلیغ سخنور وہ ہے جو اپنی باتوں میں مد مقابل کی تمام تنقیدوں کا جواب دے، قوم شعیب (علیہ السلام) کے مشرکین نے چونکہ اپنی باتوں کے آخر میں ضمناً انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی تھی اور ان کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار کیا تھا لہذا ان کی دھمکی کے جواب میں حضرت شعیب (علیہ السلام) نے اپنا موقف اس طرح سے بیان کیا: اے میری قوم! جو کچھ تمہارے بس میں ہے کرگزر اور اس میں کوتاہی نہ کرو اور جو کچھ تم سے ہوسکتا ہے اس میں رُو رعایت نہ کرو (وَيَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَيَّ مِثْلَ مَا تَعْمَلُونَ) (3)، میں بھی اپنا کام کروں گا (إِنِّي عَامِلٌ) لیکن تم جلد سمجھ جاؤ گے کہ کون رسوا کن عذاب میں گرفتار ہوتا ہے اور کون جھوٹا ہے، میں یا تم (سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ)۔ اور اب جب معاملہ اس طرح ہے تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں (وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ)۔ (4)

تم اپنی طاقت، تعداد، سرمائے اور اثر و رسوخ سے مجھ پر کامیابی کے انتظار میں رہو اور میں بھی انتظار میں ہوں کہ

عنقریب دردناک عذابِ الہی تم جیسی گمراہ قوم کے دامن گیر ہو اور تمہیں صفحہ ہستی سے مٹا دے۔

.....

۱۔ سفینۃ البحار، مادہ ”شعیب“۔

۱۔ عربی زبان میں جب کسی چیز کے بارے میں اپنی بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہیں تو کہتے ہیں ”جعلتہ تحت قدمی“ یا ”جعلتہ دیرا ذنی“ یا ”جعلتہ وراء ظہری“ یا ”جعلتہ ظہریا“ (یعنی وہ میرے زیر پا ہے یا میں نے اسے پس پشت ڈال رکھا ہے وغیرہ) اور ”ظہری“ کا مادہ ”ظہر“ (بروزن ”قہر“) ہے اور ”ی“ یہاں یاء نسبت ہے اور ”ظ“ کے نیچے زیر ان تبدیلیوں کی بناء پر ہے جو کبھی اسم منسوب میں کی جاتی ہے۔

2۔ ”مکانۃ“ مصدر یا اسم مصدر ہے اور یہ کسی چیز پر قدرت رکھنے کے معنی میں ہے۔

4۔ ”رقیب“ کا معنی ہے محافظ، نگران اور نگہبان، یہ دراصل ”رقیبہ“ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ”گردن“ یہ معنی اس کے لئے ہے کہ گردن کا محافظ اور نگران اس کی حفاظت کرتا ہے جو اس کی حفاظت میں ہو (یہ اس سے کنایہ ہے کہ اس کی جان کی حفاظت کرتا ہے) یا اس بنا پر کہ وہ گردن اونچی رکھتا ہے تاکہ پاسداری اور حفاظت کا کام انجام دے سکے۔

تفسیر نمونہ جلد 09

۹۴ وَمَا جَاءَ أَمْرُنَا نَجِيئًا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَأَخَذَتُ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ۔  
۹۵ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا الْأَبْعَدُ لِمَدِينٍ كَمَا بَعِدْتَ ثَمُودُ۔

ترجمہ

۹۴۔ اور جب ہمارا فرمان آپہنچا تو ہم نے شعیب کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت کے ذریعے نجات دی اور جنہوں نے ظلم کیا تھا انہیں (آسمانی) صیحہ نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے (اور مر گئے)۔  
۹۵۔ اس طرح کہ گویا وہ ان گھروں میں رہتے ہی نہ تھے، دور ہو مدین (رحمت خدا سے) جیسے کہ قوم ثمود دور ہوئی۔

مدین کے تباہ کاروں کا انجام

گزشتہ اقوام کی سرگزشت کے بارے میں قرآن مجید میں ہم نے بار بار پڑھا ہے کہ پہلے مرحلے میں انبیاء انہیں خدا کی طرف دعوت دینے کے لئے قیام کرتے تھے اور ہر طرح سے تعلیم و تربیت اور ہندونصیحت میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے، دوسرے مرحلے میں جب ایک گروہ پر ہند و نصاب کا کوئی اثر نہ ہوتا تو انہیں عذابِ الہی سے ڈراتے تاکہ وہ آخری افراد تسلیم حق ہو جائیں جو قبولیت کی اہلیت رکھتے ہیں اور وہ راہِ خدا کی طرف پلٹ آئیں نیز اتمام حجت ہو جائے۔

تیسرے مرحلے میں جب ان میں سے کوئی چیز موثر نہ ہوتی تو روئے زمین کی ستھرائی اور پاکبازی کے لئے سنتِ الہی کے مطابق عذاب آجاتا اور راستے کے ان کانتوں کو دُور کر دیتا۔

قوم شعیب یعنی اہل مدین کا بھی آخر کار مرحلہ انجام آپہنچا، چنانچہ قرآن کہتا ہے: جب (اس گمراہ، ظالم اور ہٹ دھرم قوم کو عذاب دئے جانے کے بارے میں) ہمارا فرمان آپہنچا تو ہم نے شعیب کو اور اس پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت کی برکت سے نجات دی (وَمَا جَاءَ أَمْرُنَا نَجِيئًا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا )، پھر آسمان پکار اور مرگ افریں عظیم صیحہ نے ظالموں اور ستمگروں کو اپنی گرفت میں لے لیا (وَأَخَذَتُ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ”صیحہ“ ہر قسم کی عظیم آواز اور پکار کے معنی میں ہے، قرآن نے بعض قوموں کی نابودی صیحہ آسمانی کے ذریعے بتائی ہے، یہ صیحہ احتمالاً صاعقہ کے ذریعے اور اس کی مانند ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم نے قوم ثمود کی داستان میں بیان کیا ہے کہ صوتی امواج بعض اوقات اس قدر قوی ہوسکتی ہیں کہ ایک گروہ کی موت کا سبب بن جائے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس آسمانی صیحہ کے اثر سے قوم شعیب کے لوگ اپنے گھروں میں منہ کے بل جاگرے اور

مرگئے اور ان کے بے جان جسم درس عبرت بنے ہوئے ایک مدت تک وہیں پڑے رہے ( فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَائِمِينَ )، ان کی زندگی کی کتاب اس طرح بند کر دی گئی کہ ” گویا کبھی وہ اس سر زمین کے ساکن ہی نہ تھے“ (كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا)۔ وہ تمام دولت و ثروت کہ جس کی خاطر انہوں نے گناہ اور ظلم و ستم کئے نابود ہو گئی، ان کی زمینیں اور زرق و برق زندگی ختم ہو گئی اور ان کا شور و غوغا خاموش ہو گیا اور آخر کار جیسا کہ قوم عاد و ثمود کی داستان کے آخر میں بیان ہوا ہے، فرمایا گیا: دور ہوسر زمین مدین لطف و رحمت پروردگار سے جیسے کہ قوم ثمود دور ہوئی (الْأَبْعَدَا لِمَدْيَنٍ كَمَا بَعَدَتْ ثَمُودُ)۔ واضح ہے کہ یہاں ”مدین“ سے مراد اہل مدین ہیں جو رحمتِ خدا سے دور ہوئے۔

شعیب (علیہ السلام) کی داستان میں تربیتی درس انبیاء کے حالات اور گزشتہ اقوام کی داستانیں ہمیشہ بعد کی اقوام کے لئے الہام بخش اور سبق آموز ہوتی ہیں کیونکہ ان کی زندگی کی آزمائشیں کہ جو بعض اوقات دسیوں سال یا سینکڑوں سال تک جاری رہیں تاریخ کے چند صفحات میں سمٹ کر سب کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں اور ہر کوئی اپنی زندگی میں ان سے سبق حاصل کر سکتا ہے۔ اس عظیم پیغمبر۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) کی زندگی بھی ہمیں بہت سے درس دیتی ہے، مثلاً:

#### ۱۔ اقتصادی مسائل کی اہمیت

اس سرگزشت میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) نے انہیں دعوتِ توحید کے بعد مالی امور تجارت میں حق و عدالت کی دعوت دی، یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ ایک معاشرے کے اقتصادی مسائل کو معمولی اور غیر اہم شمار نہیں کیا جاسکتا، یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ انبیاء صرف اخلاقی مسائل کے لئے مامور نہ تھے بلکہ اجتماعی و اقتصادی کیفیت کی خرابی کی اصلاح بھی ان کی دعوت کا ایک اہم حصہ تھی، اس حد تک اہم کہ وہ اسے دعوتِ توحید کے ساتھ قرار دیتے تھے۔

#### ۲۔ نماز توحید اور پاکیزگی کی طرف دعوت دیتی ہے

حضرت شعیب (علیہ السلام) کی گمراہ قوم نے بڑے تعجب سے ان سے پوچھا کہ کیا تیری یہ نماز بتوں کی پرستش نہ کرنے اور کم فروشی اور دھوکہ بازی نہ کرنے کی دعوت دیتی ہے، شاید ان کا خیال تھا کہ ان حرکات اور انکار کا ان امور میں کیا دخل ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان قوی ترین رابطہ ہے، اگر نماز اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ ادا ہو یعنی انسان اپنے تمام وجود کے ساتھ بارگاہِ الہی میں کھڑا ہو تو یہ حضور تکامل و ارتقاء کا زینہ، تربیتِ روح کا وسیلہ اور دل سے گناہ کا رنگ صاف کرنے کا ذریعہ ہے، یہ حضور انسان کے ارادہ کو قوی اور اس کے عزم کو راسخ کرتا ہے اور غرور و تکبر کو اس سے دور کرتا ہے۔

#### ۳۔ خود بینی جمود کا باعث ہے

جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے قوم شعیب کے افراد خود خواہ اور خود بین تھے، اور اپنے آپ کو فہمیدہ اور سمجھدار خیال کرتے تھے، حضرت شعیب (علیہ السلام) کو نادان سمجھتے تھے ان کا مذاق اڑاتے تھے، ان کی باتوں کو بے معنی اور ان کی شخصیت کو کمزور جانتے تھے، اس خود پرستی اور خود بینی نے ان کی زندگی کو تاریک کر دیا تھا اور انہیں خاک سیاہ پر لایٹھایا تھا۔

نہ فقط انسان بلکہ اگر جانور بھی خود بین ہو تو وہ راستے میں الٹک کر رہ جاتا ہے، کہتے ہیں گھوڑا سوار ایک شخص ایک نہر کے پاس پہنچا لیکن اس نے حیرت سے دیکھا کہ گھوڑا ایک چھوٹی سی اور کم گہری نہر میں گزرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اس نے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا، ایک دانا شخص کا وہاں سے گزر ہوا، اس نے کہا: نہر کے پانی کو ہلاؤ تاکہ وہ مٹی سے آلودہ ہو جائے، مشکل حل ہو جائے گی، اس نے یہ کام کیا، گھوڑے نے آرام سے اسے عبور کر لیا، اس پر لوگ بہت حیران ہوئے، انہوں نے اس دانا شخص سے اس کی وجہ دریافت کی۔

اس مردِ حکیم نے کہا: جب پانی صاف تھا تو گھوڑے نے اپنا عکس پانی میں دیکھا، اس نے سمجھا کہ یہ وہ خود ہے، وہ تیار نہ ہوا کہ اپنا ہی پاؤں اپنے آپ پر رکھے لیکن جب پانی مٹی سے آلودہ ہو گیا تو اس کا عکس غائب ہو گیا اور وہ آسانی سے وہاں سے گزر گیا۔

#### ۴۔ اصولوں کو تعصب پر قربان نہیں کرنا چاہئے

اس سرگزشت میں ہم نے پڑھا ہے کہ گمراہ قوم کی بدبختی کے عوامل میں سے ایک یہ تھا کہ وہ ذاتی کینہ پرستی اور عداوتوں کی وجہ سے حقائق کو بھلا دیتے تھے حالانکہ عقلمند اور حقیقت شناس وہ انسان ہے کہ ہر شخص سے حق بات سنے اور اسے قبول کرے چاہے کہنے والا اس کا اول درجے کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ ایمان اور عمل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں ابھی بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جن کا خیال ہے کہ صرف عقیدہ رکھ کر ہی مسلمان ہوا جاسکتا ہے، اگرچہ وہ عمل نہ بھی کریں، بہت سے ایسے افراد ہیں کہ جو چاہتے ہیں کہ دین ان کی سرکش ہوا بوس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنے، اور انہیں ہر لحاظ سے آزاد رکھے۔

داستانِ شعیب (علیہ السلام) سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم بھی ایسے ہی دین کی خواہاں تھی، لہذا وہ حضرت شعیب (علیہ السلام) سے کہتے تھے کہ ہم نہ اس کے لئے تیار ہیں اور نہ اپنے بڑوں کے بتوں کو فراموش کریں اور نہ ہم اپنے سرمائے اور اموال کے بارے میں اپنی آزادی ہاتھ سے دیں گے، وہ یہ بات بھولے ہوئے تھے کہ اصولی طور پر شجرِ ایمان کا ثمر عمل ہے اور انبیاء کا دین و آئین اس لئے تھا کہ انسان کی ذاتی خرابیوں عملی کمزوریوں اور انحرافات کی اصلاح کرے ورنہ جس درخت کی نہ کوئی شاخ ہو نہ پتے اور نہ پھل وہ جلانے کے ہی کام آئے گا۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں ایک طبقے میں یہ فکر بڑی راسخ ہو چکی ہے، وہ اسلام کو بس خشک عقائد کا ایک ایسا مجموعہ سمجھتے ہیں کہ جو فقط مسجد کے اندر ان کے ساتھ ہے اور جو نہی وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکلتے ہیں تو اسے خدا حافظ کہہ دیتے ہیں، ان کے دفاتروں میں، بازاروں میں اور کاروبار میں اسلام کا کوئی عمل دخل اور نام و نشان نہیں ہے۔

بہت سے اسلامی ممالک کو ہم نے دیکھا ہے یہاں وہ ممالک جو ظہورِ اسلام کا مرکز تھے وہاں یہ تلخ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام چند عقائد اور چند کم روح عبادات میں منحصر ہو گیا ہے، علم و آگاہی، عدالتِ اجتماعی، رشدِ ثقافتی، بینشِ فرہنگی اور اخلاقِ اسلامی میں سے کسی چیز کا نام و نشان اور خبر نہیں ہے، اگرچہ خوش بختی سے چند ایک اسلامی تحریکوں کی وجہ سے خصوصاً نوجون طبقے میں سچے اسلام اور ایمان و عمل کی یکجائی کی ایک تحریک پیدا ہوتی ہے، لہذا اب یہ جملہ کہ اسلام کو ہمارے عمل سے کیا کام یا اسلام کا تعلق دل سے ہے نہ کہ زندگی سے، کم سنا جاسکتا ہے۔ نیز یہ جو التقاطی لوگوں (کہ جو کسی ایک مکتب کے پیروکار نہیں ہوتے) کا نظریہ ہے کہ ہم عقیدہ اسلام سے اور اقتصادیات مارکس سے لیتے ہیں یہ بھی قومِ شعیب کے گمراہوں کی سی طرزِ تفکر رکھتے ہیں، یہ نظریہ بھی قابلِ مذمت ہے، لیکن بہر حال یہ تفرقہ بھی قدیم زمانے سے ہے اور آج بھی موجود ہے، ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔

۶۔ بلا شرط اور لامحدود ملکیت فساد کا سرچشمہ ہے

قومِ شعیب اس اشتباہ میں گرفتار تھی کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی شخص کے لئے اس کے اموال میں تصرف کے بارے میں تھوڑی سے بھی حد بندی کی بات کرے، یہاں تک کہ وہ حضرت شعیب (علیہ السلام) سے تعجب کرتے اور کہتے تھے کہ تجھ سا دانا شخص کیونکر ہمارے اموال کے بارے میں ہماری آزادی عمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے، انہوں نے یہ بات تمسخر کے طور پر کہی یا حقیقت کے طور پر نشاندہی کرتی ہے کہ وہ مالی تصرفات میں کسی حد بندی کو خلاف عقل سمجھتے تھے، حالانکہ یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی، اگر لوگ اپنے اموال میں تصرف کرنے کے بارے میں آزاد ہوں تو پورا معاشرہ بد بختی اور خرابی کی لپیٹ میں آجائے گا، مالی امور کو صحیح اور نپے تلے ضوابط کے تابع ہونا چاہیے، جیسے انبیائے الہی لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے ورنہ معاشرہ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔

۷۔ انبیاء کا ہدف فقط اصلاح تھا

یہ جو حضرت شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا: ”ان ارید الاصلاح ما استطعتم“ (میں تو فقط حتی المقدور اصلاح چاہتا ہوں) یہ فقط ان کا شعار نہ تھا بلکہ تمام انبیاء اور تمام حقیقی رہبروں کا شعار تھا، ان کا گفتار و کردار ان کے اس ہدف کا شاہد ہے، وہ نہ لوگوں کی مشغولیت کے لئے آئے تھے، نہ ان کے گناہ بخشنے کے لئے، نہ انہیں جنت بھیجنے کے لئے، نہ طاقتوروں کی حمایت کے لئے اور نہ عوام کے ذہنوں کو ماؤف کرنے کے لئے بلکہ ان کا ہدف اور مقصد ایک مکمل اور حقیقی اصلاح تھا، اصلاح سے ان کی مراد وسیع تر اصلاح تھی، فکر و نظر کی اصلاح، اخلاق کی اصلاح، معاشرے کے ثقافتی نظام کی اصلاح، اقتصادی اصلاح اور سیاسی اصلاح۔

خلاصہ یہ کہ معاشرے کے تمام پہلوؤں کی اصلاح ان کے مدنظر تھی۔

اور اس مقصد کے حصول کے لئے ان کا سہارا فقط خدا تھا، وہ کسی سازش اور دھمکی سے نہیں ڈرتے تھے جیسا کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) نے کہا:

وَمَا تُؤْفِقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَالِيهِ أُنِيبُ.

۹۶ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ  
 ۹۷ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَأْنَاهُ فَاتَّبِعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ  
 ۹۸ يُقَدِّمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَيَنْسَ الْوَرْدُ الْمَوْرُودُ  
 ۹۹ وَأَتَّبِعُوا فِي هَذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَنْسَ الرَّفْدُ الْمَرْفُودُ

ترجمہ

۹۶۔ ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا۔  
 ۹۷۔ فرعون اور اس کے حواریوں کی طرف انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی جبکہ فرعون کا حکم رشد و نجات کا باعث نہیں تھا۔

۹۸۔ وہ روز قیامت اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور وہ انہیں (جنت کے خوشگوار چشموں کی طرف لے جانے کی بجائے) آتش جہنم میں پہنچادے گا اور کتنا بُرا ہے کہ آگ انسان کے لئے پانی کا گھاٹ قرار پائے۔  
 ۹۹۔ وہ اس جہان میں اور روز قیامت رحمتِ خدا سے دُور ہوں گے اور انہیں کیا بُرا تحفہ دیا جائے گا۔

فرعون کے ساتھ زبردست مقابلہ  
 حضرت شعیب (علیہ السلام) اور اہل مدین کی داستان ختم ہونے کے بعد اب اشارہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بن عمران کی سرگزشت کے ایک پہلو کی طرف کیا گیا ہے، یہاں فرعون کے ساتھ ان کے مقابلوں کا ذکر ہے اور اس سورہ میں یہ انبیاء الہی سے متعلق ساتویں داستان ہے۔

تمام پیغمبروں کی نسبت قرآن میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا واقعہ زیادہ آیا ہے، تیس سے زیادہ سورتوں میں موسیٰ (علیہ السلام) و فرعون اور بنی اسرائیل کے واقعہ کی طرف سو سے زیادہ مرتبہ اشارہ ہوا ہے۔  
 حضرت صالح (علیہ السلام) شعیب (علیہ السلام) اور لوط (علیہ السلام) جیسے انبیاء کہ جن کے واقعات ہم پڑھ چکے ہیں کی نسبت حضرت موسیٰ کے واقعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان انبیاء نے گمراہ قوموں کے خلاف قیام کیا تھا۔  
 اصولی طور پر صاف پانی کے لئے چشمے کو صاف کرنا چاہیے، جب تک فاسد حکومتیں برسرِ اقتدار ہیں کوئی معاشرہ شہادت اور نیک بختی کا منہ نہیں دیکھے گا، خدائی رہبروں کو ایسے معاشروں میں سب سے پہلے فساد کے ان مراکز کو درہم و برہم کرنا چاہیے۔

توجہ رہے کہ یہاں ہم حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی سرگزشت کے ایک مختصر گوشے کا مطالعہ کریں گے کہ جو مختصر ہونے کے باوجود تمام انسانوں کو ایک عظیم پیغام دے رہا ہے۔  
 پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ہم نے موسیٰ کو اپنے عطا کردہ معجزات اور قوی دلیل کے ساتھ بھیجا (وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ)۔

”سلطان“ کا معنی ”تسلط“، یہ کبھی ظاہری تسلط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی منطقی تسلط کے معنی میں، یعنی ایسا تسلط کہ کہ جو مخالف کے سامنے ایسی دیوار بن جائے کہ اسے فرار کا کوئی راستہ نہ ملے۔  
 مندرجہ بالا آیت میں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ”سلطان“ دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے اور لفظ ”آیات“ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے واضح معجزات کی طرف اشارہ ہے، مفسرین نے ان دو لفظوں کے بارے میں احتمالات بھی ذکر کئے ہیں۔

بہر حال موسیٰ (علیہ السلام) کو سرکوبی کرنے والے ان معجزات اور قوی منطق کے ساتھ ”ہم نے فرعون اور اس کے اطرافیوں کی طرف بھیجا“ (إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَأْنَاهُ) جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے ”ملا“ ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ جن کا ظاہر آنکھوں کو پُر کر دیتا ہے اگرچہ وہ اندر سے خالی ہوتے ہیں، منطق قرآن میں اس کا اطلاق زیادہ تر اعیان و اشراف اور پُر فریب اشخاص پر ہوتا ہے جو ظالم طاقتوں کے گرد رہتے ہیں۔

فرعون کے اطرافی جو دیکھ رہے تھے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قیام سے ان کے ناجائز مفادات خطرے میں ہیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات اور منطق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر تیار نہ ہوئے ”لہذا انہوں نے حکم فرعون کی پیروی کی“ (فَاتَّبِعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ)۔ مگر فرعون کا حکم برگر ان کی سعادت کا ضامن اور سرمایہ رشد و نجات نہیں ہوسکتا تھا (وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ)۔

البتہ فرعون کو یہ مقام آسانی سے نہیں مل گیا تھا بلکہ اس نے اپنے مقاصد کے لئے ہر طرح کے سازشی حربے استعمال کی اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا، یہاں تک کہ وہ اس کے لئے نفسیاتی ہتھکنڈہ ہاتھ سے جانے سے نہیں دیتا تھا۔

کبھی وہ کہتا تھا کہ موسیٰ چاہتا ہے کہ تم سے زمینیں، ہتھیالے اور تمہیں کہ جو ان کے اصلی مالک ہو نکال باہر کرے، قرآن نے اس بات کو یوں نقل کیا ہے:

(اعراف/۱۱۰)

کبھی وہ اپنی قوم کے مذہبی احساس کو تحریک دیتا اور کہتا:

میں اس سے ڈرتا ہوں کہ یہ کہیں تمہارے دین ہی کو نہ بدل ڈالے۔ (المومن/۲۶) کبھی کہتا:

مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہاری زمین پر فتنہ و فساد برپا نہ کر دے۔ (المومن/۲۶)

کبھی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر تہمت لگاتا، کبھی انہیں دھمکی دیتا، کبھی اہل مصر کے سامنے اپنی قدرت و شوکت کا مظاہرہ کرتا اور کبھی مکاری سے اپنے آپ کو ایک ایسے رہبر کی حیثیت سے پیش کرتا کہ جو ان کی خیر اور اصلاح کا ضامن ہے اور چونکہ روز قیامت ہر قوم و ملت اور ہر گروہ اپنے رہبر کے ساتھ محشور ہوگا اور جہاں کے رہبر وہاں بھی رہبر شمار ہوں گے لہذا فرعون بھی کہ جو اپنے زمانے کے گمراہوں کا رہبر تھا، میدان حشر میں ان کے آگے آگے ہوگا (يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)۔ لیکن یہ پیشوا اپنے پیروکاروں کو اس جلاذینے والی گرمی میں کسی ٹھنڈے میٹھے پانی کے خوشگوار چشمے کے کنارے لے جانے کے بجائے انہیں آتش جہنم میں لے کر داخل ہوگا (فَأُورِدَهُمُ النَّارَ)۔ اور کیسی بُری چیز ہے کہ آگ انسان کے لئے پانی کا گھاٹ قرار پائے کہ جس میں وہ اخل ہو (وَبِئْسَ الْوَرْدُ الْمُؤْرُوْدُ)۔ وہ چیز کہ جو تشنگی دور کرنے کے بجائے انسان کے سارے وجود کو جلا دے اور سیراب کرنے کی بجائے اس کی پیاس اور بھڑکادے۔

توجہ رہے کہ ”ورود“ در اصل پانی کی طرف چلنے اور س کے قریب ہونے کے معنی میں ہے لیکن بعد ازاں ہر قسم کی چیز کے کسی چیز پر داخل ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

”ورد“ (بروزن ”ذکر“) اس پانی کو کہتے ہیں جس پر انسان وارد ہو اور پانی پر وارد ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

اور ”مورود“ اس پانی کو کہتے ہیں جس پر وارد ہوا جائے (یہ اسم مفعول ہے)۔

اس بناء پر ”بئس الورد المورود“ کا معنی یہ ہوگا: آگ پانی پینے کی بُری جگہ ہے کہ جس پر وہ وارد ہوں گے۔ (۱) اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس دنیا کے ہمارے اعمال و افعال ایک وسیع صورت (ENLRRGED FORM) میں مجسم ہوں گے، اُس جہاں کی خوش بختیاں اور بدبختیاں ہمارے اِس جہاں کے کاموں کا پرتو ہیں، جو اشخاص یہاں اہل بہشت کے رہبر و رہنما ہیں وہاں بھی مختلف گروہوں کو جنت اور سعادت کی طرف لے جائیں گے اور خود ان کے آگے آگے ہوں گے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اِس جہاں میں وہ لعنتِ خدا سے ملحق ہو گئے، سخت عذاب اور سزا میں گرفتار ہو گئے اور ٹھاٹھیں نارتنی ہوئی موجوں میں وہ غرق ہو گئے اور روزِ قیامت بھی رحمتِ الہی سے دور ہوں گے (وَأُتْبِعُوا فِي هَذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ)۔

ان کا ننگین نام صفحات تاریخ میں ہمیشہ کے لئے ایک گمراہ اور جابر قوم کے عنوان سے ثبت ہوگا، لہذا انہیں اس دنیا میں نقصان اٹھانا پڑا اور دوسرے جہاں میں بھی اور جہنم کی آگ انہیں دیا جانے والا کیسا بُرا عطیہ ہے (بِئْسَ الرَّفْدُ الْمَرْفُوْدُ)۔

”رفد“ در اصل کوئی کام انجام دینے میں مدد کرنے کے معنی میں ہے، یہاں تک کہ اگر کسی چیز کو دوسری چیز کا سہارا قرار دیا جائے تو اسے بھی ”رفد“ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ لفظ عطا اور بخشش کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ عطا کرنے والے کی طرف سے اس کی مدد ہوتی ہے جسے عطا کی جارہی ہو۔

.....

۱. ترکیب نحوی کے لحاظ سے یہ جملہ اس طرح ہے:  
 ”بنس“ فعل ذم ہے، اس کا فاعل ”الورد“ ہے، ”المورود“ صفت ہے اور مخصوص بالذم لفظ ”النار“ ہے، جو محذوف ہے۔  
 بعض ادباء نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ ”المورود“ مخصوص بالذم ہے اور آیت میں کوئی چیز محذوف نہیں ہے، لیکن پہلا احتمال  
 زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔  
 ترکیب نحوی کے لحاظ سے یہ جملہ اس طرح ہے جس طرح ہم نے ”بنس الورد المورود“ بیان کیا ہے۔

۱۰۰ ذَلِكِ مِنْ أَنْبَاءِ الْفَرَىٰ نَقَصُ عَلَيْكَ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ  
 ۱۰۱ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ لَمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوهُمْ  
 غَيْرَ تَنْثِيْبٍ  
 ۱۰۲ وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْفَرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ  
 ۱۰۳ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِمَنْ خَافَ عَذَابَ الْأَجْرَةِ ذَلِكَ يَوْمٌ مَجْمُوعٌ لَهٗ النَّاسُ وَذَلِكَ يَوْمٌ مَشْهُودٌ  
 ۱۰۴ وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَعْدُودٍ

ترجمہ

۱۰۰۔ یہ شہروں اور آبادیوں کی خبریں ہیں کہ جو ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں کہ جن میں سے بعض ابھی تک قائم ہیں اور  
 بعض کٹ چکی ہیں (اور ختم ہو چکی ہیں)۔  
 ۱۰۱۔ ہم نے ان پر ظلم کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور جب عذاب الہی کا حکم آپہنچا تو خدا کہ جنہیں  
 وہ ”اللہ“ کے سوا پکارتے تھے انہوں نے ان کی مدد نہ کی اور ان کے لئے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔  
 ۱۰۲۔ اور تیرے پروردگار کا عذاب ایسا ہی ہوتا ہے جب وہ ظالم شہروں اور آبادیوں کو سزا دیتا ہے (جی ہاں) اس کی سزا  
 اور عذاب دردناک اور شدید ہوتا ہے۔  
 ۱۰۳۔ اس میں اس شخص کے لئے نشانی ہے کہ جو عذابِ آخرت سے ڈرتا ہے، وہی دن کہ جب لوگ جمع ہوں گے اور وہ  
 دن کہ جس کا مشاہدہ سب کریں گے  
 ۱۰۴۔ اور ہم اس میں محدود مدت کے سوا تاخیر نہیں کریں گے۔

تفسیر

اس سورہ کی آیات میں گذشتہ اقوام میں سے سات کی سرگزشت بیان کی گئی ہے اور کچھ حصہ ان کے انبیاء کی تاریخ کا  
 بھی بیان ہوا ہے، ان میں سے ہر سرگزشت بھرپور انسانی زندگی کے مختلف زاویوں کا اہم حصہ واضح کرتی ہے اور ہر  
 ایک میں عبرت کے بہت سے درس ہیں، یہاں ان تمام واقعات کی طرف مجموعی طور پر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:  
 یہ شہروں اور آبادیوں کے واقعات کا ایک حصہ ہے کہ جو ہم تجھ سے بیان کر رہے ہیں (ذَلِكِ مِنْ أَنْبَاءِ الْفَرَىٰ نَقَصُ عَلَيْكَ)  
 - وہی شہر اور آبادیاں جن کے کچھ حصے ابھی قائم ہیں اور حصے کشتِ زار کی طرح کٹ چکے ہیں اور تباہ ہو چکے ہیں  
 (مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ)۔

”قَائِمٌ“ گزرتہ اقوام کے ان شہروں اور آبادیوں کی طرف اشارہ ہے جو ابھی باقی ہیں، مثلاً سرزمین مصر کہ جہاں فرعون  
 رہا کرتے تھے اور یہ علاقہ اس ظالم قوم کے غرق ہوجانے کے بعد بھی اسی طرح باقی رہے، اس کے باغات، کھیت اور  
 بہت سی خیرہ کن عمارتیں ابھی تک باقی ہیں۔  
 ”حَصِيدٌ“ کا معنی ہے ”کٹ جانے والی“ یہ ایسی سرزمینوں اور بستیوں کی طرف اشارہ ہے جو قوم نوح اور قوم لوط کے  
 علاقوں کی طرح ہیں کہ جن میں سے ایک بستی پانی میں غرق ہو گئی اور دوسری زیر و زبر ہو گئی اور ان پر سنگباری  
 ہوئی۔

لیکن یہ گمان نہ کرنا کہ ہم نے ان پر ظلم کیا ہے بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے (وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ)۔  
 انہوں نے بتوں اور جھوٹے خداؤں کی پناہ لی لیکن وجہ جن خداؤں کو پروردگار کے مقابلے میں پکارتے تھے انہوں نے ان  
 کی کوئی مشکل حل نہ کی (فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ لَمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ)۔  
 جی ہاں! ان مکار اور دھوکا باز خداؤں نے ان کے ضرر، نقصان، ہلاکت اور بدبختی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کیا  
 (وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَنْثِيْبٍ) (۱)۔

جی ہاں! تیرے پروردگار کی سزا ان شہروں اور آبادیوں کے لئے اسی طرح تھی جنہوں نے ظلم کیا کہ جب اللہ نے انہیں

سپرد ہلاکت کیا (وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ)۔ یقیناً اللہ کی سزا اور عذاب دردناک اور شدید ہے (إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ)۔

یہ خدا کا الیک عمومی قانون ہے، یہ ایک ہمیشگی مناسبت اور دائمی طریقہ ہے کہ جو قوم ملت اپنے ہاتھ آلودہ ظلم کرے، آلودہ ظلم کرے، خدائی فرامین کی سرحد سے تجاوز کرے اور انبیاء الہی کی رہبری، رہنمائی اور پند و نصائح کی پرواہ نہ کرے تو خدا آخر کار انہیں سختی سے جکڑ لیتا ہے اور پنجہ عذاب میں پکڑ لیتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مندرجہ بالا طریقہ کار ایک عمومی طرز عمل ہے اور دائمی سنت ہے، یہ سنت دیگر قرآن آیات سے بھی اچھی طرح معلوم ہوسکتی ہے، یہ حقیقت دراصل تمام اہل دنیا کو خبردار کرتی ہے کہ تم خیال نہ کرو کہ تم اس قانون سے مستثنیٰ ہو یا یہ کہ حکم گزشتہ اقوام کے ساتھ مخصوص تھا۔

البتہ ”ظلم“ کے وسیع معنی میں تمام گناہ شامل ہیں۔ نیز جو ”ہی ظالمة“ کہہ کر بستی، شہر اور آبادی کو ظالم کہا گیا ہے حالانکہ یہ صفت شہر اور آبادی کے ساکنوں سے مربوط ہے، یہ گویا اس لطیف نکتے کی پرطرف اشارہ ہے کہ وہ ظلم و ستم اور بیدادگری میں اتے ڈوبے ہوئے ہیں کہ گویا شہر کا شہر ظلم و ستم کا حصہ بن گیا ہے، یہ تعبیر فارسی زبان کی اس تعبیر سے ملتی ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شہر کے در و دیوار سے ظلم برستا ہے، اور یہ چونکہ ایک عمومی قانون ہے اس لئے بلافاصلہ فرمایا گیا ہے: یہ عبرت انگیز سرگزشتیں اور دردناک شوم اور منحوس حوادث کہ جو گزشتہ لوگوں پر گزرے ہیں ان میں ان راہ حق پانے والوں کے لئے نشانی ہے کہ عذاب آخرت کے مقابلے سے ڈرتے ہیں (إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ)۔ کیونکہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز حقیر اور معمولی ہے یہاں تک کہ اس سزائیں اور عذاب بھی، دوسرا جہان پر لحاظ سے وسیع تر ہے اور وہ لوگ جو قیامت پر ایمان رکھتے ہیں دنیا کے یہ نمونے دیکھ کر بل جاتے ہیں، عبرت حاصل کرتے ہیں اور ان کے سامنے راستہ کھل جاتا ہے۔

آیت کے آخر میں روز قیامت کے دو اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ ایسا دن ہے کہ جس میں سب لوگ جمع ہوں گے (ذَلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لُّهُ النَّاسُ)۔ وہ ایسا دن ہے کہ جو تمام لوگوں کا مشہود ہے (وَذَلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جیسے اس جہان میں خدائی قوانین و سنن عمومی اور سب کے لئے ہیں اُس عدالت میں بھی لوگوں کا اجتماع ہوگا، یہاں تک کہ ایک ہی وقت اور زمانے میں ہوگا، ایسا دن جو سب کے لئے واضح اور آشکار ہے، اس طرح کہ تمام انسان اس میں حاضر ہوں گے اور اسے دیکھیں گے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ فرمایا گیا ہے: ”يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لُّهُ النَّاسُ“ یعنی ایسا دن جس کے لئے لوگ جمع ہوں گے، یہ نہیں کہا کہ ”فیه النَّاسُ“ یعنی اس میں لوگ جمع ہوں گے، یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا دن صرف ایسا ظرف نہیں ہے کہ جس میں لوگ جمع ہوں گے بلکہ ایک ہدف اور مقصد ہے کہ جس کی طرف انسان اپنے تکامل و ارتقاء کے لئے بڑھیں گے۔

سورہ تغابن کی آیت ۹ میں بھی ہے:

وہ دن کہ جو جمع کرنے اور اجتماع کا دن ہے، جو تم سب کو اکٹھا کرے گا اور وہ ایسا دن ہے کہ جس میں سب احساس زیاں کریں گے۔

چونکہ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ اس دن کے بارے میں گفتگو کرنا ادھار والی بات ہے، معلوم نہیں وہ کب آئے گا؟ لہذا قرآن بلافاصلہ کہتا ہے: اس دن کو ہم صرف ایک محدود زمانے کے لئے تاخیر میں ڈالیں گے (وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مُّعَدُّودٍ)۔ وہ بھی ایک مصلحت کے لئے جو واضح ہے تاکہ عالم دنیا کے لوگ آزمائش اور پرورش کے میدان دیکھ لیں اور انبیاء کا آخری پروگرام عمل شکل اختیار کر لے اور یہ جہان تکامل و ارتقاء کے جس آخری سلسلے کی استعداد رکھتا ہے وہ ظاہر ہوجائے اور پھر اس جہان کے اختتام کا اعلان کیا جائے۔

”معدود“ (یعنی شمار کیا ہوا)، یہ تعبیر قیامت کے نزدیک ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جو چیز قابل شمار اور گنی جاسکے وہ محدود اور نزدیک ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس دن کی تاخیر ظالموں کو ہرگز مغرور نہ کر دے کیونکہ اگرچہ دیر ہوجائے قیامت آکر رہے گی یہاں تک کہ اس کے لئے دیر سے آنے کی تعبیر بھی صحیح نہیں ہے۔

.....

۱۔ ”تتیب“ کا مادہ ”تب“ ہے اس کا معنی ہے نقصان اور خسارے میں استمرار، نیز یہ لفظ ہلاکت اور نابودی کے معنی میں بھی آیا



تفسیر نمونہ جلد 09

۱۰۵ یَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ  
 ۱۰۶ فَأَمَّا الَّذِينَ شَفَعُوا فِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ  
 ۱۰۷ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ  
 ۱۰۸ وَأَمَّا الَّذِينَ سَعَدُوا فِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاءٌ غَيْرَ مَجْذُودٍ

ترجمہ

- ۱۰۵۔ اور جس روز (قیامت آجائے گی، کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر بات نہیں کرے گا، ان میں سے ایک گروہ شقی ہے اور ایک گروہ سعادت مند (ایک گروہ بدبخت ہے اور ایک نیک بخت ہے)  
 ۱۰۶۔ جو شقی ہیں وہ آگ میں ہیں اور ان کے لئے زفیر و شہیق (طویل اور دم گھٹتے والے نالے) ہیں۔  
 ۱۰۷ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے کیونکہ تیرا پروردگار جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے۔  
 ۱۰۸۔ لیکن جو سعادت مند ہیں وہ جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہمیشہ جنت میں رہیں گے مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے، بخشش سے منقطع نہ ہونے والی۔

سعادت مند و شقاوت مندیا مشکلات؟

گزشتہ آیت میں مسئلہ قیامت اور اس عظیم عدالت میں تمام لوگوں کے اجتماع کی طرف اشارہ ہوا تھا، زیر بحث آیات میں اس دن لوگوں کے انجام کے ایک پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔  
 پہلے ارشاد ہوتا ہے: جب تک وہ دن آپہنچے گا تو پروردگار کے ارادے کے بغیر کوئی شخص بات نہیں کرسکے گا (يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ)۔  
 بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آیت جو اُس دن اذن الہی سے لوگوں کو بات کرنے کی دلیل ہے اُن آیات کے منافی ہے جو مطلقاً بات کرنے کی نفی کرتی ہیں، مثلاً سورہ یسین کی آیہ ۶۵:

آج کے دن ان کے دہنوں پر مہر لگادیں گے اور ہمارے ساتھ ان کے ہاتھ بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے، ان کاموں کی جو وہ انجام دیتے تھے۔  
 سورہٴ مرسلات کی آیت ۳۵ میں ہے:

یہ وہ دن ہے جس میں وہ بول نہیں سکیں گے۔

اسی بناء پر بعض عظیم مفسرین کا نظریہ ہے کہ اصولی طور پر اس دن بات کرنے کا کوئی مفہوم نہیں کیونکہ ”بات کرنا“ تو ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم انسان کے اندر کے حالات معلوم کرتے ہیں، اگر ہماری کوئی ایسی حس ہوتی کہ جس سے ہم پر شخص کے افکار معلوم کرسکتے تو گفتگو کی برکز ضرورت نہ ہوتی، اس بناء پر قیامت میں جو اسرار ظاہر ہوں گے اور ہر چیز ”بروز و ظہور“ کی حالت ظاہر ہوجائے گی تو اصولاً بات کرنے اور تکلم کا کوئی معنی نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں آخرت کا گھر جزا کا گھر ہے نہ کہ عمل کا، لہذا ارادے اور اختیار سے انسان کے بات کرنے کی کوئی خبر نہیں ہے بلکہ وہاں انسان ہے، اس کے اعمال ہیں اور جو کچھ ان سے مربوط ہے، اس لئے کہ اگر وہاں انسان بات بھی

کرے گا تو وہ دنیا میں کی جانے والی باتوں کی طرح نہیں ہوگی کہ جن کا سرچشمہ خود اس کا اختیار اور ارادہ ہوتا ہے اور جو اندرونی اسرار کا ظاہر کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں، وہاں وہ جو کچھ کہے وہ ایک قسم کا اس کے اعمال کا عکس العمل ہوگا، وہ اعمال کہ جو وہاں ظاہر و آشکار ہیں، لہذا اس دن بات کرنا دنیا میں بات کرنے کی طرح نہیں ہے کہ انسان اپنے میل و رغبت سے جھوٹ سچ کہہ سکے۔

بہرحال وہ دن حقائق اشیاء کے کشف اور ”غیب“ کے شہود کی طرف پلٹ آنے کا دن ہے اور وہ اس جہان کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔

لیکن، مندرجہ بالا آیت سے مذکورہ نتیجہ نکالنا قرآن کی دیگر آیات کے ظاہری مفہوم سے زیادہ مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ قرآن مومنین اور مجرمین کی پیشواؤں، جابروں اور ان کے پیروکاروں کی، اسی طرح شیطان اور اس کے فریب خوردگان کی اور دوزخیوں اور جنتیوں کی گفتگو نقل کرتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس جہان میں بھی اِس جہان کی سی باتوں کا وجود ہے۔

یہاں تک کہ قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ گنہگار بعض سوالات کے جواب میں جھوٹ بھی بولیں گے، مثلاً سورہ انعام کی آیہ ۲۲ تا ۲۴ میں ہے:

وہ دن کہ جس دن ہم ان کے سب کو محشور کریں گے، مشرکین سے کہیں گے کہ وہ معبود جنہیں تم خدا کا شریک سمجھتے تھے کہاں ہیں؟ ان کا جواب اور غدر اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا کہ وہ کہیں گے کہ اس خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں تھے، دیکھو وہ کس طرح اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہیں اور جسے وہ خدا جھوٹا شریک خیال کرتے تھے اسے بھی باتھ سے دے بیٹھیں گے۔

اس بناء پر بہتر ہے کہ ہم بات کرنے سے متعلق ظاہر آیات کے تناقض سے مربوط سوال کا وہی جواب دیں جو بہت سے مفسرین نے دیا ہے اور وہ یہ کہ اس دن لوگ کئی مرحلوں سے گزریں گے کہ جن میں ہر ایک کی کچھ خصوصیات ہیں، کچھ مراحل ہیں ان میں سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی، یہاں تک کہ ان کے منہ پر مہر لگادی جائے گی صرف ان کے اعضاء جسم کہ جن میں آثار اعمال محفوظ ہیں زبان بے زبانی سے کلام کریں گے لیکن دوسرے مراحل میں ان کی زبان کا قفل کھول دیا جائے اور وہ اذن الہی سے بات کریں گے اور اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے، خطاکار ایک دوسرے کو ملامت کریں گے بلکہ ان کی کوشش یہ ہوگی کہ اپنے گناہ دوسرے کی گردن پر ڈال دیں گے۔

بہرحال آیت کے آخر میں تمام لوگوں کی دو گروہوں میں تقسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہاں ایک گروہ شقی ہوگا اور دوسرا سعید، ایک گروہ بدبخت ہوگا اور دوسرا خوش بخت (فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ)۔

”سعید“ مادہ سعادت سے اسباب نعمت فراہم ہونے کے معنی میں ہے اور ”شقی“ مادہ ”شقاوت“ سے سزا، پکڑ اور بلاء کے اسباب فراہم ہونے کے معنی میں ہے، اس بناء پر اُس جہان میں سعید وہی نیک لوگ ہیں جو انواع و اقسام کی نعمتوں میں جاگزیں ہوں گے اور شقی وہی بدکار ہیں جو دوزخ میں مختلف عذابوں میں گرفتار ہوں گے۔

بہرحال یہ شقاوت اور وہ سعادت دنیا میں انسانی اعمال، کردار، گفتار اور نیتوں کے نتیجے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ بعض مفسرین نے جبرو اکراہ پر مبنی اپنے باطل عقیدے کے لئے اس آیت کو دستاویز قرار دیا ہے حالانکہ یہ آیت اس معنی پر دلالت نہیں کرتی بلکہ روز قیامت کے سعادت مندوں اور شقی افراد کے بارے میں بات کر رہی ہے کہ وہ سب اپنے اعمال کی وجہ سے اس مرحلے میں پہنچے ہیں شاید کچھ ایسی احادیث سے اس آیت کے مفہوم کے بارے میں اشتباہ ہوا ہے کہ جو قبلی پیدائش سعادت و شقاوت مندوں کے بارے میں جو الگ الگ داستان ہے۔

اس کے بعد شقاوت مندوں اور سعادت مندوں کے حالات کی تشریح بڑے جچے تلے انداز میں اور واضح عبارات کے ذریعے کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: رہے وہ جو شقاوت مند ہوئے، جنہم کی آگ میں زفیر و شہیق میں مبتلا ہیں، نالہ و فریاد اور ورشین کرتے ہیں (فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُّوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ زَفِيرٌ وَشَهيقٌ)۔

مزید فرمایا: وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے جب تک کہ آسمان و زمین موجود ہیں (خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ)۔ مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے (إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ) کیونکہ خدا جس کام کا ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے (إِنَّ رَبَّكَ فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ)۔ لیکن جو لوگ سعادت مند ہوئے جب تک آسمان و زمین موجود ہیں وہ ہمیشہ بہشت میں رہیں گے (وَأَمَّا الَّذِينَ سَعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ) مگر جو کچھ تیرے پروردگار کا ارادہ ہو (إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ)۔ یہ بخشش و عطیہ ہے جو ان سے ہرگز منقطع نہ ہوگا (عَطَاءٌ غَيْرٌ مَّجْدُودٌ)۔

چند قابل توجہ نکات

## ۱۔ جبر واکراہ کی نفی :

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ بعض مندرجہ بالا آیات سے سعادت و شقاوت کا ذاتی ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ مندرجہ بالا آیات نہ صرف اس امر پر دلالت نہیں کرتی بلکہ وضاحت سے ثابت کرتی ہیں کہ سعادت و شقاوت اکتسابی ہیں کیونکہ فرمایا گیا ہے: ”فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُّوا“ یعنی وہ لوگ جو شقاوت مند ہوئے، اسی طرح فرمایا گیا ہے: ”أَمَّا الَّذِينَ سَعَدُوا“ یعنی وہ لوگ و سعادت مند ہوئے، اگر شقاوت و سعادت ذاتی ہوتیں تو کہنا چاہیے تھا: ”أَمَّا الْأَشْقِيَاءُ وَأَمَّا السَّعْدَاءُ“ یا ایسی ہی کوئی اور عبارت ہوتی۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ تفسیر رازی کی یہ بات بالکل بے بنیاد ہے جو اس نے ان الفاظ میں بیان کی ہے: مذکورہ آیات میں خدا ابھی سے حکم لگا رہا ہے قیامت میں ایک گروہ سعادت مند ہوگا اور ایک شقاوت مند ہوگا اور جنہیں خدا ایسے حکم سے محکوم کرتا ہے اور جانتا ہے کہ آخر کار قیامت میں سعید یا شقی ہوں گے، محال ہے کہ وہ تبدیل ہوجائیں ورنہ لازم آئے گا کہ خدا کا خبر دینا جھوٹ ہو اور اس کا علم جہالت ہو، اور یہ محال ہے۔

یہ مسئلہ جبر و اختیار میں ”علم خدا“ کے حوالے سے وہی مشہور اعتراض ہے کہ جس کا جواب ہمیشہ دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم اپنے خود ساختہ افکار کو آیات پر نہ ٹھوسیں تو ان کے مفہم روشن اور واضح ہیں، یہ آیات کہتی ہیں کہ ان دن ایک گروہ اپنے اعمال کی وجہ سے سعادت مند ہوگا اور ایک گروہ اپنے کردار کے باعث شقاوت مند ہوگا اور خدا جانتا ہے کہ کونسے افراد اپنے ارادے، خواہش اور اختیار سے سعادت کی راہ اپنائیں گے اور کونسے اپنے ارادے سے راہ شقاوت پر گامزن ہوں گے، اس بناء پر اگر اس کے کہنے کے برعکس لوگ یہ راہ منتخب کرنے پر مجبور ہوں تو علم خدا جہل ہوجائے گا کیونکہ سب کے سب اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی راہ انتخاب کریں گے۔

ہماری گفتگو کا شاید یہ امر ہے کہ مندرجہ بالا آیات گزشتہ قوموں کے واقعات کے بعد آئی ہیں، ان واقعات کے مطابق ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے، حق و عدالت کے راستے سے اپنے انحراف کے باعث، شدید اخلاقی مفاسد کے سبب اور خدائی رہبروں کے خلاف جنگ کی وجہ سے اس جہان میں دردناک عذابوں میں مبتلا ہوئی، یہ واقعات قرآن نے ہماری تربیت و ارشاد کے لئے، راہ حق کو باطل سے جدا کر کے نمایاں کرنے کے لئے اور راہ سعادت کو راہ شقاوت سے جدا کر کے دکھانے کے لئے بیان کئے ہیں۔

اصولی طور پر جیسا کہ فخر رازی اور اس کے ہم فکر افراد خیال کرتے ہیں اگر ہم پر ذاتی سعادت و شقاوت کا حکم نافذ ہو اور ہم بغیر ارادہ و اختیار کے بدیوں اور نیکیوں کی طرف کھینچے جائیں تو تعلیم و تربیت لغو اور بے سود ہوجائے گی، پیغمبروں کا آنا جانا، کتب آسمانی کا نزول، پند و نصیحت، تشویق و توبیخ، سرزنش و ملامت، مواخذہ و سوال غرضیکہ سزا و جزا سب کی سب بے فائدہ یا ظالمانہ امور شمار ہوں گے۔

وہ جو لوگوں کو نیک و بد کی انجام دہی میں مجبور سمجھتے ہیں، چاہے اس کی جبر کو جبرِ خدائی سمجھیں یا جبرِ طبیعی، چاہے جبر اقتصادی سمجھیں یا جبرِ ماحول، صرف بات کرتے وقت یا کتابی دنیا میں اس مسلک کی طرفداری کرتے، لیکن عملی طور پر خود بھی ہرگز یہ عقیدہ نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے حقوق پر تجاوز ہو تو زیادتی کرنے والے سرزنش، ملامت اور سزا کا مستحق سمجھتے ہیں اور اس بات کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اسے مجبور قرار دے کر اس سے صرف نظر کر لیں یا اس کی سزا کو ظالمانہ خیال کریں یا کہیں کہ وہ یہ کام کرنے پر قدرت نہیں رکھتا تھا اور چونکہ خدا نے ایسا چاہا تھا یا ماحول اور طبیعت کا جبر تھا، یہ خود اصل اختیار کے فطری ہونے پر ایک اور دلیل ہے۔

بہر حال ہمیں کوئی جبری مسلک والا ایسا نہیں ملتا جو اپنے روز مرہ کے عمل میں اس عقیدے کا پابند ہو بلکہ وہ تمام افراد سے ان کے آزاد، مسئول، جوابدہ اور مختار ہونے کے لحاظ سے ملتا اور پیش آتا ہے، دنیا کی تمام اقوام نے عدالتیں قائم کر رکھی ہیں، قوانین بنائے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے کے لئے مختار ہونے کو قبول کیا گیا ہے، دنیا کے تمام تربیتی ادارے ضمنی طور پر اس بنیادی نظریے کو قبول کرتے ہیں کہ انسان اپنے میل و رغبت اور ارادہ و اختیار سے کام کرتا ہے اور تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کی رہنمائی کی جاسکتی ہے اور اسے ارشاد و ہدایت کی جاسکتی ہے اور اسے خطاؤں، غلطیوں اور کج فہمیوں سے روکا جاسکتا ہے

## ۲۔ ”شقاوا“ اور ”سعداوا“ میں ایک باریک فرق:

یہ بات جاذب نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں ”شقاوا“ فعل معلوم کے طور پر اور ”سعداوا“ فعل مجہول کی صورت میں آیا ہے۔ (۱)

تعبیر کا یہ اختلاف شاید اس لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ انسان راہ شقاوت کو اپنے قدموں سے طے کرتا ہے لیکن

راہ سعادت پر چلنے کے لئے جب تک خدائی امداد اور تعاون نہ ہو اور اس راہ میں وہ اس کے نصرت نہ کرے تو یہ کامیاب نہیں ہوگا، اس میں شک نہیں کہ یہ امداد اور تعاون صرف ان لوگوں کے شامل حال ہوتا ہے جنہوں نے ابتدائی قدم اپنے ارادہ و اختیار سے اٹھائے ہوں اور اسی طرح ایسی امداد کی اہلیت پیدا کر لی ہو (غور کر لیجئے گا)۔

۳۔ قرآن میں مسئلہ خلود:

اصل لغت میں ”خلود“ طولانی بقاء کے معنی میں ہے اور ابدیت کے معنی میں بھی آیا ہے اس لئے اکیلا ”خلود“ ابدیت کی دلیل نہیں ہوتا بلکہ ہر قسم کی طولانی بقاء بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے لیکن بہت سی آیات قرآنی میں یہ کلمہ کچھ قیود کے ساتھ ذکر ہوا ہے جن سے وضاحت کے ساتھ ابدیت کا مفہوم معلوم ہوتا ہے، مثلاً توبہ/ ۱۰۰، طلاق/ ۱۱، اور تغابن/ ۹ میں اہل بہشت کے لئے ”خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا“ کی تعبیر موجود ہے، اس تعبیر سے ان لوگوں کے لئے بہشت کی ابدیت معلوم ہوتی ہے اور دوسری آیات مثلاً نساء/ ۱۶۹ اور جن/ ۲۳ میں دوزخیوں کے ایک گروہ کے بارے میں یہی تعبیر ”خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا“ نظر آتی ہے جو ان کے لئے عذاب جاودا ہونے کی دلیل ہے۔

اسی طرح کچھ اور تعبیرات بھی ہیں، مثلاً: (کہف/ ۳) اور (کہف/ ۱۰۸)

یا اس قسم کی تعبیرات کی جو نشاندہی کرتی ہیں کہ حتماً بہشتیوں کے کچھ گروہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نعمت یا عذاب میں رہیں گے۔

بعض افراد سزا کے جاودا ہونے کے اشکالات کو اپنی نظر میں حل کرنے نہیں کرسکے مجبوراً انہوں نے اس کے لغوی معنی کا سہارا لیا ہے اور انہوں نے اسے مدتِ طولانی کے معنی میں لیا ہے حالانکہ بعض تعبیرات جیسے مندرجہ بالا آیات ہیں ان کی ایسی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔

مزید وضاحت کے لئے ہم آپ کی توجہ ذیل کی اہم بحث کی جانب مبذول کراتے ہیں

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

یہاں فوراً ہر سننے والے صفحہ ذہن پر ایک بہت اہم سوال ابھرتا ہے اور وہ یہ کہ گناہ اور عذاب میں یہ عدم مساوات خدا کی طرف سے کیسے ممکن ہے، کیسے قبول کیا جاسکتا ہے کہ انسان اپنی ساری عمر جو زیادہ سے زیادہ اسی یا سو سال ہوتی ہے میں اچھا یا بُرا کام انجام دے لیکن اس کی جزاء یا سزا کروڑوں سالوں پر یا اس سے بھی جتنی بھی طولانی عرصے پر محیط ہو۔

البتہ یہ مسئلہ جزاء کے بارے میں تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ بخشش اور جزاء جتنی بھی زیادہ ہو جزاء دینے والے کے فضل و کرم کی نشانی ہے لہذا اس پر اعتراض، یا اشکال نہیں کیا جاسکتا لیکن بُرے کام، گناہ، ظلم اور کفر کے بارے میں یہ سوال ہے کہ ایک محدود گناہ پر دائمی عذاب عدلِ الہی کے نظریے کے ساتھ کیونکہ مناسبت رکھتا ہے، جس شخص کی سرکشی اور تجاوز کا دور ایک سوال سال سے زیادہ نہیں ہمیشہ کے لئے جنم کی آگ اور عذاب کے شکنجے میں گیوں گرفتار رہے؟

کیا عدالت کا تقاضا نہیں کہ یہاں پر ایک توازن برقرار رکھا جائے اور مثلاً سو سال کے غلط اعمال کی مقدار کے برابر سے عذاب اور سزا ہو؟

مطمئن نہ کرنے جو بات:

اس اعتراض کے جواب کی پیچیدگی اس بات کا سبب بنی ہے کہ بعض علماء نے آیات خلود کی توجیہ کا راستہ اختیار کیا اور ان کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ ان سے ہمیشہ کی سزا اور عذاب معلوم نہ ہو کیونکہ دائمی عذاب ان کے عقیدے کے مطابق خلافِ عدل ہے، اس سلسلے میں انہوں نے اس طرح کی باتیں کی ہیں:

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ ”خلود“ سے مراد اس کا کنائی اور مجازی معنی ہے، یعنی ایک مدت جو نسبتاً طولانی ہو، جیسا کہ جن افراد کو آخر تک کے لئے سزائے قید سنائی جائے ان کے لئے کہا جاتا ہے کہ انہیں دائمی قید سنائی گئی ہے حالانکہ مسلم ہے کہ کسی قید خانے میں ابدیت نہیں ہوتی اور قید کی عمر ختم ہوجاتی ہے یہاں تک کہ عربی زبان میں بھی ”يُخَلَّدُ فِي السِّجْنِ“ جوکہ مادہ ”خلود“ سے ہے ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ بعض دیگر کہتے ہیں کہ ایسے باغی اور سرکش افراد کہ جن کے پورے وجود کو گناہ نے گھیر لیا ہو اور ان کا سارا وجود کفر اور گناہ میں ڈھل گیا ہو اگرچہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے لیکن دوزخ ہمیشہ ایک ہی حالت میں نہیں رہے گی، ایک دن ایسا آنے گا کہ اس کی آخراکار دوسری آگ کی طرح بجھ جائے گی اور دوزخیوں کو ایک خاص قسم کا سکون

مل جائے گا۔

۳۔ بعض نے احتمال ذکر کیا ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ اور بہت سی سزا جھیلنے کے بعد آخر کار دوزخی ایک طرح سے اس کے عادی اور خوگر ہو جائیں گے اور وہ اپنے ماحول کے رنگ میں جائیں گے اور ماحول کے ساتھ ایک طرح کی موافقت پیدا ہو جائے گی، اس طرح انہیں کسی قسم کی ناراحتی، تکلیف اور عذاب کا احساس نہیں ہوگا۔  
البتہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ سب توجیہات ”خلود“ اور دائمی عذاب کے مسئلہ کے بارے میں جواب دینے سے عجز و ناتوانی کی وجہ سے ہیں یہ بات ناقابل انکار ہے کہ آیاتِ خلود کا ظہور یہ ہے کہ ایک خاص طبقہ ہمیشہ کے لئے عذاب میں رہے گا۔

حتمی جواب

اس مشکل کے حل کے لئے گزشتہ مباحث کی طرف لوٹنا پڑے گا اور اس اشتباہ کی اصلاح کرنا پڑے گی کہ جی میں عذابِ قیامت کا دوسری سزاؤں پر قیاس کیا جاتا ہے تاکہ یہ بات واضح ہوسکے کہ مسئلہ خلود اصل عدالتِ الہی کے منافی ہے۔

۱۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے ابدی اور دائمی عذاب اور سزا ایسے لوگوں کے لئے منحصر ہے جنہوں نے اپنے لئے نجات کے تمام راستے بند کر لیے ہیں اور جان بوجھ کر فساد و تباہی اور کفر و نفاق میں غرق ہو گئے ہیں، گناہ کے منحوس سائے نے جن کے تمام قلب و روح کو ڈھانپ دیا ہے اور درحقیقت جو گناہ اور کفر کے رنگ میں گئے ہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ میں ہے:

جی ہاں! جو شخص گناہ کا مرتکب ہوا اور اس کے آثار اس کے تمام وجود کا احاطہ کر لیں ایسے لوگ اہل دوزخ ہیں جو ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ (بقرہ/۸۰)

۲۔ بعض لوگوں کا یہ غلط اشتباہ ہے کہ سزا اور عذاب کی مدت گناہ کی مدت کے برابر ہونا چاہیے کیونکہ گناہ اور سزا کے درمیان ”رابطہ کیفی“ ہے یعنی زمانہ سزا کا تعلق گناہ کی کیفیت سے ہے نہ کہ اس کے زمانے کی مقدار سے مثلاً ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی نفس کو قتل کرنے کے لئے لحظہ بھر کا تھا جبکہ اس کی سزا ممکن ہے اسی سال پر محیط ہو، لہذا معاملہ کیفیت کا نہ کہ زمانی کمیت کا۔  
۳۔ ہم چاہتے ہیں قیامت کی زیادہ تر سزائیں اور عذاب عمل کے طبیعی و فطری اثر اور خاصیتِ گناہ کے حوالے سے ہیں، زیادہ واضح الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رنج و تکالیف اور پریشانیوں جن کا دوسرے جہان میں گنہگار سامنا کریں گے ان کے اپنے اعمال کا اثر اور نتیجہ ہیں جو انہیں دامنگیر ہوگا، قرآن کہتا ہے:

آج (روزِ قیامت) کسی شخص پر ظلم نہیں ہوگا اور تمہارے اعمال کے سوا تمہاری جزا نہیں ہوگی (یسین/۵۴)  
یہ بھی ارشادِ الہی ہے:

اور اُن کے بُرے اعمال اُن کے سامنے آشکار ہو جائیں گے اور جس کا ہمیشہ تمسخر اڑایا کرتے تھے اور انہیں گھیر لے گا (جاقیہ/۳۳)

جنہوں نے بُرے کام کیے ہیں ان کے اعمال کے علاوہ انہیں کوئی جزاء نہیں دی جائے گی (القصص/۸۴)

اب جبکہ یہ تین پہلو ہو واضح ہو چکے ہیں تو مسئلے کا حتمی جواب ہماری دسترس سے زیادہ دُور نہیں رہا اور اس تک پہنچنے کے لئے کافی ہے کہ آپ ذیل کے چند سوالات کا جواب دیں:

۱۔ فرض کریں کہ کوئی شخص پے درپے مشروباتِ الکحل کے استعمال کی وجہ سے ہفتہ بھی میں معدے کے شدید زخم میں مبتلا ہو گیا ہے اور بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ اب اسے یہ درد آخر عمر تک برداشت کرنا پڑے گا، تو کیا یہ نتیجہ اس کے بُرے عمل کے برابر ہے اور کیا یہ خلافِ عدالت ہے؟ اب اگر اس شخص کی عمر اسی سال کی بجائے ایک ہزار سال یا ملین سال ہو تو اسے ایک ہفتے کی ہوس رانی کی خاطر ایک ملین سال دکھ درد جھیلنا پڑیں گے تو کیا یہ اصلِ عدالت کے خلاف ہوگا جبکہ شراب خوری کے اس خطرے کے بارے میں پہلے سے بتایا جاچکا ہے اور اس کا انجام بھی اس کے سامنے واضح کیا جاچکا ہے۔

۲۔ نیز فرض کریں کہ کوئی شخص ڈرائیونگ کے قوانین بھلا دے جبکہ یہ بات مسلم ہے کہ یہ قوانین سودمند ہیں اور

حادثات سے رونما ہونے والی شریسانویوں میں کمی کا باعث ہیں، یہ شخص سمجھدار دوستوں کی طرف سے خطرے کی بار بار تنبیہوں پر کان دھرے، اب اگر کوئی حادثہ کسی مختصر لمحے میں اسے آئے (اور حادثات تو لمحوں ہی میں رونما ہوتے ہیں) اس حادثے میں اس کی آنکھیں، ہاتھ یا پاؤں ضائع ہوجائیں اور اس کے بعد اسے اندھے پن میں یا اپاہج ہوکر زندگی گزارنا پڑے تو کیا یہ نتیجہ پروردگار کی عدالت کے کسی طرح بھی منافی ہے؟

۳۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک اور مثال بھی ہے اور مثالیں عقابیں حقائق کو ذہن کے قریب کرتی ہیں اور اصلی، حتمی اور استدلالی نتیجہ حاصل کرنے کے لئے ذہن کو یثار کرتی ہیں۔

فرض کریں ہم اپنے راستے میں خار مگیلاں کے چند گرام بیج چھڑک دیتے ہیں، چند ماہ یا چند سالوں بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے راستے میں کانٹوں کا ایک وسیع صحرا ہے جو ہمیشہ کے لئے ہماری دروسری اور تکلیف کا باعث بن گیا ہے۔ یا یہ کہ ہم پھلوں کے چند گرام بیج چھڑک دیتے ہیں، تھوڑے ہی عرصے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے بہت دلکش اور مہلک دار گلشن کھل اٹھا ہے جو ہمیشہ ہمارے مشام جان کو معطر رکھتا ہے اور دل کو لہاتا ہے۔ کیا یہ امور جو سب کے سب اعمال کے آثار ہیں عدالت کے کسی طور بھی منافی ہیں حالانکہ اس عمل اور اس کے نتیجے کی مقدار میں مساوات نہیں ہے۔

جو کچھ کہا جاچکا ہے اس سے مجموعی طور پر ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب جزاء اور سزا خود انسان کے عمل کا نتیجہ ہے تو کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بسا اوقات ظاہراً ایک چھوٹا سا عمل ہوتا ہے جس کا اثر ایک عمر کی محرومیت، ابتلاء اور ناراحتی کی صورت میں نکلتا ہے اور بعض اوقات ایک اور ظاہراً چھوٹا چھوٹا سا عمل ایک عمر کے لئے سرچشمہ خیرات و برکات بن جاتا ہے (اشتبہا نہ ہو، چھوٹے سے ہماری مراد مقدارِ زمانہ کے لحاظ سے ہے ورنہ وہ کام اور گناہ جو عذاب میں ہمیشگی کا باعث ہیں یقیناً کیفیت اور اہمیت کے لحاظ سے چھوٹے نہیں ہیں) اس بناء پر جب گناہ، کفر، طغیان اور سرکشی پورے انسانی وجود کا احاطہ کرلیں اور اس کی جان کے تمام بال و پر بیدادگری اور نفاق کی آگ میں جلیں تو کونسا مقام تعجب ہے کہ وہ دوسرے جہان میں آسمانِ بہشت میں پرواز کی نعمت سے محروم ہوجائے اور ہمیشہ کے لئے عظیم محرومیت کے درد ورنج میں گرفتار رہے، کیا اسے بتایا نہیں گیا اور کیا اسے اس عظیم خطرے سے آگاہ نہیں کیا گیا۔

جی ہاں! ایک طرف سے انبیاء الہی نے اور دوسری طرف سے عقل و خرد نے ضروری آگاہی دی تھی، کیا اس نے بے توجہی میں اور بغیر اختیار کے اس کام میں ہاتھ ڈالا تھا اور اب ایسے انجام کو پہنچا ہے؟ نہیں بلکہ اس نے یہ کام علم کے ساتھ، جان بوجھ کر اور اختیار سے انجام دیا ہے۔

کیا یہ انجام خود اس کے اعمال اور سیدھا اس کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہے، یقیناً یہ انجام خود اس کے کام کے آثار میں سے ہے۔

اس بناء پر نہ کشائیت کی گنجائش ہے نہ کسی پر اشکال کی اور نہ ہی یہ انجام عدالتِ الہی کے قانون کے منافی ہے۔ (2)

۴۔ زیر بحث آیات میں ”خلود“ کا معنی:

کیا ”خلود“ زیر بحث آیات میں ہمیشگی اور جاودانی کے معنی میں آیا ہے یا یہاں اس کا مفہوم ”طولانی مدت“ والا ہے جو اس کے لغوی مفہوم کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔

اس بنیاد کہ یہاں ”خلود“ کے ساتھ یہ شرط ہے کہ: ”مادامت السموات“ (یعنی، جب تک آسمان و زمین باقی ہیں) بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ اس موقع پر خلود ہمیشگی اور جاودانی کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ آسمان و زمین ابدیت اور ہمیشگی نہیں رکھتے اور قرآن کی صریح آیات کے مطابق ایک زمانہ آئے گا کہ آسمان درہم و درہم ہوجائیں گے اور زمین تباہ ہوکر ایک اور زمین میں بدل جائیں گی۔ (3)

لیکن توجہ رہے کہ عربی ادبیات میں ایسی تعبیریں عموماً ابدیت کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، لہذا محل آیات میں بھی خلود ہمیشگی کے معنی میں آیا ہے۔

مثلاً عرب کہتے ہیں: یہ کیفیت برقرار رہے گی ”ملاح کوکب“ (جب تک چمکتا ہے) یا ”ما لاح الجدیدان“ (جب تک دن رات موجود ہیں) یا ”ما اضاء فجر“ (جب تک روشن ہوتی رہے) یا ”ما اختلف اللیل والنہار“ (جب تک رات دن ایک دوسرے کے بعد آتے رہیں)۔

ایسی ہی بہت سی مثالیں ہیں جو سب کی سب ہمیشگی اور ابدیت کے لئے کنایہ ہیں۔

امام امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے کلام نہج البلاغہ میں ہے کہ جب جاہل مفسرین نے امام پر اعتراض کیا کہ آپ بیت المال کی تقسیم میں مساوات کیوں برتتے ہیں اور اپنی حکومت مستحکم کرنے کے لئے بعض لوگوں کو دوسروں پر

ترجیح کیوں نہیں دیتے تو امام یہ بات سن کر رنج ہوا اور آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:  
 ”أتأمرونی أن أطلب النصر بالجور فیمین ولیت علیہ واللہ لا أطور بہ ما سمر سمیر وما أم نجم فی السماء نجماً“  
 کیا مجھ سے کہتے ہو کہ میں کامیابی کے لئے اپنی حکومت میں رہنے والوں کی طرف دستِ ظلم دراز کروں، خدا قسم!  
 میں اس کام کے نزدیک بھی نہیں جاؤں گا جب تک رات کو بیٹھ کر لوگ قصہ گوئی کریں گے اور جب تک آسمان کے  
 ستارے ایک دوسرے کے بعد طلوع و غروب کرتے رہیں گے۔ (4)  
 دعبیل خزاعی کے اشعار میں سے ایک ان کا مشہور قصیدہ ہے جو انہوں نے امام علی بن موسیٰ الرضا علیہما السلام کے  
 حضور میں پڑھا، اُس کا ایک شعر یوں ہے:

سأبیکھم مادر فی الأفق شارق

ونادی منادی الخیر فی الصلوات

میں خاندان نبوت کے شہیدوں پر گریہ وزاری کرتا رہوں گا، اس وقت تک سورج افق مشرق پر روشنی چھڑکتا رہے گا اور  
 جب تک اذان کی صدا دعوتِ نماز کے لئے میناروں سے گونجتی رہے گی۔ (5)  
 البتہ یہ چیز عربی ادبیات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسری زبانوں میں بھی کم و بیش موجود ہے بہر حال ابدیت اور  
 ہمیشگی پر آیت کی دلات بحث و تمحیص سے ماوراء ہے اور اسی طرح یہاں ان لوگوں کی گفتگو کی بھی ضرورت نہیں جو  
 کہتے ہیں کہ یہاں آسمان وزمین سے مراد قیامت کے زمین و آسمان ہیں جو جاودانی ہیں۔

۵۔ آیت میں استثناء کا کیا مفہوم ہے؟

مندرجہ بالا آیات میں اہل بہشت اور اہل جہنم دونوں کے بارے میں جملہ ”استثنائیہ“ ”آلا ماشاء ربک (مگر وہ تیرا پروردگار  
 چاہے) آیا ہے، اس مفسرین کے لئے ایک وسیع بحث کا دروازہ کھل گیا ہے۔  
 عظیم مفسر طبرسی نے اپنی تفسیر میں مفسرین سے اس استثناء کی دس وجوہات نقل کی ہیں، ہماری نظر میں ان میں سے  
 زیادہ تر کمزور ہیں اور قبل و بعد کی آیات سے ہر گز مناسبت نہیں رکھتیں لہذا ہم ان کا ذکر نہیں کرتے اور ان میں سے جو  
 دو ہمیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں وہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ اس استثناء کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تصور نہ ہو کہ بے ایمان افراد کی دائمی اور سچے مومنین کی جزا اور  
 ثواب خدا کی مشیت اور مرضی کے بغیر ہیں اور ان سے اس کی قدرت و توانائی اور ارادہ محدود ہوجاتا ہے اور یہ سزا  
 و جزا جبر اور لزوم کی صورت اختیار کر لیتی ہیں بلکہ ان دونوں کے جاودانی اور دائمی ہونے کے باوجود اس کی قدرت  
 اور ارادہ ہر چیز پر حاکم ہے۔

اس بات کا شاید یہ ہے کہ دوسرے جملے میں سعادت مندوں کے بارے میں استثناء کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے: ”عطاء  
 غیر مجذوذ“ ایسی عطا اور جزاء ہے کہ جو ان سے ہرگز منقطع نہ ہوگی۔  
 یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ جملہ استثنائیہ صرف بیانِ قدرت کے لئے ہے۔

۲۔ یہ آیت چونکہ شقی اور سعید دو گروہوں کے بارے میں ہیں اور ضروری نہیں کہ تمام شقاوتمند بے ایمان افراد ہوں جو  
 خلود کے مستحق ہوں بلکہ ہوسکتا ہے کہ ان کے درمیان خطا کار مومنین بھی ہوں لہذا استثناء کا تعلق اس گروہ سے ہے۔  
 لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے پھر دوسرے جملے میں استثناء کا کیا مفہوم ہوگا جو سعادت مندوں کے بارے میں ہے، اس  
 کے جواب میں کہا گیا ہے کہ وہ بھی خطاکار مومنین کے بارے میں ہے کہ جنہیں ابتداء میں ایک مدت تک دوزخ میں جاکر  
 پاک ہونا ہوگا اس کے بعد وہ اہل بہشت کی صف میں شامل ہوجائیں گے، درحقیقت پہلے جملے میں استثناء انجام اور آخرکار  
 کے متعلق ہے جبکہ دوسرے جملے میں آغاز اور ابتداء کے بارے میں پہلے جملے ہے (غور کیجئے گا)۔

رہا یہ احتمال جو بعض نے ذکر کیا ہے کہ یہ جزاء اروسزا کی جنت اور دوزخ سے مربوط ہے جس کی مدت لامحدود ہے  
 اور ختم ہوجائے گی، بہت بعید ہے کہ کیونکہ قبل کی آیات صراحت کے ساتھ قیامت کے بارے میں ہیں اور ان آیات کا تعلق  
 اُن سے ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

اسی طرح یہ احتمال بھی درست ہے کہ ان آیات میں ”خلود“ قرآن کی دیگر آیات کی طرح مدتِ طولانی کے معنی میں ہے  
 نہ کہ ابدیت کے معنی میں، اس کی وضاحت یہ ہے کہ جملہ ”عطاء غیر مجذوذ“ اور خود استثناء کہ جو اس سے قبل کے  
 جملوں کے ابدیت کی دلیل ہے سے یہ احتمال مطابقت نہیں رکھتا۔

۶۔ ”زفیر“ اور ”شہیق“ کا مفہوم:

مندرجہ بالا آیات میں دوزخیوں کے بارے میں ہے کہ وہ وہاں ”زفیر“ اور ”شہیق“ کے حامل ہوں گے۔

ان دو الفاظ کے معانی کے بارے میں ارباب لغت اور مفسرین نے متعدد احتمالات ذکر کئے ہیں: بعض نے کہا ہے کہ ”زفیر“ داد و فریاد اور چیخ و پکار کرنے کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ باہر کی طرف سانس لیا جائے اور ”شہیق“ اس نالہ و فریاد کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اندر کی طرف سانس کھینچا جائے۔ بعض نے گدھے کی ابتدائی آواز کو اور ”شہیق“ اس کی اختتامی آواز کو قرار دیا ہے، شاید یہ معنی پہلے معنی سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

بہر حال یہ دونوں الفاظ ایسے اشخاص کے نالہ و فریاد کا مفہوم دیتے ہیں کہ غم و اندوہ کے مارے جن کا پورا وجود واویلا کر رہا ہو اور ایسی داد و فریاد جو انتہائی ریشانی، نارحتی اور شدتِ کرب و تکلیف کی نشانی ہو۔ توجہ رہے کہ ”زفیر“ اور ”شہیق“ دونوں مصدر ہیں اور ”زفیر“ کثرت سے کہتے ہیں اور ”شہیق“ اصل میں طولانی ہونے کے اور چونکہ یہ کام آہ و نالہ کا سبب بنتا ہے اس لئے آہ و نالہ کو ”زفیر“ کہتے ہیں اور ”شہیق“ اصل میں طولانی ہونے کے معنی میں ہے جیسا کہ بلند پہاڑ کو ”جبل شاہق“ کہتے ہیں بعد ازاں یہ لفظ طولانی نالہ و فریاد کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

### سعادت و شقاوت کے اسباب

سعادت جو تمام انسانوں کی گمشدہ چیز ہے اور اسے ہر کوئی ہر کسی چیز میں اور ہر جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے یہ ایک فریاد یا معاشرے کے تکامل و ارتقاء کے اسباب فراہم کرنے کا نام ہے، اس کے مقابل شقاوت و بدبختی ہے جس سے سب نفرت کرتے ہیں اور وہ کامیابی، تکامل اور ارتقاء کے لئے درکار اسباب، حالات اور شرائط کے نامساعد ہونے کو کہتے ہیں۔

اس بناء پر جس شخص کو روحانی، جسمانی خاندانی، معاشرتی اور تمدنی لحاظ سے بلندتر اہداف تک پہنچنے کے لئے زیادہ اسباب حاصل ہوں وہ سعادت کے زیادہ نزدیک ہے یا دوسرے لفظوں میں زیادہ سعادت مند ہے، دوسری طرف جو شخص ان پہلوؤں کی کمی اور نارسائی میں گرفتار ہو وہ شقاوت مند اور بدبخت ہے اور سعادت سے بے بہرہ ہے۔ لیکن توجہ رہے کہ سعادت و شقاوت کی حقیقی بنیاد انسان کا اپنا ارادہ اور خواہش ہے، انسانی ارادہ ہی اپنی اصلاح بلکہ معاشرے کی اصلاح و درستی کے لئے ضروری وسائل فراہم کر سکتا ہے اور یہ انسان خود ہے جو بدبختی اور شقاوت کے عوامل کے خلاف جنگ کے لئے اٹھ کھڑا ہو یا اس کے سامنے سرتسلیم خم کر دے۔

انبیاء کی منطق میں سعادت و شقاوت کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کے لئے ذاتی ہو، یہاں تک کہ ماحول، خاندان اور وراثت بھی خود انسانی ارادے کے سامنے قابلِ تغیر ہیں مگر یہ کہ ہم خود انسانی ارادے اور آزادی کا انکار کر دیں، اسے جبری شرائط و حالات کا محکوم قرار دے دیں اور اس کی سعادت یا شقاوت کو ذاتی یا ماحول وغیرہ کی جبری پیداوار سمجھیں حالانکہ یہ قطعی طور پر مکتبِ انبیاء اور اسی طرح مکتبِ عقل کے نزدیک محکوم و مذموم ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہے کہ روایات میں مختلف امور کی اسباب سعادت یا اسباب شقاوت کے طور پر نشاندہی کروائی گئی ہے کہ جن کا مطالعہ انسان کو اس اہم مسئلے کے بارے میں اسلامی طرزِ فکر سے آشنا کرتا ہے اور انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ سعادت تک پہنچنے اور شقاوت سے بچنے کے لئے بیہودہ و خرافاتی مسائل اور غلط قسم کے خیالات اور طور و طریقے کو جو بہت سے معاشروں میں موجود ہوتے ہیں کا سہارا لینے کے بجائے اور بے بنیاد امور کو سعادت و شقاوت کے اسباب خیال کرنے کے بجائے حقائقِ غیبی اور سعادت کے اسباب حقیقی کی جستجو کرے۔

نمونے کے طور پر ذیل کی چند پُر معانی احادیث کی طرف توجہ فرمائیے:

۱۔ امام صادق علیہ السلام اپنے جد بزرگوار امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

حقیقة السعادة أن یختم للرجل عملہ بالسعادة وحقیقة الشقاوة أن یختم للمرء عملہ بالشقاوة.

حقیقتِ سعادت یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا آخری مرحلہ سعادت مندانہ عمل کے ساتھ ختم ہو اور حقیقتِ شقاوت یہ ہے کہ اس کی زندگی کا آخری مرحلہ شقاوت مندانہ عمل پر اختتام پذیر ہو۔ (6)

یہ روایت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ انسان کی زندگی کا آخری مرحلہ اور اس مرحلے میں اس کے اعمال اس کی سعادت یا شقاوت کا مظہر ہیں، گویا اس طرح آپ (علیہ السلام) ذاتی سعادت و شقاوت کی مکمل نفی کر رہے ہیں اور انسان کو اس کے اعمال کا گروہ قرار دے رہے ہیں اور اس کی عمر کے آخری مرحلے تک اس کے لئے لوٹ آنے کا راستہ کھلا قرار دے رہے ہیں۔

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی السلام فرماتے ہیں:



السعيد من وعظ بغيره والشقي من انخدع لهواه وغروره.  
سعادتمند وہ شخص ہے جو دوسروں کی زندگی سے نصیحت حاصل کرے اور شقاوتمند وہ شخص ہے جو ہوائے نفس سے دھوکا کھاجائے۔ (7)

حضرت علی علیہ السلام کی یہ گفتگو بھی سعادت و شقاوت کے اختیاری ہونے کی تاکید مزید ہے اور اس میں آپ (علیہ السلام) ان دونوں کے بعض اسباب کو بیان فرما رہے ہیں۔

۳۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أربع من أسباب السعادة وأربع من الشقاوة: فلأربع التي من السعادة: المرئاة الصالحة والمسكن والواسع، والجار الصالح، والمركب البهيء. والأربع التي من الشقاوة: الجار السوء، والمرئاة السوء، والمسكن الضيق والمركب السوء.

چار چیزیں اسباب سعادت ہیں اور چار چیزیں اسباب شقاوت ہیں: 8۔

وہ چار جو اسباب سعادت ہیں یہ ہیں: نیک بیوی، وسیع گھر، نیک ہمسایہ اور اچھی سواری، اور وہ چار جو اسباب شقاوت ہیں یہ ہیں: بُرا ہمسایہ، بُری بیوی، تنگ مکان اور بُری سواری۔

اس طرح توجہ کرتے ہوئے کہ یہ چار امور ہر شخص کی مادی اور روحانی زندگی میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں اور کامیابی یا شکست کے عوامل بن سکتے ہیں، اس سے اسلامی منطق میں سعادت و بدبختی کے مفہوم کی وسعت واضح ہوجاتی ہے۔

ایک اچھی بیوی انسان کو طرح طرح کی نیکیوں کا شوق دلاتی ہے، ایک وسیع گھر انسان کی روح و فکر کو سکون بخشتا ہے اور زیادہ فعالیت کے لئے آمادہ کرتا ہے، بُرا ہمسایہ قابل تعریف نہیں ہے اور اچھا ہمسایہ آسائش و آرام میں مؤثر مددگار ہوتا ہے بلکہ انسان کی پیشرفت میں معاون ہوتا ہے، ایک اچھی سواری اپنے کام انجام دینے اور اجتماعی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے بہت کارآمد ہے جبکہ خراب اور بے کار سواری پیچھے رہ جانے کا باعث ہے کیونکہ وہ اپنے مالک کو اس کے مقصد تک کم ہی پہنچاتی ہے۔

۴۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث بھی نقل ہوئی ہے، فرمایا:

من علامات الشقاء جمود العينين، وقسوة القلب، وشدة الحرص في طلب الرزق، والامر على الذنب.

یہ چیزیں شقاوت کی علامتوں میں سے ہیں: آنکھوں کی قطرہ اشک سے محرومی، سنگدلی، حصولِ رزق میں شدید حرص اور گناہ پر اصرار۔ (9)

یہ چار امور جو مندرجہ بالا حدیث میں آئے ہیں سب اختیاری ہیں، ان کا سرچشمہ انسان کے خود کردہ اعمال و اخلاق ہیں، اسی طرح ان اسباب شقاوت سے بچنا بھی خود انسان کے اختیار میں ہے۔

سعادت و شقاوت کے وہ اسباب جو مندرجہ بالا حدیث میں ذکر ہوئے ہیں اگر ان سب کی حقیقت اور انسانی زندگی میں ان کے نقش مؤثر کا موازنہ ان بیہودہ اور خرافاتی اسباب سے کریں کہ جن کے ہمارے ایٹمی اور خلائی دور کے بہت سے گروہ پابند ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہوجائے گی کہ تعلیمات اسلام کس قدر منطقی اور حساب شدہ ہیں۔

ابھی بہت سے افراد ہیں جو گھوڑے کی نعل کو خوش بختی کی علامت سمجھتے ہیں، تیرھویں کے دن کو بدبختی کا سبب جانتے ہیں، سال کی بعض راتوں میں آگ کے اوپر سے پرندہ اڑنے کو خوش بختی کی دلیل قرار دیتے ہیں، بعض راتوں میں پرندے کی آواز کو بدبختی مانتے ہیں، مسافر کی پشت کے پیچھے پانی چھڑکنے کو خوش بختی کا سبب سمجھتے ہیں، پرنا لے کے نیچے سے گزرنے کو بدبختی کا سبب جانتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے ساتھ یا اپنے کسی ذریعہ آمد و رفت کے ساتھ گھونگا آویزاں کرنے کو بھی خوش بختی کا سبب سمجھتے ہیں، چھینک آجائے تو اسے پیش نظر کام انجام دینے میں بدبختی کی علامت سمجھتے ہیں، اسی طرح بہت سی خرافات ہیں جو مشرق و مغرب کی اقوام میں رائج ہیں۔

ایسے کتنے زیادہ انسان ہیں جو ان خرافات میں گرفتار ہونے کی وجہ سے زندگی میں فعالیت اور کارکردگی سے رہ گئے ہیں اور بے شمار مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔

اسلام نے ان تمام بیہودہ خیالات پر سُرخ لکیر کھینچ ددی ہے اور انسان کی سعادت و شقاوت کی بنیاد اس کے مثبت و منفی کام قوت و کمزوری، طرزِ عمل اور عقیدے کو قرار دیا کہ جس کے نمونے مندرجہ احادیث میں واضح طور پر بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ ”سعدوا“ ”سعد“ کے مادہ سے ہے جو بعض ارباب لغت کے مطابق فعل لازم ہے اور مفعول کو نہیں چاہتا، اس بناء پر یہ صیغہ مجہول نہیں ہے لہذا یہ اہل لغت مجبور ہونے ہیں کہ اسے محقق ”سعدوا“ (باب افعال کے مجہول) سے سمجھیں لیکن جس طرح

- آلوسی نے روح المعانی میں ایت کے ذیل میں بعض اہل لغت سے نقل کیا ہے اس کا فعل ثلاثی بھی متعدی ہے اور ”سعدانہ“ اور ”مسعود“ کہا جاتا ہے، اس بناء پر ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس فعل مجہول کو باب افعال سے سمجھیں (غور کیجئے گا)۔
- 2- ’معاد وجہان پس از مرگ‘، ص ۳۸۵ تا ۳۹۳۔
  - 3- سورہ ابراہیم، آیت ۴۸، اور سورہ انبیاء، آیت ۱۰۴۔
  - 4- نہج البلاغہ، صبحی صالح، خطبہ ۱۲۶۔
  - 5- نور الابصار، ص ۱۴۰، الغدير اور دیگر کتب۔
  - 6- تفسیر نور الثقلین: ج ۲، ص ۳۹۸۔
  - 7- نہج البلاغہ: صبحی صالحی، خطبہ ۸۶۔
  - 8- مکارم الاخلاق: ص ۶۵۔
  - 9- تفسیر نور الثقلین: ج ۲، ص ۳۹۸۔

### تفسیر نمونہ جلد 09

۱۰۹ فَلَاتَكُنْ فِي مَرِيَّةٍ مِّمَّا يَعْْبُدُ هُوَ لَاءِ مَا يَعْْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ وَإِنَّا لَمَوْفُوهُمْ نَصِيبُهُمْ غَيْرَ مَنْقُوصٍ  
 ۱۰۱۰ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفَضَيْ بَيْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ  
 ۱۱۱ وَإِنَّ كُلًّا لَمَّا لِيُؤْفَيْنَهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالُهُمْ إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ  
 ۱۱۲ فَاسْتَقِمَّ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

ترجمہ

- ۱۰۹۔ جن معبودوں کی پرستش کرتے ہیں تم ان کے بارے میں شک میں نہ پڑنا۔ یہ تو ان معبودوں کی ایسے ہی پرستش کرتے ہیں جیسے پہلے ان کے آباء و اجداد کرتے تھے اور ہم انہیں ان کا حصہ بے کم وکاست دیں گے۔
- ۱۱۰۔ ہم نے موسیٰ آسمانی کتاب دی، اس کے بعد ان لوگوں نے اس میں اختلاف کیا اور اگر پہلے سے (ان کی آزمائش اور اتمام حجت کے بارے میں) خدا کا فرمان نہ ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ ہو جاتا۔
- ۱۱۱۔ اور تیرا پروردگار ہر خص کا عمل بے کم وکاست اسے دے گا وہ ان کی کارگزاری سے آگاہ ہے۔
- ۱۱۲۔ لہذا تمہیں جس طرح حکم ہوا ہے استقامت اختیار کرو اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو تیرے ساتھ خدا کی جانب آئے ہیں اور سرکشی نہ کرو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے۔

استقامت کا دامن تھامے رکھو

یہ آیات در حقیقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلجوئی اور تسلی کی خاطر اور ان کی مسئولیت و ذمہ داری بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں۔  
 در اصل گزشتہ قوموں کے حالات سے جو اہم نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اور ان کے بعد سچے مومنین دشمنوں کی کثرت سے خوفزدہ نہ ہوں اور جس بت پرست اور ظالم قوم کا انہیں سامنا ہے اس کی شکست کے بارے میں شک و شبہ میں نہ پڑیں اور خدائی امداد پر مطمئن رہیں۔

اسی لئے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اس چیز کے بارے میں شک و شبہ میں نہ پڑو کہ جس کی یہ پرستش کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی اسی راستے پر گامزن ہیں جس پر گزشتہ لوگوں کا ایک گروہ گیا ہے اور یہ بھی اسی طرح پرستش کرتے ہیں جیسے پہلے ان کے بڑے کیا کرتے تھے لہذا ان کا انجام ان سے بہتر نہیں ہوگا (فَلَاتَكُنْ فِي مَرِيَّةٍ مِّمَّا يَعْْبُدُ هُوَ لَاءِ مَا يَعْْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ)۔ (۱)

لہذا بلافاصلہ فرمایا گیا ہے: ”ہم یقیناً سزا اور عذاب میں سے ان کا حصہ انہیں بے کم وکاست دیں گے“ اور اگر وہ راہ حق کی طرف پلٹ آئیں تو ہماری جزا میں ان کا حصہ محفوظ ہے (وَإِنَّا لَمَوْفُوهُمْ نَصِيبُهُمْ غَيْرَ مَنْقُوصٍ) باوجودیکہ لفظ ”موقوفہم“ خود حق کی مکمل ادائیگی کے معنی میں ہے لفظ ”غیر منقوص“ (بے کم وکاست) بھی اس مسئلے

پر تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے -

در اصل یہ آیت اس حقیقت کو مجسم کرتی ہے کہ گزشتہ سرگزشت ہم نے پڑھی ہے وہ ناول یا افسانہ نہیں تھا نیز وہ انجام گزشتہ لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ یہ ایک ابدی اور جاودانی سنت ہے اور تمام انسانوں کے بارے میں ہے، کل آج اور آئندہ کل کے لئے البتہ یہ عذاب اور سزائیں بہت سی گزشتہ قوموں میں ہولناک اور عظیم بلاؤں کی صورت میں عمل پذیر ہوئیں لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کے لئے ایک اور شکل میں ظاہر ہوئیں، وہ صورت یہ تھی کہ خدا نے اپنے پیغمبر کو اس قدر قدرت اور طاقت دی کہ آپ (علیہ السلام) ہٹ دھرم اور بے رحم دشمنوں کو کہ جو کسی طور پر بھی راہ مستقیم پر آنے کے لئے تیار نہ تھے گروہ مومنین کے ذریعے درہم و برہم کرسکیں -

دوبارہ پیغمبر اکرم کی تسلی کے لئے فرمایا گیا ہے: اگر تیری قوم تیری آسمانی کتاب کے بارے میں یعنی قرآن کے متعلق بہانہ جوئی کرتی ہے تو پریشان نہ ہو کیونکہ ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب (تورات) دی تھی، ان کی قوم نے اس میں اختلاف کیا بعض نے قبول کر لیا اور بعض نے انکار کر دیا (وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَآخْتَلَفَ فِيهِ) -

اگر تم دیکھتے ہو کہ تمہارے دشمنوں کو سزا دینے کے بارے میں ہم جلدی نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم کی تعلیم و تربیت اور ہدایت کے حوالے سے جو مصلحتیں ہیں وہ ایسا تقاضا نہیں کرتیں اور اگر یہ مصلحت نہ ہوتی اور وہ پروگرام جو تیرے پروردگار نے اس سلسلے میں پہلے سے شروع کر رکھا ہے تاخیر کا تقاضا نہ کرتا تو لازماً ان کے درمیان فیصلہ ہو جاتا اور سزا انہیں دامنگیر ہو جاتی (وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ) - اگرچہ انہیں اس حقیقت کا ابھی تک یقین نہیں آیا اور اس کے بارے میں اسی طرح شک و شبہ میں ہیں ایسا شک و شبہ جس میں سوء ظن اور بدبینی کی آمیزش ہے (وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ) - (2)

”مُرِيب“ مادہ ”رِيب“ سے ایسے شک و شبہ کے معنی میں ہے جو بد بینی، سوء ظن اور مخالف قرائن کی آمیزش رکھتا ہو، اس بناء پر اس لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ بُت پرست نہ صرف حقانیت قرآن کے بارے میں اور تباہ کاروں پر نزول عذاب کے معاملے میں شک کرتے ہیں بلکہ مدعی ہیں کہ اس کے خلاف قرائن بھی ہمارے پاس ہیں -

”اس قوم کے لوگ ابھی تک کتاب موسیٰ کے بارے میں تردد و شک میں ہیں۔“

لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلی ضمیر مشرکین مکہ اور دوسری قرآن (یا ان کی سزا اور عذاب) کی طرف لوٹتی ہے اس طرف توجہ کرتے ہوئے قبل اور بعد کی آیات پیغمبر اسلام کی دلجوئی اور تسلی کے لئے ہیں، دوسری تفسیر زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے اور ہم نے بھی متن میں اسی ہی منتخب کیا ہے -

”راغب“ نے مفردات میں ”رِيب“ کا معنی شک کیا ہے کہ جس سے چہرے سے بعد میں پردہ اٹھ جائے اور وہ یقین میں بدل جائے، اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ عنقریب تیری دعوت کی حقانیت سے اور اسی طرح تباہ کاروں کی سزا اور عذاب سے پردہ اٹھ جائے گا اور حقیقت امر ظاہر ہوگی -

مزید تاکید کے لئے اضافہ کیا گیا ہے: تیرا پروردگار ان دو گروہوں (مومنین اور کافرین) میں سے ہر ایک کو ان کے اعمال کو پوری جزا دے گا اور ان کے اعمال بے کم و کاست خود انہی کی تحویل میں دے دے گا (وَإِنْ كُنَّا لَأُولِيُوفِيَّتِهِمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ) - خدا کے یہ کام مشکل نہیں کیونکہ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور جو کچھ بھی انجام دیتے ہیں اس سے باخبر ہے (إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ) -

یہ بات جاذب نظر ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ ہم انہیں ان کے اعمال دے دیں گے اور یہ مسئلہ تجسیم اعمال کی طرف ایک اور اشارہ ہے اور اس بات کی طرف نشاندہی ہے کہ جزا اور سزا دراصل انسان کے اعمال ہی کی مختلف شکل ہے جو اس تک پہنچ جاتے ہیں -

گزشتہ انبیاء اور قوموں کی سرگزشت اور ان کی کامیابی کی رمز بیان کرنے کے بعد اور اسی طرح پیغمبر اسلام کی دلجوئی اور ان کے ارادے کی تقویت کے بعد اگلی آیت میں پیغمبر اکرم کو اہم ترین حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

استقامت و پامردی اختیار کرو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے (فَاسْتَقِمْ) -

تبلیغ و ارشاد کی راہ میں استقامت اختیار کرو، جہاد و بیکار کے راستے میں استقامت اختیار کرو، خدائی ذمہ داریوں کی انجام دہی اور تعلیمات قرآن کو عملی کل دینے میں استقامت اختیار کرو۔ لیکن یہ استقامت اسے اور اُسے خوش کرنے کے لئے نہ ہو، نہ ظاہرداری اور ریاکاری کے لئے ہو، نہ غلبے اور تسلط کے لئے، نہ مقام و منصب اور ثروت و دولت کے لئے ہو اور نہ طاقت و اقتدار کے لئے ہو، بلکہ صرف فرمان خدا کی خاطر ہو اور جس طرح تجھے حکم دیا گیا اسی طرح ہونا چاہیے (كَمَا أَمَرْتُ) -

لیکن یہ حکم صرف تجھ سے مربوط نہیں تمہیں بھی استقامت کرنا چاہیے ”اور وہ تمام لوگ بھی جو شرک سے ایمان کی طرف لوٹے ہیں اور انہوں نے اللہ کی دعوت کو قبول کیا ہے“ (وَمَنْ تَابَ مَعَكَ) -

ایسی استقامت جو افراط و تفریط سے پاک ہو، جو کمی بیشی سے خالی اور جس میں سرکشی نہ ہو (وَلَا تَطَّغَوْا) کیونکہ خدا تمہارے اعمال سے آگاہ اور باخبر ہے اور حرکت و سکون، گفتگو اور پروگرام اس سے مخفی نہیں ہے (إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ)۔

پُر معنی اور روح فرسا آیت  
ابن عباس سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے:  
ما نزل علی رسول اللہ (ص) آية كانت أشد عليه ولا أشق من هذه الآية، ولذلك قال لأصحابه حين قالوا أسرع اليك الشيبب يا رسول الله! شيبتي هود والواقعة.

پیغمبر خدا پر اس آیت سے زیادہ شدید اور گراں آیت نازل ہوئی، اسی لئے جب اصحاب نے آنحضرت سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ کے بال اتنی جلدی کیوں سفید ہو گئے اور پیری کے آثار اتنی جلدی کیوں نازل ہو گئے تو آپ نے فرمایا:  
مجھے سورہ واقعہ نے بوڑھا کر دیا ہے۔ (3)

ایک اور روایت میں ہے کہ جس وقت مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم نے فرمایا:  
شمروا، شمروا، فما رئي ضاحكاً.

دامن سمیٹ لو، دامن سمیٹ لو (کہ کام اور کوشش کا وقت ہے) اور اس کے بعد آپ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ (4)  
اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ اس آیت میں چار اہم احکام موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک انسان کے کندھے پر بارگراں کی مانند ہے۔

ان میں سے سب سے اہم حکم استقامت ہے ”استقامۃ“ جو ”قیام“ کے مادہ سے لی گئی ہے، اس لحاظ سے کہ انسان حالتِ قیام میں اپنے کام کاج پر زیادہ مسلط ہوتا ہے۔

استقامت جو طلبِ قیام کے معنی میں ہے یعنی اپنے آپ میں ایسی حالت پیدا کر کہ تجھ میں سُستی کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ کیسا سخت اور سنگین حکم ہے۔

ہمیشہ کامیابیاں حاصل کرنا نسبتاً آسان کام ہے لیکن ان کی نگہداشت کرنا اور انہیں محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے وہ بھی ایسے معاشرے میں جو پسماندہ اور عقل و دانش سے دُور ہو، ایسے لوگوں کے مقابلے میں جو ہٹ دھرم اور سخت مزاج ہوں (کثیر اور مصمم ارادے والے دشمنوں کی درمیان) صحیح، سالم، سربلند، باایمان اور آگے بڑھنے والے معاشرے کی تعمیر کے راستے میں استقامت کوئی آسان کام نہیں تھا۔

دوسرا حکم یہ کہ یہ استقامت ایسی ہو کہ اس کا ہدف صرف خدائی ہو اور اس کا سبب حکمِ خدا ہو اور یہ ہر قسم کے شیطانی وسوسے سے دور رہے یعنی بہت بڑی سیاسی اور اجتماعی طاقت ہاتھ میں لینے کے لئے ہو اور وہ بھی صرف خدا کی خاطر۔

تیسرا مسئلہ ان لوگوں کی رہبری کا ہے کہ جو راہ حق کی لوٹے ہیں اور انہیں استقامت پر ابھارنا اور آمادہ کرنا ہے، اور چوتھا حق و عدالت کے راستے میں جہاد کی رہبری کرنا اور ہر قسم کے تجاوز اور سرکشی کو روکنا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے افرا مقصد تک پہنچنے کے لئے انتہائی استقامت و پامردی دکھاتے ہیں لیکن عدالت کا لحاظ نہیں رکھتے اور وہ اکثر اوقات طغیان و سرکشی اور حد سے تجاوز کرنے لگتے ہیں۔

جی ہاں! یہ تمام احکام جمع ہو گئے اور پیغمبر اکرم پر ذمہ داریوں کا ایسا بوجھ لاد دیا کہ آپ نے مسکرانا چھوڑ دیا اور آپ کو بوڑھا کر دیا۔

بہر حال یہ حکم صرف کل کے لئے نہیں تھا بلکہ آج کے لئے اور آئندہ کل اور اس کے بعد کے لئے بھی ہے۔

آج بھی ہم مسلمانوں کی ذمہ داری، خصوصاً رہبران اسلام کی ذمہ داری کا خلاصہ یہی چار جملے ہیں: استقامت، خلوص، مومنین کی رہبری اور سرکشی و تجاوز سے اجتناب، اور ان اصولوں کو پلے باندھے بغیر ان دشمنوں پر کامیابی ممکن نہیں جنہوں نے داخلی اور خارجی طور پر ہمارا احاطہ کر رکھا ہے اور جو تمام ثقافتی، فرہنگی، سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور فوجی وسائل ہمارے خلاف استعمال کرتے ہیں۔

.....

۱۔ ”مریۃ“ (بروزن ”جزیہ“ اور بروزن ”قریۃ“ بھی آیا ہے) عزم و ارادے میں تردد و شک کے معنی میں ہے، بعض نے اسے ایسے شک کے معنی میں لیا ہے جس میں قرآن تہمت موجود ہوں، بنیادی طور پر اس کا معنی اوٹنی کے پستان سے دودھ دوہ لینے کے بعد اسے اس امید پر نچوڑنا کہ اگر کچھ دودھ پستان میں باقی ہے تو وہ نکل آئے، یہ کام چونکہ تردد و شک کے عالم میں انجام پاتا ہے

لہذا اس لفظ کا اطلاق ہر قسم تردّد و شک پر ہونے لگا۔  
 2۔ اس بارے میں اس آیت میں ”ہم“ کی ضمیر اور اسی طرح ”منہ“ کی ضمیر کس طرف لوٹتی ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض کا نظریہ ہے کہ ”ہم“ کی ضمیر قوم موسیٰ کی طرف اور ”منہ“ کی ضمیر کتاب موسیٰ کی طرف لوٹتی ہے اور آیت کا معنی یوں ہے:

3۔ تفسیر مجمع البیان: ج ۵، ص ۱۹۹۔

4۔ دَرَا لَمَثُور: مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

۱۱۳ وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَنَمَسْكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ

ترجمہ

۱۱۳۔ ظالموں پر بھروسہ نہ کرو کہ جو اس بات کا باعث ہوگا کہ آگ تمہیں چھو لے اور اس حالت میں خدا کے سوا تمہارا کوئی ولی و سرپرست نہیں ہوگا اور تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

ظالموں پر بھروسہ نہ کرو

یہ آیت ایک نہایت بنیادی، اجتماعی، سیاسی، فوجی اور نظریاتی لائحہ عمل بیان کر رہی ہے، تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کی ایک قطعی اور حتمی ذمہ داری کے طور پر ان سے کہا گیا ہے: ان لوگوں پر بھروسہ نہ کرو کہ جنہوں نے ظلم و ستم کیا ہے، نہ ان پر اعتماد کرو، نہ ان کا سہارا لو اور نہ پر تمہارا تکیہ ہو (وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا)۔ کیونکہ اس کام کے سبب آتش جہنم کا عذاب تمہیں دامنگیر ہو جائے (فَنَمَسْكُمُ النَّارُ)۔ اور خدا کے علاوہ تمہارا کوئی ولی، سرپرست اور یاور نہ ہوگا (وَمَا لَكُم مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ)۔ اور واضح رہے کہ اس حالت میں کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا (ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ)۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ ”رکون“ کا مفہوم:

”رکون“ مادہ ”رکن“ سے ستون اور ان دیواروں کے معنی میں ہے جو کسی عمارت یا دوسری چیزوں کو کھڑا کئے رکھتی ہیں، بعد ازاں یہ لفظ کسی پر اعتماد اور تکیہ کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔  
 مفسرین نے سا آیت کے ذیل میں اس لفظ کے لئے بہت سے معانی ذکر کئے ہیں لیکن وہ سب یا ان میں سے زیادہ تر ایک جامع اور کلی مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں مثلاً بعض نے اس کا معنی ”تمایل“ کیا ہے، بعض نے ہمکاری، بعض نے ”اظہار رضایت“ یا ”دوستی“، بعض نے ”خبرخواہی“ اور بعض نے اس کا معنی ”اطاعت“ کیا ہے کہ جو سب کے سب تکیہ، اعتماد اور وابستگی کے جامع مفہوم میں جمع ہیں۔

۲۔ کین امور میں ظالموں سے وابستگی نہیں کرنی چاہیے:

واضح رہے کہ سب سے پہلے تو ان ظلم و ستم میں شرکت نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی ایسے کام میں ان سے مدد لینا چاہیے۔ اس کے بعد ان چیزوں میں ان سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے جو اسلامی معاشرے کے ضعف و توانائی کا باعث ہو، استقلال اور خود کفالت کھودینے کا سبب ہو اور ایک عضو ناتواں اور وابستہ میں تبدیل کردینے کا ذریعہ ہو، ایسے امور میں ان پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایسے سہاروں کا نتیجہ اسلامی معاشروں کے لئے شکست، ناکامی اور کمزوری کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔

باقی رہا مثال کے طور پر مسلمانوں کا غیر مسلمان معاشروں سے تجارتی یا علمی روابط ایس بنیاد پر رکھنا کہ اسلامی معاشروں کے مفادات، استقلال اور ثبات محفوظ رہیں تو ایسے روابط ظالمین سے ”رکون“ اور وابستگی کے مفہوم میں داخل نہیں اور نہ ہی اسلام کی نظر میں ایسی کوئی چیز ممنوع ہے، خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اور بعد کے ادوار میں ہمیشہ ایسے روابط موجود رہے ہیں۔

۳۔ ظالموں سے وابستگی کی حرمت کا فلسفہ:

ظالموں پر تکیہ کرنا ان کی تقویت کا باعث ہے اور ان کے تقویت معاشروں میں ظلم، فساد اور تباہی پھیلانے کا باعث ہے۔

احکام اسلامی میں ہے کہ جب تک انسان مجبور نہ ہو (بلکہ جب تک اوقات مجبور بھی ہو تب بھی) ظالم کے مقرر کردہ قاضی کے ذریعے اپنا حق حاصل نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایسے جج اور ایسی حکومت کی طرف احقاق حق کے رجوع کرنے کا مفہوم ضمنی طور پر اس حکومت کو تسلیم کرنا اور اس سے تقویت پہنچانا ہے اور اس کا کام ضرر بعض اوقات اپنا حق کھودینے سے زیادہ ہوتا ہے۔

ظالموں پر بھروسہ تدریجاً معاشرے کی ثقافت و تمدن کے فکری پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے، رفتہ رفتہ ظلم اور گناہ کی برائی اور قباحت کا تصور ختم کر دیتا ہے اور لوگوں کو ظلم کرنے اور ظالم بننے کی ترغیب دیتا ہے۔ اصولی طور پر دوسروں پر تکیہ کرنا کہ جو وابستگی کی صورت میں ہو اس کا نتیجہ سوائے بدبختی کے کچھ نہیں چہ جائیکہ ظالم اور ستمگر پر ایسا بھروسہ کیا جائے۔ ایک آگے بڑھنے والا، سربلند اور قوی معاشرہ وہ ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جیسا کہ سورہ فتح کی آیہ ۲۹ میں قرآن ایک خوبصورت مثال میں فرماتا ہے:-

سرسبز پوردے کی طرح کہ جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور زندہ و سرفراز رہنے کے لئے کسی دوسری چیز سے وابستگی رکھتا ہو۔

ایک بااستقلال اور آزاد معارہ وہ ہے جو ہر لحاظ سے خود کفیل اور خود کفایت ہو اور دوسروں سے اس کا ارتباط برابر کے منافع کی بنیاد پر ہو، نہ کہ ایک ضعیف کے طاقتور پر بھروسہ سے اور انحصار کی بنیاد پر، یہ وابستگی چاہے فکری اور ثقافتی ہو یا فوجی، اقتصادی اور سیاسی ہو، ورنہ اس کا نتیجہ غلامی اور استعمار کے اور کچھ اور برآمد نہیں ہوگا اور اگر یہ وابستگی ظالموں کے ساتھ ہو تو اس کا نتیجہ ان کے ظلم سے وابستگی اور ان کے پروگراموں میں شرکت ہوگا۔ البتہ مندرجہ بالا آیت کا حکم معاشرے کے روابط کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دو افراد کے ایک دوسرے کے رابطے کے بارے میں بھی ہے یہاں تک کہ ایک آزاد با ایمان شخص کو کبھی بھی ایک ظالم و ستمگر کا سہارا نہیں لینا چاہیے ورنہ وہ اپنا استقلال گنوا بیٹھے گا، اس کے دائرہ ظلم و ستم کی طرف کھینچ جائے گا اور فساد و بے دادگری کی تقویت و وسعت کا باعث بھی ہوگا۔

۴۔ ”الذین ظلموا“ سے مراد کون لوگ ہیں؟

اس سلسلے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں، بعض نے ان سے مشرکین مراد لئے ہیں لیکن جیسا کہ بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ انہیں مشرکین میں منحصر سمجھنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اگر نزول آیت کے وقت ظالمین کا مصداق مشرک تھے تب بھی منحصر کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے، جیسا کہ روایات میں اس لفظ کی جو مشرکین کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے وہ بھی انحصار کی دلیل نہیں بنتی، کیونکہ ہم نے بار بار کہا ہے کہ ایسی روایات واضح اور آشکار مصداق بیان کرتی ہیں۔

اس بناء پر وہ تمام اشخاص جنہوں نے بندگان خدا پر ظلم اور فساد کے لئے ہاتھ دراز کئے ہیں، انہیں اپنا غلام بنایا ہے اور ان کی قوت و استعداد سے اپنے لئے فائدہ اٹھایا ہے ”الذین ظلموا“ کے عام مفہوم میں داخل ہیں اور آیت کے مصداق میں سے ہیں لیکن مسلم ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی میں کسی چھوٹے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں اور کبھی اس عنوان کے مصداق تھے اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہیں ورنہ اس صورت میں تو بہت کم افراد ہی اس سے مستثنیٰ ہوئے ہوں گے اور پھر کسی شخص پر اعتماد اور بھروسہ کرنا جائز نہیں رہے گا ہاں البتہ اگر ”رکون“ کا معنی ظلم و ستم کے پہلو پر اعتماد اور بھروسہ کیا جائے تو پھر وہ اشخاص بھی اس کے مفہوم میں شامل ہوں گے جنہوں نے ایک ہی مرتبہ ظلم میں ہاتھ آلودہ کئے ہیں۔

۵۔ ایک اشکال اور اس کی وضاحت:

بعض اہل سنت مفسرین نے یہاں ایک اشکال پیش کیا ہے جس کا جواب ان کے مبنائی رُو سے ہرگز آسان نہیں ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف ان کی روایات میں آیا ہے کہ ضروری ہے سلطان وقت کو ”اولوالامر“ سمجھتے ہوئے اس کے سامنے سرتسلیم خم کیا جائے چاہے وہ کوئی بھی ہو مثلاً انہوں نے پیغمبر اکرم سے ایک حدیث میں یوں بیان کیا ہے:

تم پر لازم ہے کہ سلطان اور بادشاہ کی اطاعت کرو۔

”وان أخذ مالک و ضرب ظہرک“

(اگرچہ وہ تمہارا مال لے لے اور تمہاری پشت پر تازیانے لگائے)۔

اسی طرح اور روایات بھی ہیں کہ جو وسیع معنی کے لحاظ سے اطاعت سلطان کی تاکید کرتی ہیں، جبکہ دوسری طرف

مندرجہ بالا آیت کہتی ہے کہ ظالم افراد پر تکیہ و اعتماد نہ کرو۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دونوں احکام کو ختم کریں اور یہ کہ بادشاہ کی اطاعت اس وقت تک ضروری ہے جب تک وہ عصیان و نافرمانی کی راہ پر نہ چلے اور کفر کے راستے پر قدم نہ رکھے۔ لیکن ان روایات کا لب و لہجہ اطاعتِ سلطان کے لئے ہرگز اس استثناء سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ بہر صورت ہماری فکر یہ ہے کہ جس طرح مکتبِ اہل بیت (علیہ السلام) میں آیا ہے کہ صرف اس حاکم اور متولی امور مسلمین کی اطاعت ضروری ہے جو عالم و عادل ہو اور جو عام مفہوم کے اعتبار سے پیغمبر اکرم اور امام معصوم (علیہ السلام) کا جانشین شمار ہوسکے، نیز اگر بنی امیہ اور بنی عباس کے بادشاہوں نے اپنے مفاد کے لئے اس سلسلے میں کچھ حدیثیں گھڑ لی ہیں تو وہ کسی طرح بھی ہمارے مکتب کے اصول اور ان تعلیمات کے ہم آہنگ نہیں ہیں جو قرآن سے لی گئی ہیں، ایسی روایات اگر قابلِ تخصیص ہیں تو انہیں تخصیص دی جائے ورنہ انہیں بالکل چھوڑ دیا جائے کیونکہ جو روایت کتابِ اللہ کے خلاف ہو وہ مردود ہے، قرآن کی صراحت ہے کہ مومنین کا امام اور پیشوا ظالم نہیں ہوسکتا اور زیرِ بحث آیت بھی صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ ظالموں کا سہارا نہ لو اور ان پر اعتماد نہ کرو، یا پھر ایسی روایات کو ضرورت اور مجبوری کی حالت کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے۔

۱۱۴ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَزُلْفًا مِنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُدْهِنُ السَّيِّئَاتِ ذَلِكَ ذِكْرٌ لِلذَّاكِرِينَ  
۱۱۵ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ

ترجمہ

۱۱۴۔ نماز کو دن کے دو اطراف اور ابتدائے رات میں بپا کرو کیونکہ نیکیاں برائیوں (اور ان کے آثار) کو برطرف کردیتی ہیں، یہ تذکرہ ہے ان لوگوں کے لئے جو اہل ذکر ہیں۔  
۱۱۵۔ اور صبر کرو کہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

نماز اور صبر

ان آیات میں اسلامی احکام میں سے دو اہم ترین نشاندہی کی گئی ہے جو در حقیقت روح ایمان اور رکن اسلام ہیں۔ پہلے نماز کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نماز کو دن کے دو اطراف میں اور اوائل شب میں قائم کرو (وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَزُلْفًا مِنَ اللَّيْلِ)۔

”طَرَفِي النَّهَارِ“ (یعنی دن کے دو طرف)، ظاہراً یہ تعبیر صبح اور مغرب کی نماز کے بارے میں ہے جو دن کے دو اطراف میں قرار پائی ہیں اور ”زُلْفًا“ کہ جو ”زُلْفہ“ کی جمع ہے نزدیکی کے معنی میں رات کے ابتدائی حصوں پر ہے کہ جو دن کے قریب بولا جاتا ہے اس بناء پر بہ لفظ نماز عشاء پر منطبق ہوگا، روایاتِ اہل بیت (علیہ السلام) میں بھی یہی تفسیر وارد ہوئی ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں تین نمازوں (فجر، مغرب اور عشاء) کی طرف اشارہ ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پنجگانہ نمازوں میں سے صرف تین نمازوں فجر، مغرب اور عشاء کا ذکر کیوں ہوا ہے اور ظہر و عصر کی نمازوں کے بارے میں گفتگو نہیں کی گئی ہے؟

اس سوال کا جواب پیچیدہ ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے ”طَرَفِي النَّهَارِ“ کا مفہوم اس قدر وسیع لیا ہے کہ اس میں فجر، ظہر، عصر اور مغرب سب کو شامل کر لیا ہے اور ”زُلْفًا مِنَ اللَّيْلِ“ کی تعبیر کہ جو نماز عشاء کے لئے ہے اس کے ساتھ پانچ نمازوں کی گنتی پوری کر لی ہے۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ ”طَرَفِي النَّهَارِ“ کے الفاظ ایسی تفسیر کی تاب نہیں رکھتے خصوصاً اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ صدر اول کے مسلمان پابندی سے نماز ظہر کو اول وقت میں اور نماز عصر کو درمیانے وقت میں (زوال اور غروب آفتاب کے درمیان) انجام دیتے تھے۔

یہاں جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ آیاتِ قرآن میں پانچوں نمازوں کا ذکر ہوا ہے مثلاً:

(بنی اسرائیل/۷۸)

کبھی تین نمازوں کا ذکر ہے جیسے محلِ بحث آیت اور کبھی صرف ایک نماز کا تذکرہ ہے، مثلاً:

(البقرہ/۲۳۸)

اس بناء پر ضروری نہیں کہ ہر موقع پر تمام پانچ نمازوں کا ایک ساتھ ذکر ہو۔ خصوصاً یہ کہ کبھی مناسبات کا تقاضا

ہوتا ہے کہ صرف نماز ظہر (صلوٰۃ الوسطیٰ) کی اہمیت کے پیش نظر اسی کا ذکر کیا جائے اور کبھی فجر، مغرب، اور عشاء ہی کے ذکر کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کبھی خستگی اور تکان کی وجہ سے یا نیند کی بناء پر ہوسکتا ہے یہ نمازیں معرض فراموشی میں چلی جائیں۔

اس کے بعد روزانہ نماز نمازوں کے لئے خصوصاً اور تمام عبادات، اطاعات اور حسنات کے لئے عموماً فرمایا گیا ہے: نیکیاں برائیوں کو برطرف کر دیتی ہیں (إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ) اور یہ ان کے لئے تذکر اور یاد دہانی ہے جو توجہ رکھتے ہیں (ذَلِكَ ذِكْرٌ لِلذَّاكِرِينَ)۔

یہ آیت قرآن کی دیگر آیات کی طرح بتاتی ہیں کہ نیک اعمال کی تاثیر یہ ہے کہ وہ بُرے اعمال کے اثرات کو برطرف کر دیتے ہیں، سورہ نساء کی آیت ۳۱ میں ہے:

”اگر بڑے گناہوں سے اجتناب کرو تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو چھپادیں گے۔“  
اور سورہ عنکبوت کی آیت ۷ میں ہے:

”وہ لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے ہم ان کے گناہوں کو چھپادیں گے۔ اسی طرح اطاعت اور نیک اعمال کے ذریعے گناہوں کے اثرات زائل ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ نفسیاتی طور پر بھی اس میں شک نہیں کہ ہر گناہ اور بُر عمل انسانی روح میں ایک طرح کی تاریکی پیدا کر دیتا ہے اور اگر اسے جاری رکھا جائے تو اس کے پیہم اور تہ بہ تہ اثرات انسان کو ایک وحشتناک صورت میں مسخ کر دیتے ہیں۔ لیکن نیک اعمال کہ جن کا سرچشمہ رضائے الہی ہوتا ہے روح انسانی کو ایک لطافت بخشتے ہیں کہ جو اس سے آثار گناہ دھو دیتے ہیں اور ان تاریکیوں کو روشنی میں بدل دیتے ہیں۔“  
”إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ“ چونکہ نماز کے حکم کے بعد فوراً آیا ہے اس لئے اس کا ایک واضح مصداق روزانہ نماز ہے اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ روایات میں اس کی تفسیر صرف روزانہ کی نماز ہوئی ہے تو وہ اس کے منحصر ہونے کی دلیل نہیں بلکہ جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے یہ ایک واضح قطعی مصداق بیان کیا گیا ہے۔

نماز کی انتہائی اہمیت

متعدد روایات جو مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام سے نقل ہوئی ہیں ان میں کچھ ایسی تعبیرات نظر آتی ہیں جو مکتب اسلام میں نماز کی اہمیت سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ ابو عثمان کہتا ہے: میں سلمان فارسی کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا، انہوں نے درخت کی ایک خشک شاخ پکڑ کر بلائی یہاں تک کہ اس کے سارے پتے جھڑ گئے، اس کے بعد میری طرف رخ کر کے کہا: تو نے پوچھا نہیں کہ میں نے یہ کام کیوں کیا ہے؟ میں نے کہا: بتائیے آپ کی اس کام سے کیا مراد تھی؟ انہوں نے کہا: یہی کام ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انجام دیا تھا، جب میں ان کی خدمت میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا، اس کے بعد رسول نے مجھ سے کہا: سلمان پوچھتے نہیں ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا، میں نے عرض کیا: فرمائیے آپ نے کیوں کیا تو آپ نے فرمایا:

إِنَّ الْمُسْلِمَ إِذَا تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ ثُمَّ صَلَّى الصَّلَاةَ الْخَمْسَ تَحَاتَّتْ خَطَايَاهُ كَمَا تَحَاتُّ بِذَا الْوَرَقِ ثُمَّ قَرَأَ هَذِهِ الْآيَةَ وَأَقَمَّ الصَّلَاةَ....

جب مسلمان وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر وہ پنجگانہ نماز ادا کرتا ہے تو اس کے گناہ اسی طرح جھڑ جاتے ہیں جیسا کہ اس شاخ کے پتے جھڑ گئے ہیں، اس کے بعد آپ نے یہ آیت ”وَأَقَمَّ الصَّلَاةَ....“ کی تلاوت فرمائی۔ (۱) ایک اور حدیث رسول اللہ کے صحابی ابی امامہ سے مروی ہے، ابی امامہ کہتے ہیں: ایک دن میں مسجد میں رسول اللہ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا، اس نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک گناہ کیا ہے کہ جس کی وجہ سے مجھ پر حد لازم ہوجاتی ہے، وہ حد مجھ پر جاری کیجئے، فرمایا: کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ اس نے عرض کی: جی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: خدا نے تیرا گناہ یا تیری حد بخش دی ہے۔ (2)

نیز حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے، آپ فرماتے ہیں: میں رسول خدا کے ساتھ مسجد میں نماز کے انتظار میں تھا کہ ایک شخص کھڑا ہو گیا، اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک گناہ کیا ہے، رسول اللہ نے اس سے منہ پھیر لیا، جب نماز ختم ہوئی تو وہی شخص پھر کھڑا ہوا اور پہلی بات دُبرائی، رسول خدا نے فرمایا: کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز یہ نماز ادا کی ہے؟ اور اچھی طرح وضو نہیں کیا؟ اس نے عرض کیا: کیوں نہیں، آپ نے فرمایا: یہ تیرے گناہوں کا



کفارہ ہے - (3)

نیز حضرت علی علیہ السلام ہی کے واسطے سے پیغمبر اکرم سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:  
أَمَّا مَنْزِلَةُ الصَّلَاةِ الْخَمْسَةِ لِأَمْتِي كَنْهَرٍ جَارِ عَلِيٍّ بَابِ أَحَدِكُمْ فَمَا يَظُنُّ أَحَدُكُمْ لَوْ كَانَ فِي جَسَدِهِ دَرَنٌ ثُمَّ اغْتَسَلَ فِي ذَلِكَ النَّهْرِ  
خَمْسَ مَرَّاتٍ لَوْ كَانَ بِيَقِي فِي جَسَدِهِ دَرَنٌ فَكَذَلِكَ وَاللَّهِ الصَّلَاةُ الْخَمْسَةُ لِأَمْتِي.  
پنجگانہ نماز میری امت کے لئے پانی کی جاری نہر کی طرح ہے کہ جو کسی شخص کے گھر کے دروازے سے گزرتی  
ہے، کیا تم گمان کرتے ہو کہ اگر اس کے بدن پر میل کچیل ہو اور پھر وہ پانچ مرتبہ روزانہ اس نہر میں غسل کرے تو پھر  
بھی کوئی میل کچیل اس کے بدن پر رہ جائے گی؟ (یقیناً نہیں) خدا کی قسم اسی طرح میری امت کے لئے پنجگانہ نماز ہے -  
(4)

بہر حال اس میں شک و شبہ نہیں کہ جب نماز اپنی شرائط کے انجام پائے تو انسان کو معنویت اور روحانیت کے ایک ایسے  
عالم میں لے جاتی ہے کہ اس کے ایمانی رشتے خدا کے ساتھ ایسے مستحکم کردیتی ہے کہ آلودگیوں اور گناہوں کے آثار  
اس کے قلب و جان سے ڈھل جاتے ہیں -  
نماز انسان کا گناہ کے مقابلے میں بیمہ کردیتی ہے اور گناہ کا زنگ اُنیئہ دل سے صاف کردیتی ہے -  
نماز ملکاتِ عالی کے پودے انسانی روح کی گہرائیوں میں اُگاتی ہے، نماز ارادے کو قوی، دل کو پاک اور روح کو طاہر  
کرتی ہے اور اگر نماز جسم بے روح کی صورت میں نہ ہو تو تربیت کا اعلیٰ مکتب ہے -

قرآن کی نہایت امید افزا آیت

زیر بحث آیت کی تفسیر میں حضرت علی علیہ السلام سے ایک عمدہ اور جاذبِ نظر حدیث منقول ہے، جو اس طرح  
ہے: ایک دن آپ نے لوگوں کی طرف رخ انور کر کے فرمایا: تمہاری نظر میں قرآن کی کونسی آیت زیادہ امید بخش ہے؟  
بعض نے کہا:

(5)

(خدا شرک کو برگز نہیں بخشتا اور اس سے کم تر جس شخص کے لئے چاہے بخش دیتا ہے) -  
امام (علیہ السلام) نے فرمایا: خوب ہے لیکن جو میں چاہتا تھا وہ نہیں ہے -  
بعض نے کہا:

(6)

(جو شخص کوئی برا عمل انجام دے یا اپنے اوپر ظلم کرے اس کے بعد خدا سے بخشش طلب کرے تو خدا کو غفور ورحیم  
پائے گا) -  
بعض نے کہا:

(7)

(کہہ دو! اے میرے بندو! کہ جنہوں نے اپنے نفسوں پر اسراف کیا ہے! خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا)  
فرمایا: اچھی ہے لیکن جو میں چاہتا تھا وہ نہیں ہے -  
بعض دیگر نے کہا:

(8)

(پرہیزگار وہ لوگ ہیں جو جب تک بُرا کام انجام دیں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو خدا کی یاد میں پڑجاتے ہیں اور اپنے اوپر  
گناہوں کو بخشش طلب کرتے ہیں اور خدا کے علاوہ کون ہے جو گناہوں کو بخشے گا -  
امام علیہ السلام نے فرمایا: یہ بھی اچھی ہے لیکن جو میں چاہتا تھا وہ نہیں ہے -  
اس وقت لوگ ہر طرف سے امام کی طرف متوجہ ہوئے اور ہمہمہ کیا تو فرمایا: کیا بات ہے مسلمانو! تو وہ عرض کرنے  
لگے: خدا کی قسم! ہماری نظر میں اس سلسلے میں اور کوئی آیت نہیں -  
امام نے فرمایا: میں نے اپنے حبیب رسول اللہ سے سنا کہ آپ نے فرمایا:  
قرآن کی امید بخش ترین آیت یہ ہے:

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَرُفْعًا مِنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُدْهِنُ السَّيِّئَاتِ ذَلِكَ ذِكْرِي لِلذَّاكِرِينَ (9)

البتہ جیسا کہ ہم نے سورہ نساء کی آیت ۸۴ کے ذیل می کہا ہے کہ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ قرآن کی زیادہ امید بخش  
آیت یہ ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونِ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ

یعنی - خدا شرک کو نہیں بخشتا اور اس سے کمتر جتنے گناہ ہیں جسے چاہے بخش دے -

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان آیات میں سے ہر ایک اس بحث کے ایک زاویے کے بارے میں ہے اور اس کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو کو بیان کرتی ہے، لہذا ان کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے درحقیقت زیر بحث آیت ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنی نمازیں اچھی طرح سے بجالاتے ہیں۔ ایسے نماز جو حضور قلب کے ساتھ ہوتی ہے وہ ان کے قلب و روح سے گناہوں کے آثار دھویتی ہے -

جبکہ دوسری آیت ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسی نماز کے حامل نہیں اور صرف توبہ کا راستہ اپنا تے ہیں لہذا یہ آیت اس گروہ کیلئے اور وہ آیت اس گروہ کے لیے زیادہ امید بخش ہے -

اس سے زیادہ امید افزاء بات کیا ہوگی کہ انسان جانے کہ جس وقت اس پاؤں پھسلے یا ہوا و ہوس کا اس پر غلبہ ہو (جبکہ وہ گناہ پر اصرار نہ کرے اور نہ اس پاؤں گناہ کی طرف کھینچا رہے) وقت نماز آپہنچے تو وہ وضو کرے اور بارگاہ معبود میں راز و نیاز کے لیے کھڑا ہو جائے، گزشتہ اعمال کے بارے میں احساس شرمندگی اس میں موجود ہو۔ وہ احساس ندامت کو جو خدا کی طرف توجہ کے لوازمات میں سے ہے، تو اس کا گناہ بخشا جائے گا اور اس گناہ کی تاریکی اس کے دل سے ہٹ جائے گی -

نماز کو جو انسان ساز پرواگرام ہے اور حسنات کی یہ تأثیر کہ وہ برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں، کے ذکر کے بعد اگلی آیت میں ”صبر“ کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہوتا ہے: صبر کرو کہ خدا نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا (وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں صبر کو نماز کے معنی میں یا رسول اللہ کے سامنے جو دشمن تھے ان کی اذیت کے مقابلے کے مفہوم میں محدود کر دیا ہے لیکن واضح ہے کہ محل بحث آیت میں صبر کے معنی کو محدود کرنے کیلئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کا ایک عمومی اور جامع مفہوم ہے کہ جس مشکلوں، مخالفتوں، ایذاؤں، ہجانون، طغیانوں اور طرح طرح کی مصیبتوں کے مقابلے میں صبر کرنے کا معنی شامل ہے اور ان تمام حوادث کے مقابلے میں پامردی اور قیام صبر کا جامع مفہوم اس میں مندرج ہے -

صبر کو جو اسلام کا ایک اساسی حکم ہے قرآن میں کئی مواقع پر اس کا ذکر نماز کے ساتھ آیا ہے۔ شاید ایسا اس بناء پر ہے کہ نماز انسان میں حرکت پیدا کرتی ہے اور صبر کا حکم مقاومت جب دوش بدوش ہوں تو ہر قسم کی کامیابی اصلی عامل بن جاتے ہیں -

اصولی طور پر کوئی نیکی صبر اور استقامت کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ نیک کاموں کے اختتام پذیر ہونے پر حتمی طور پر استقامت لازمی ہے۔ اسی بناء پر مندرجہ بالا آیت میں صبر کا حکم دیتے کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ نیکوں کا روں کی جزا ضائع نہیں کرتا۔ یعنی نیکی صبر اور قیام کے بغیر میسر نہیں آتی -

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ناگوار حوادث کے مقابلے میں مختلف لوگ رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں -

۱۔ کچھ لوگ فوراً اپنے حواس کھو بیٹھے ہیں اور قرآنی ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ وہ اوویلا شروع کر دیتے ہیں۔ قرآنی الفاظ میں:

یعنی جب اسے کوئی تکلیف چھوتی ہے تو جزع و فزع شروع کر دیتا ہے۔ (معارج/۲۰)

۲۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو حواس نہیں گنوا بیٹھتے بلکہ حادثے کے مقابلے میں تحمل و بردباری سے کھڑے ہوجاتے ہیں -

۳۔ بعض لوگ تحمل و بردباری کے ساتھ شکرگزاری بھی کرتے ہیں -

۴۔ کچھ لوگ ایسے حوادث کے مقابلے میں والہانہ جد و جہد کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حادثے کے منفی اثرات ختم کرنے کے لئے انتظامات کرتے ہیں اور ایسا جہاد شروع کر دیتے کہ تھکنے کا نام نہیں لیتے اور جب تک کہ مشکل کو سامنے سے ہٹا نہیں دیتے چین نہیں لیتے -

خدا نے ایسے صابروں کے لئے کامیابی کا وعدہ کیا ہے:

اور اگر تم لوگوں میں ثابت قدم رہنے والے بیس بھی ہوئے تو دو سو پر غالب آ جاؤ گے۔ (انفال/۶۵)

اور ان کے لیے دوسرے جہاں کی جزاء نعمات بہشت کو قرار دیا گیا ہے:

اور ان کے صبر کے بدلے خدا انہیں باغ بہشت اور ریشمی پوشاک عطا کرے گا۔ (دبر/۱۲)

- .....
۱. مجمع البیان: مذکورہ آیت کے ذیل میں۔
  2. مجمع البیان: مذکورہ آیت کے ذیل میں۔
  3. مجمع البیان: مذکورہ آیت کے ذیل میں۔
  4. مجمع البیان: مذکورہ آیت کے ذیل میں۔
  5. سورۃ نساء: آیت ۱۱۶۔
  6. سورۃ نساء: آیت ۱۱۰۔
  7. سورۃ زمر: آیت ۵۳۔
  8. سورۃ آل عمران: آیت ۱۳۵۔
  9. مجمع البیان، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

### تفسیر نمونہ جلد 09

۱۱۶ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ  
۱۱۷ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلِهَا مُصْلِحُونَ

ترجمہ

۱۱۶۔ تم سے پہلے کے زمانوں (اور قوموں) میں طاقتور علماء کیوں نہیں تھے کہ جو زمین میں فساد کو روکتے مگر یہ کہ ان میں سے بہت کم تھے کہ جنہیں ہم نے نجات دی اور جو ظلم و ستم کرتے تھے انہوں نے عیش و عشرت اور لذتوں کی پیروی کی اور وہ گنہ گار تھے (اور وہ نابود ہو گئے)۔  
۱۱۷۔ اور ایسا نہ تھا کہ تیرا پروردگار آبادیوں کو ظلم و ستم کے باعث نابود کرتا جبکہ ان کے باسی اصلاح کے درپے ہوتے۔

معاشرہ کی تباہی کا سبب

گزشتہ مباحث کی تکمیل کے لیے ان دو آیات میں ایک ایسا اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ جو معاشروں کی تباہی سے نجات کا ضامن ہے اور وہ یہ کہ ہر معاشرے میں جب تک صاحبان عقل و فکر کا ایک متعہد اور ذمہ دار گروہ موجود ہے کہ جو مفساد کو دیکھ کر ساکت اور خاموش ہو کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ ان کے خلاف مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور فکری و مکتبی حوالے سے لوگوں کی رہبری و رہنمائی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تو اس صورت میں یہ معاشرہ تباہی اور نابودی کی طرف نہیں جاسکتا۔

لیکن جب بے اعتنائی اور سکوت ہر سطح اور ہر طبقے میں حکم فرما ہو اور فساد اور برائی کے عوامل کے مقابلے میں معاشرے کا کوئی دفاع نہ ہو اور اس کا کوئی حامی و مددگار نہ ہو تو پھر فساد اور اس کے پیچھے پیچھے نابودی و تباہی یقینی ہے۔

پہلی آیت میں ان گزشتہ اقوام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار تھیں، ارشاد ہوتا ہے: تم سے پہلے کے قرون، امتوں اور قوموں میں ایسے نیک پاک طاقتور اور صاحب شعور لوگ کیوں نہیں تھے کہ جو زمین میں فساد کو پھیلنے سے روکتے (فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ)۔ اس کے بعد استثناء کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مگر تھوڑے سے افراد کو جنہیں ہم نے نجات دی (إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ)۔

یہ چھوٹا سا گروہ اگرچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہا، لیکن یہ لوگ لوط (علیہ السلام) اور ان کے چھوٹے

سے خاندان کی مثل نوح(علیہ السلام) اور ان کے چند ایمان لانے والوں کی طرح اور صالح(علیہ السلام) اور ان کے چند پیروکاروں کی مانند، اتنے کم اور اس قدر تھوڑے تھے کہ جو پورے معاشرے کی اصلاح نہ کرسکے۔  
بہرحال ظالم کہ جن کی معاشرے میں کثرت تھی ناز و نعمت اور عیش نوشی کے پیچھے لگے رہے اور بادۂ غرور اور نعمتوں اور لذتوں میں اس طرح سے مست ہوئے کہ طرح طرح کے گناہوں میں جا پڑے (وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ)۔

اس کے بعد اس حقیقت پر زرو دینے کے لئے اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: یہ تم دیکھ رہے ہو کہ خدا نے اس قوم کو دیارِ عدم کی طرف بھیج دیا تو یہ اس بناء پر تھا کہ ان کے درمیان اصلاح کرنے والے نہ تھے، کیونکہ خدا کسی قوم وملت اور شہر و دیار کو اس کے ظلم کی وجہ سے نابود نہیں کرتا اگر وہ اصلاح کی طرح قدم اٹھالے (وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ)۔ کیونکہ عام طور پر ہر معاشرے میں ظلم اور برائی ہوتی ہے لیکن اہم یہ ہے کہ لوگ اس ظلم اور برائی کا احساس کریں اور خدا انہیں اصلاح کے لئے اقدام کی مہلت دیتا ہے اور قانون آفرینش ان کے لئے حق حیات کا قائل ہے لیکن جب یہ احساس ختم ہوجاتا ہے، معاشرے بے پرواہی اور لاپالی کا شکار ہوجاتے ہیں اور ظلم وفساد پوری طرح چھاجاتا ہے تو یہ ایسی منزل ہوتی ہے کہ سنتِ فطرت کے مطابق ان کے لئے زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا، اس حقیقت کو ایک مثال واضح سے بیان کیا جاسکتا ہے۔

انسانی بدن میں ایک قوتِ مدافعت موجود ہوتی ہے، یہ قوتِ مدافعت خون کے سفید گلبول کی صورت میں ہوتی ہے، جب یہ بوا، آب و غذا اور چمڑے کی خراش وغیرہ کے ذریعے بیرونی جراثیم بدن کے اندر حملہ آور ہوتے ہیں تو خون کے یہ سفید ذرات سپاہیوں کی طرح ان کے مقابلے میں قیام کرتے ہیں اور انہیں نابود کرتے ہیں یا کم از کم ان کے پھیلاؤ کو روکتے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر کسی دن لاکھوں سپاہیوں کا یہ عظیم لشکر کمزور پڑ جائے اور بدن کا دفاع نہ کرسکے تو بدن مضر جراثیموں کے تخت و تاراج کا میدان بن جائے گا اور طرح طرح کی بیماریاں اس پر حملہ آور ہوجائیں گی۔  
پورے انسانی معاشرے کی بھی یہی کیفیت ہے، اگر مدافع قوت اور محافظ لشکر کہ جسے ”اولوا بقیۃ“ کہا گیا ہے ہٹ جائے تو اجتماعی بیماری کے حامل جراثیم کہ جو معاشرے کے گوشہ و کنار میں موجود ہوتے ہیں بڑی تیزی سے نشو و نما پاتے ہیں اور کثرت حاصل کر کے معاشرے کو سر تا پا بیمار کردیتے ہیں۔

”اولوا بقیۃ“ کا اثر معاشروں کی بقاء کے لئے اتنا حساس ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے بغیر معاشروں سے حق حیات سلب ہوجاتا ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف مندرجہ بالا آیات اشارہ کرتی ہیں۔

”اولوا بقیۃ“ کون ہیں؟

”اولوا“ کا معنی ہے ”صاحبان“ اور ”بقیۃ“ کا معنی ہے باقی ماندہ، لغت عرب میں عموماً یہ تعبیر ”اولوا الفضل“ (صاحبان فضیلت اور نیک پاک شخصیات) کے معنی میں استعمال ہوتی ہے کیونکہ عام طور پر انسان بہتر اجناس اور زیادہ نفیس چیزوں کو سنبھال رکھتا ہے اور وہ اس کے پاس رہ جاتی ہیں، اسی لئے یہ لفظ نفاست اور نیکی کا مفہوم بھی رکھتا ہے اس کے علاوہ اجتماعی مقابلوں میں جو لوگ زیادہ ضعیف ہوجاتے ہیں میدان اور منظر سے جلدی ہٹ جاتے ہیں یا نابود ہوجاتے ہیں اور وہ افراد باقی رہ جاتے ہیں جو فکر و نظر اور جسمانی قوت کے اعتبار سے زیادہ قوی ہوتے ہیں، اسی بنا پر باقی رہ جانے والے طاقتور اور قوی ہوتے ہیں، اس لئے عربوں میں ضربِ امتثل ہے:

فی الزوايا خبايا وفي الرجال بقاي.  
گوشہ وگنار میں ابھی چھپے ہوئے مسائل موجود ہیں اور مردوں میں سے باقی ماندہ شخصیتیں موجود ہیں۔  
یہی وجہ ہے کہ لفظ ”بقیۃ“ جو قرآن میں تین مواقع پر آیا ہے اسی مفہوم کا حامل ہے، طالوت و جالوت کے واقعہ میں قرآن مجید میں ہے:

حکومتِ طالوت کی حقانیت کی نشانی یہ ہے کہ صندوقِ عہد تمہارے ہاتھ اُٹے گا وہی صندوق کہ جس میں موسیٰ وبارون کے خاندان کی نفیس یادگار ہے اور تمہارے سکون کی پونجی ہے۔ (قبرہ/۲۴۸)  
نیز حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں زیر بحث سورہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

بقیۃ اللہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ (بود/۸۶)

نیز یہ جو بعض تعبیرات میں حضرت مہدی موعود علیہ السلام کو ”بقیۃ اللہ“ کہا گیا ہے وہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ

ہے کہ کیونکہ وہ خدا کی طرف سے ایک عظیم اور پُر فیض ذخیرہ ہیں کہ جنہیں اس جہان سے ظلم و ستم کی بساط اٹھنے اور عدل و داد کا پرچم گاڑنے کے لئے باقی رکھا گیا ہے۔

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ قیمتی شخصیتیں، بُرائی کے خلاف کام کرنے والے افراد اور ”اولوالباقیہ“ انسانی معاشروں پر کتنا بڑا حق رکھتے ہیں کیونکہ یہ اقوام و ملل کی بقاء اور ہلاکت سے نجات کا وسیلہ ہیں۔

مندرجہ آیت میں جو دوسرا قابل توجہ نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ جب تک کسی شہر اور آبادی کے رہنے والے مصلح ہیں خدا اسے نابود نہیں کرتا ”مصلح“ اور ”صالح“ میں جو فرق ہے اس کی طرف توجہ کرنے سے یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ صرف صالحیت اور اچھا ہونا ضامن بقاء نہیں بلکہ اگر معاشرہ صالح نہ ہو لیکن اصلاح کی کوشش کرے تو وہ بھی بقاء و حیات کا حق رکھتا ہے لیکن جب نہ صالح ہوں نہ مصلح تو پھر سنتِ افرینش کے لحاظ سے اس کے لئے حق حیات نہیں ہے اور وبہت جلد ختم ہوجائے گا۔

دوسرے لفظوں میں جب معاشرہ باقی رہ جاتا ہے لیکن اگر ظالم ہو اور اصلاح کے لئے قدم نہ اٹھائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں ظلم و جرم کا ایک سرچشمہ ہوس رانی، لذت پرستی اور عیش و نوش کی پیروی کو قرار دیا گیا ہے جسے قرآن میں ”اتراف“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ بے قید و بے عیش کوشی اور لذت پرستی طرح طرح کے انحرافات کا سرچشمہ ہے جو معاشرے کے خوشحال طبقوں میں پیدا ہوتے ہیں کیونکہ شہوت کی مستی انہیں حقیقی انسانی اقدار اور اجتماعی حقائق کے ادراک سے روک دیتی ہے اور عصیان و گناہ میں غرق کر دیتی ہے۔

۱۱۸ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ

۱۱۹ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ

ترجمہ

۱۱۸۔ اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو (بغیر کسی اختلاف کے) ایک ہی امت قرار دیتا لیکن وہ ہمیشہ مختلف ہیں۔

۱۱۹۔ مگر یہ کہ جس پر تیرا پروردگار رحم کرے اور اسی (رحمت کو قبول کرنے اور اس کے زیر سایہ حصولِ کمال) کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے اور تیرے پروردگار کا فرمان قطعی ہے کہ وہ جہنم کو جنوں اور انسانوں (میں سے سرکشوں اور نافرمانوں) سے بھر دے گا۔

تفسیر

پہلی زیر بحث آیت میں ایک سنتِ فطرت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو دراصل انسان سے مربوط تمام مسائل کی حقیقی بنیاد ہے اور وہ انسانوں کی روح، جسم، فکر، ذوق اور عشق کی عمارت میں اختلاف و فرق اور ارادہ و اختیار کی آزادی۔ ارشاد ہوتا ہے: اگر خدا چاہتا تو تمام لوگوں کو امت واحدہ بنا دیتا لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا اور ہمیشہ انسان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں (وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ)۔

اس لئے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ انہیں اپنی اطاعت پر پروردگار کی تاکید اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر نہیں کہ ان سب کو ایک ہی راستے اور ایک ہی معین پروگرام پر چلاتا، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اس میں کوئی رکاوٹ نہ تھی کہ وہ تمام انسانوں کو جبری طور پر ایک ہی طرز پر خلق کرتا اور وہ سب صاحبانِ ایمان ہوتے اور ایمان کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے لیکن ایسے ایمان کا کوئی فائدہ نہ تھا اور نہ ہی جبری ایمان کی بنیاد پر ایسا اتحاد اور ہم آہنگی کہ جو غیر اداری اسباب پر قائم ہو کسی کے مقام و مرتبے کی دلیل ہے، نہ یہ حصولِ کمال اور تکامل کا ذریعہ ہے اور نہ ہی جزاء و سزا کا موجب، بالکل ایسے جیسے خدا نے شہد کی مکہ کی کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے جبری حکم پر پھولوں کا شیرہ جمع کرتی ہے اور ملیں کے مچھر کو اس لئے پیدا ہے کہ وہ اکیلا سوراخوں میں اپنا آشیانہ بناتا ہے اور ان میں کوئی بھی اس راستے میں خود کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

اصولی طور پر انسان کی قدر و قیمت اور دوسرے موجودات سے اس کا اہم ترین امتیاز یہی ارادہ و اختیار کی آزادی کی نعمت ہے۔ اسی طرح انسان میں مختلف ذوق، سلیقے، نظریات اور تصورات موجود ہیں کہ جن میں ہر ایک معاشرے کے ایک حصے کی تعمیر و اصلاح کرتا ہے اور اس کے کسی ایک تقاضے کو پورا کرتا ہے۔

جب انسان کو ارادے کی آزادی میسر آئی ہے تو پھر عقیدے اور مذہب و مکتب کے انتخاب میں اختلافِ فطری بات ہے۔ اس

اختلاف سے ایک گروہ راہِ حق کو قبول کر لیتا ہے اور دوسرا باطل کا راستہ اپنا لیتا ہے لیکن اگر انسانوں کی تربیت ہو اور وہ پروردگار کے دامنِ رحمت اور اس کی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے صحیح تعلیمات پالیں تو پھر تفاوت کے باوجود اور آزادی اختیار کے ہوتے ہوئے راہِ حق پر گامزن ہوں گے اگرچہ اس راہ میں بھی وہ مختلف ہوں گے۔

اسی بناء پر بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: لوگ حق کو قبول کرنے کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر وہ کہ رحمت پروردگار جن کے شامل حال ہے (إِلَّا مَنْ رَجِمَ رَبُّكَ)۔ لیکن یہ رحمت الہی کسی خاص گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ سب لوگ (بشرطیکہ وہ چاہیں) اس سے استفادہ کر سکتے ہیں درحقیقت ”خدا نے لوگوں کو اس نعمت و رحمت کو قبول کرنے کے لیے پیدا کیا ہے“ (وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ) جو لوگ رحمت الہی کے سائے میں آنا چاہتے ہیں ان کے لیے راستہ کھلا ہے، وہ رحمت کہ جس کا فیضان عقلی ادراک، ہدایت انبیاء اور کتبِ آسمانی کے ذریعے سب کے لیے عام ہے اور جب اس نعمت و رحمت سے فائدہ اٹھائیں گے تو جنت اور ابدی سعادت کے دروازے ان کے سامنے کھل جائیں گے۔

اور اگر یہ صورت نہ ہوئی تو ”خدا کا فرمان صادر ہو چکا ہے کہ وہ سرکش و نافرمان جنوں اور انسانوں سے جہنم کو بھر دے گا“ (وَوَسَّعَتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأُمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ)۔

### چند نکات

۱۔ ارادے کی آزادی - اساس دعوت:

انسانی خلقت میں ارادے کی آزادی تمام انبیاء کی دعوت کی اساس ہے۔ اصولی طور پر اس کے بغیر انسان ترقی اور کمال کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتا (یہاں انسانی اور روحانی کمال مراد ہے) اس بناء پر قرآن کی متعدد آیات میں یہ بات دہرائی گئی ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام لوگوں کو جبری طور پر ہدایت کرتا لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔

خدا تو یہ کرتا ہے کہ راہِ حق کی دعوت دیتا ہے، راستے کی نشاندہی کرتا ہے، نشانیاں اور علامتیں بتاتا ہے، بے راہ روی کے نتیجے سے خبردار کرتا ہے، رہبر مقرر کرتا ہے اور راستے پر چلنے اور اسے طے کرنے کا پروگرام دیتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

راستے کی نشاندہی ہمارے ذمہ ہے - (لیل/۱۲)

یہ بھی فرماتا ہے:

تو صرف یاد دہانی کروانے والا نہ کہ زبردستی کرنے والا - (غاشیہ/۲۱-۲۲)

نیز سورہ شمس آیہ ۸ میں ہے:

خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے فجور و تقویٰ کا راستہ بتادیا۔

سورہ دہر کی آیہ ۳ میں ہے:

ہم نے انسان کو راستے کی نشاندہی کر دی ہے۔ اب وہ چاہے شکر گزاری کرے یا کفران کرے۔

اس بناء پر محل بحث آیات انسانی ارادے کی آزادی اور مکتب جبر کی نفی پر زور دینے والی واضح ترین آیات میں سے ہیں اور اس امر کی دلیل ہیں کہ حتمی فیصلہ کرنا خود انسان ہی کا کام ہے۔

۲۔ قرآنی آیات اور مقصد خلقت:

مقصد خلقت کے بارے میں قرآنی آیات میں مختلف بیانات موجود ہیں، ان میں سے ہر ایک اس مقصد کے کسی زاویے کی طرف اشارہ ہے، ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں - (ذاریات/۵۶)

یعنی مکتب بندگی میں تکامل اور ارتقاء کو پہنچ جائیں اور اس مکتب میں انسانیت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ جائیں۔

ایک اور مقام پر ہے:

وہ خدا کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے بہتر عمل کون کرتا ہے - (یعنی ایسا آزمائش کو

جس میں تربیت کی آمیزش اور جس کا نتیجہ ترقی و کمال ہو) (مُلک/۲)

زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: ”وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ“ یعنی لوگوں کو قبولِ رحمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، ایسی رحمت کہ جس میں ہدایت اور حتمی فیصلے کی طاقت کی آمیزش ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ تمام خطوط ایک ہی نکتے پر پہنچ کر ختم ہوتے ہیں اور وہ ہے انسانوں کی پرورش، ہدایت، پیشرفت اور تکامل و ارتقاء کہ جو حتمی و اصلی مقصدِ خلقت شمار ہوتا ہے، ایسا مقصد کہ جس کی بازگشت خود انسان کے ساتھ ہے نہ کہ خدا کے ساتھ کیونکہ وہ ایک ایسا وجود ہے کہ جس کی تمام پہلوؤں سے کوئی انتہا نہیں اور وہ ایسا معبود ہے کہ جس میں کوئی نقصان نہیں کہ وہ مخلوق کو پیدا کر کے کمی اور ضرورت کو پورا کرے۔

۳۔ ایک نکتے کی وضاحت:

آخری آیت میں جن و انس سے جہنم کو بھرنے کے بارے میں خدا کی تاکیدی فرمان موجود ہے لیکن واضح ہے کہ اس حتمی فرمان کی صرف ایک شرط ہے اور وہ رحمتِ الہی کے دائرے سے باہر نکلنا اور اس کے بھیجے ہوئے بزرگوں کی ہدایت و رہنمائی کو ٹھکرانا، لہذا اس طرح سے آیت نہ صرف مکتبِ جبر کے لئے دلیل نہیں بنتی بلکہ اختیار و آزادی کے لئے تاکید مزید ہے۔

۱۲۰ وَكَلَّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرٌ لِلْمُؤْمِنِينَ  
 ۱۲۱ وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ  
 ۱۲۲ وَإِنظُرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ  
 ۱۲۳ وَبِهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهَا فَعَبْدُهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ

ترجمہ

۱۲۰۔ ہم نے پیغمبروں میں سے ہر ایک کی سرگزشت تم سے بیان کی ہے تاکہ تمہارا دل آرام و سکون پائے (اور تمہارا ارادہ قوی ہو) اور ان (واقعات) میں مومنین کے لئے حق، نصیحت اور یاددہانی آئی ہے۔

۱۲۱۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے بس میں ہے اسے انجام دو ہم بھی انجام دیتے ہیں۔

۱۲۲۔ اور انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں۔

۱۲۳۔ اور آسمانوں اور زمین کے غیب (اور مخفی اسرار) خدا کے لئے اور تمام امور کی بازگشت اس کی طرف ہے، اس کی پرستش کرو اور اس پر توکل کرو اور جو کچھ تم کرتے ہو تمہارا پروردگار اس سے غافل نہیں ہے۔

گزشتگان کے واقعات کے مطالعہ کے چار اثرات

ان آیات کے ساتھ ہی سورہ ہود اختتام پذیر ہوتی ہے، ان آیات میں اس سورہ کی تمام مباحث کا کلی نتیجہ بیان ہوا ہے، اس سورہ کا چونکہ زیادہ حصہ انبیاء کے بارے میں اور گزشتہ اقوام کے عبرتناک واقعات کے بارے میں ہے لہذا یہاں ان داستانوں کے گراں بہا نتائج کو چار عنوانات کے تحت بطور خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انبیاء کے مختلف واقعات تجھ سے بیان کئے ہیں تاکہ تیرے دل کو مضبوط کریں اور تیرے ارادے کو تقویت دیں (وَکَلَّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ)۔

لفظ ”کلا“ ان سرگزشتوں کے تنوع اور ان کی مختلف اقسام کی طرف اشارہ ہے، ان میں سے ہر ایک میں انبیاء سے ایک قسم کی روگرانی، ایک قسم کے انحرافات اور ایک قسم کے عذاب کی طرف اشارہ ہے، یہ تنوع انسانی زندگی کے مختلف زاویوں اور گوشوں پر کئی طرح سے واضح روشنی ڈالتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے لئے تثبیتِ قلب اور ان کے ارادے کو تقویت بخشنا (کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے) بلکہ ایک فطری امر ہے کیونکہ سخت ہٹ دھرم اور نہایت بے رحم دشمنوں کی مخالفتیں خواہ نہ خواہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دل پر اثر ڈالتی تھیں کیونکہ آپ بھی انسان اور بشر تھے لیکن اس بناء پر کہ نامیدی اور یاس کی تھوڑی سی گرد بھی آپ کے قلبِ پاک پر نہ پڑے اور آپ کا اپنی ارادہ ان مخالفتوں اور کارشکنیوں سے کمزور نہ ہو خدا تعالیٰ آپ سے انبیاء کے واقعات، ان کے کام کی مشکلات، ہٹ دھرم قوموں کے مقابلے میں ان کی استقامت و پامردی اور بالآخر کامیابی کے واعاات یکے بعد دیگرے بیان کرتا ہے تاکہ رسول اللہ کا قلب و روح اور اسی طرح مومنین کے جو

اس عظیم جنگ اور معرکے میں آپ کے دوش بدوش شریک تھے اور روز قوی تر ہوتے رہیں۔ اس کے بعد ان واقعات کا بیان کرنے کے دوسرے نتیجے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ان واقعاتِ انبیاء میں زندگی سے مربوط حقائق ہیں، ان میں کامیابی اور ناکامی کے عوامل تمام تر تجھے بیان کر دیئے گئے ہیں (وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ)۔ (۱)

ان واقعات کے بیان کا تیسرا اور چوتھا نتیجہ جو واضح ہو کر سامنے آتا ہے یہ ہے کہ ”مومنین کے لئے وعظ و نصیحت اور تذکر و یاد دہانی ہے“ (وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرٌ لِلْمُؤْمِنِينَ)۔

یہ جاذبِ نظر ہے کہ مؤلف المنار نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے کہ اس آیت میں ایجاز و اختصار کا ایسا معجزہ ہے کہ گویا گزشتہ تمام واقعات کا اعجاز اس نے اپنے اندر سمولیا ہے اور چند مختصر سے الفاظ کے ذریعے اس میں اس کے تمام فوائد بیان کر دیئے گئے ہیں۔

بہر حال یہ آیت دوبارہ تاکید کرتی ہے کہ قرآن کے تاریخی واقعات کو معمولی نہ سمجھا جائے اور ان سے سننے والوں کی ضیافتِ طبع کے لئے استفادہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ زندگی کے بہترین دروس کا مجموعہ ہیں، ان میں انسانوں کے آج اور کل کے تمام زاویوں اور پہلوؤں سے راہ گشائی کی گئی ہے۔

اس کے بعد حضرت پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ تم بھی دشمن کی طرف سختیوں اور ہٹ دھرمیوں کے مقابلے میں وہی کچھ کہو جو بعض پیغمبر اُن کے جواب میں کہتے تھے، فرمایا: وہ کہ جو ایمان لائیں گے ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے بس میں ہے وہ انجام دو اور گنجائش نہ چھوڑو اور جو کچھ ہماری طاقت ہوگی ہم بھی انجام دیں گے (وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ أَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ)۔ تم انتظار میں رہو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ہزیمت اٹھاتا ہے (وَإِن تَظُنُّوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ)۔

تم ہماری شکست کے خیالِ خام میں رہو اور ہم تمہارے لئے خدا کے واقعی عذاب کے انتظار میں ہیں کہ جو یا ہمارے ہاتھوں تمہیں پہنچے گا یا براہِ راست خدا کی طرف سے۔

ایسی دھمکیاں جو ”امر“ کی صورت میں ذکر ہوئی ہیں قرآن کے دیگر مقامات پر بھی ہیں۔ مثلاً:

جو چاہو کرو خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔ (حم سجدہ/۴۰)

نیز یہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ مشار الیہ سورہ ہے، ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے مطابقت رکھتا ہے کیونکہ سورہ کا زیادہ تر حصہ جو گزر چکا ہے گزشتہ انبیاء کے حالات کے بارے میں ہی تھا۔

شیطان کے بارے میں ہے:

اپنی آواز سے انہیں حرکت میں لے او اور اپنا سوار اور پیدا لشکر ان کی طرف بھیجو۔ (بنی اسرائیل/۶۴)

واضح رہے کہ امر کے یہ تمام صیغے کسی کام پر ابھارنے کے لئے بلکہ وہ سب کے سب دھمکی کا پہلو رکھتے ہیں۔ اس سورہ کی آخری آیت توحید (توحیدِ علم، توحیدِ افعالی اور توحیدِ عبادت) بیان کر رہی ہے جیسا کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات علمِ توحید کے بارے میں تھیں۔

درحقیقت اس آیت میں توحید کے تین پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے:

پہلا: پروردگار کی توحیدِ علمی، آسمانوں اور زمینوں کے غیبی اسرار کے ساتھ مخصوص ہیں اور وہی ہے جو تمام آشکار و نہاں بھیدوں سے باخبر ہے (وَاللَّهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ)۔ اور اس کے غیر کا علم محدود علم اور زمین و آسمان کے طول و عرض میں موجود تمام چیزوں کے بارے میں وہ علم ذاتی پروردگار کی ذاتِ پاک کے ساتھ مخصوص ہے۔

دوسرا: یہ کہ تمام امور کی باگ ڈور اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور تمام چیزوں کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے (وَاللَّهُ يَرْجِعُ الْأُمْرَ كُلَّهُ)۔ اور یہ توحیدِ افعالی کا مرحلہ ہے۔

تیسرا: یہ کہ اب جبکہ لامحدود اور بے پایاں قدرت اس کی ذاتِ پاک سے مخصوص ہے اور ہر چیز کی بازگشت اس کی طرف ہے لہذا صرف اس کی پرستش کرو (فَاعْبُدْهُ)۔ اور اس پر توکل کرو (وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ)۔ اور یہ توحیدِ عبادت کا پہلو ہے۔ اور چونکہ نافرمانی و سرکشی گناہ ہے لہذا اس سے بچو کیونکہ ”جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے (وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ)۔

چند قابلِ توجہ نکات



۱۔ علمِ غیبِ خدا سے مخصوص ہے:

جیسا کہ ہم ساتویں جلد میں سورہ اعراف کی آیہ ۱۸۸ اور پانچویں جلد میں سورہ انعام کی آیہ ۵۰ کے ذیل میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسرارِ نہاں اور اسرارِ گزشتہ و آئندہ پر آگاہی اور ان کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے، قرآن مجید کی مختلف آیات بھی اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ وہ اس صفت میں اکیلا ہے اور کوئی شخص اس کی مانند نہیں ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آیاتِ قرآن میں علمِ غیب کے کچھ حصوں کی نسبت انبیاء کی طرف دی گئی ہے یا بہت سی آیات و رمایات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ معصومین علیہم السلام کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ حضرات بعض اوقات آنے والے واقعات اور اسرارِ نہاں کی خبر دیتے تھے تو یہ جاننا چاہیے کہ یہ بھی خدائی تعلیم سے ہوتا ہے۔

وہی ہے کہ جب مصلحت دیکھتا ہے تو اسرارِ غیب کا کچھ علم اپنے خاص بندوں کو تعلیم دیتا ہے لیکن یہ علم ذاتی ہے اور لامحدود بلکہ تعلیمِ الہی کے ذریعے سے ہے اور اتنا ہی ہوتا ہے جتنا وہ اپنے ارادے سے عطا کرتا ہے۔ اس وضاحت سے ان تمام بدگوئی کرنے والوں کا جواب واضح ہوجاتا ہے کہ جو شیعہ عقیدے پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ انبیاء اور ائمہ کو عالمِ الغیب جانتے ہیں۔

خدا نہ صرف انبیاء اور ائمہ کو مناسب موقع اور محل پر اسرارِ غیبِ تعلیم کرتا ہے بلکہ بعض اوقات ان کے علاوہ افراد کو بھی اس قسم کی تعلیم دیتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ گرامی کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان سے کہا: ڈرو نہیں ہم یہ بچہ تمہاری طرف پلٹادیں گے اور اسے انبیاء میں سے قرار دیں گے۔  
قرآنی الفاظ میں:

یہاں تک کہ پرندے اور دوسرے جانور ضروریاتِ زندگی کے ماتحت مخفی اسرار سے آگاہی حاصل کر لیتے ہیں، حتیٰ کہ نسبتاً مستقبل بعید کے واقعات سے بھی آگاہ ہوجاتے ہیں کہ جس کا تصور ہمارے لئے مشکل اور پیچیدہ ہے اور یوں بعض مسائل جو ہمارے لئے غیب شمار ہوتے ہیں ان کے لئے غیب نہیں ہیں۔

۲۔ عبادتِ خدا کے لئے مخصوص ہے:

مندرجہ بالا آیت میں عبادتِ خدا کے لئے مخصوص ہونے کے بارے میں ایک لطیف دلیل بیان ہوئی ہے اور وہ یہ کہ اگر پرستشِ عظمت اور صفاتِ جمال و جلال کی بناء پر ہے تو یہ صفات سب سے بڑھ کر خدا میں موجود ہیں اور دوسرے اس کے مقابلے میں ناچیز و حقیر ہیں، عظمت کی سب سے بڑی نشانی علمِ لامحدود اور قدرت ہے پایاں ہے کہ جن کے بارے میں زیرِ نظر آیت کہتی ہے کہ یہ دونوں اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور اگر پرستشِ مشکلات کے موقع پر معبود کی پناہ لینے کی خاطر ہے تو یہ اہلیت اس میں ہے کہ جو بندوں کی تمام ضروریات، حاجات اور اسرارِ غیب سے باخبر ہو اور ان کی دعا قبول کرنے اور ان کی آرزوؤں کو پورا کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اسی بناء پر توحیدِ صفات توحیدِ عبادت کا سبب بن جاتی ہے۔ (غور کیجیے گا)۔

۳۔ تمام تر سیر و سلوک کا خلاصہ:

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پروردگار کی عبودیت کے ذریعے انسان کی تمام تر سیر و سلوک کا خلاصہ زیرِ بحث آیت کے دو لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے، یعنی ”فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ“ کیونکہ عبادت چاہے عام عبادت کی طرح جسمانی ہو یا روحانی، مثلاً عالمِ آفرینش اور نظامِ اسرارِ ہستی میں غور و فکر، وہ اس سیر و سلوک کا آغاز ہے اور توکل یعنی طور تمام امور کو خدا کے سپرد کرنا کہ جو ایک طرح سے ”فَنَا فِي اللَّهِ“ ہے اس سیر کا آخری نقطہ ہے۔ اس تمام راستے میں ابتداء سے لے لے انتہا تک توحیدِ صفات کی طرف توجہ راہرو کی مدد کرتی ہے اور کوشش و عشق سے ملی ہوئی جستجو پر ابھارتی ہے۔

پروردگار! ایسا کر کہ ہم تجھے تیری صفاتِ جمال و جلال کے پہچانیں اور ایسا کر کہ ہم آگاہی اور علم کے ساتھ تیری طرف حرکت کریں۔

پروردگار! ہمیں توفیق دے کہ ہم خلوص کے ساتھ تیری عبادت کریں اور عشق کے ساتھ تجھ پر توکل کریں۔

پروردگار! اس سختی کے زمانے میں جبکہ ہمارے عظیم الشان اسلامی انقلاب کے بعد روز افزوں مشکلات نے ہر طرف

سے ہمیں گھیر رکھا ہے اور دشمن اس انقلاب کے نور کو بجاہدینے کے دریے ہیں، ہماری امید صرف تو ہے اور ان مشکلات کے حل کے لئے ہمارا سہارا تیری ذات پاک ہے۔  
 پروردگار! یہاں تک کا راستہ ہم نے طے نہیں کہ بلکہ تیری آشکار اور مخفی تائیدیں تھیں کہ جنہوں اس مرحلے تک پہنچنے کے لئے ہر جگہ ہمیں توانائی بخشی، جو راستہ باقی رہ گیا ہے اس میں بھی ہمیں اس عظیم نعمت سے محروم نہ فرما، اپنا لطفِ خاص ہم سے دُور نہ کر اور ہمیں اس کی بھی توفیق دے کہ ہم اس تفسیر کو کہ جو تیری عظیم آسمانی کتاب کی طرف ایک نیا دریچہ کھولتی ہے تکمیل تک پہنچائیں۔

.....

۱۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”ہذہ“ ضمیر کا مرجع ”ابناء الرسل“ ہیں یہ مرجع ضمیر کے قریب بھی ہے، عبارت میں اس کا ذکر بھی ہے اور آیت میں موجود مباحث سے مناسبت بھی رکھتا ہے، اس امر کی طرف توجہ کرتے ہوئے ضمیر کا ایسے مرجع کی طرف لوٹنا بالکل واضح ہے۔

سورہ ہود کی تفسیر اختتام کو پہنچی

## تفسیر نمونہ جلد 09

سورہ یوسف

چند ضروری امور

اس سورہ کی تفسیر شروع کرنے پہلے چند امور کا ذکر ضروری ہے:

۱۔ یہ سورہ کہاں نازل ہوئی؟

اس بارے میں یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی مفسرین میں کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ صرف ابن عباس سے منقول ہے کہ اس کی چار آیات (پہلی تین آیات اور ایک ساتویں آیت) مدینہ میں نازل ہوئیں۔  
 لیکن دوسری آیات سے ان آیات کے ربط پر غور و فکر کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہیں دیگر آیات سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس بناء پر ان چار آیات کے مدینہ میں نازل ہونے کا احتمال بہت ہی ضعیف ہے۔

۲۔ سورہ کا مضمون:

اس سورہ کی چند آخری آیات کے سوا تمام آیات خدا کے پیغمبر حضرت یوسف کے نام سے موسوم ہے نیز اسی بناء پر قرآن مجید میں جو مجموعاً حضرت یوسف (علیہ السلام) کا نام ۲۷ مرتبہ آیا ہے اس میں سے ۲۵ مرتبہ اسی سورہ میں ذکر ہوا ہے۔ صرف دو مواقع پر دیگر سورتوں (سورہ غافر آیہ ۳۴ اور سورہ انعام آیہ ۸۴) میں آپ کا نام آیا ہے۔  
 قرآن کی دیگر سورتوں کے برعکس اس سورہ کا پورا مضمون ایک دوسرے سے مربوط اور ایک واقعہ کے نشیب و فراز سے متعلق ہے۔ دس سے زیادہ حصوں میں بیان ہونے والی یہ داستان نہایت واضح، جاذب، جچی ٹلی، عمیق اور بیجان خیز ہے۔

بے ہدف داستان پردرازیوں نے پاپست اور غلیظ مقاصد رکھنے والوں نے اس اصلاح کنندہ واقعہ کو ہوس بازوں کے لیے ایک عشقیہ داستان بنانے اور حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے واقعات کے حقیقی چہرے کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسے ایک رومانی فلم بنا کر پردہ سیمیں پر پیش کرنا چاہا ہے، لیکن قرآن کہ جس کی ہر چیز نمونہ اور اسوہ ہے اس واقعے کے مختلف مناظر پیش کرتے ہوئے اعلیٰ ترین عفت و پاکدامنی، خودداری، تقویٰ، ایمان اور ضبط نفس کے درس دیتے ہیں۔ اس طرح سے کہ ایک شخص اسے جتنی مرتبہ بھی پڑھے ان قوی جذبوں سے متاثر

ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔  
اسی بناء پر قرآن نے اسے ”احسن القصص“ (بہترین داستان) جیسا خوبصورت نام دیا ہے اور اس میں اولوا الالباب (صاحبان فکر و نظر) کے لیے کئی عبرتیں بیان کی ہیں۔

۳۔ یہ سورہ قرآن کا ایک اور اعجاز:  
اس سورہ کی آیات میں غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرآن تمام پہلوؤں سے معجزہ ہے اور اپنے واقعات میں جو ہیرو و پیش کرتا ہے وہ حقیقی ہیرو و ہوتے ہیں نہ کہ خیالی۔ کہ جن میں سے ہر ایک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے نظیر ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام):  
وہ بت شکن ہیرو، جن کی روح بلند تھی او جو طاغوتوں کی کسی سازش میں نہ آئے۔

حضرت نوح (علیہ السلام):  
طویل اور پر برکت عمر میں۔ صبر و استقامت، پامردی اور دلسوزی کے ہیرو۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام):  
وہ ہیرو کہ جنہوں نے ایک سرکش اور عصیان گر طاغوت کے مقابلے کے لیے ایک ہٹ دھرم قوم کو تیار کر لیا۔

حضرت یوسف (علیہ السلام):  
ایک خوبصورت، ہوس باز اور حیلہ گر عورت کے مقابلے میں پاکیزگی، پارسائی اور تقویٰ کے ہیرو۔  
علاوہ ازیں اس واقعے میں قرآنی وحی کی قدرت بیان اس طرح جھلکتی ہے کہ انسان حیرت زدہ ہوجاتا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کئی مواقع پر یہ واقعہ عشق کے بہت ہی باریک مسائل تک جا پہنچتا ہے اور قرآن انہیں چھوڑا کر ایک طرف سے گزرے بغیر ان تمام مناظر کو ان کی باریکیوں کے ساتھ اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ سامع میں ذرہ بھر منفی اور غیر مطلوب احساس پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن تمام واقعات کے متن سے گزرتا ہے لیکن تمام مقامات پر تقویٰ و پاکیزگی کی قوی قوی شعاعوں نے مباحث کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

۴۔ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا واقعہ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد:  
اس میں شک نہیں کہ قبل از اسلام بھی داستان یوسف لوگوں میں مشہور تھی کیونکہ تورات میں سفر پیدائش کی چودہ فصلوں (فصل ۳۷ تا ۵۰) میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، البتہ ان چودہ فصلوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تورات میں جو کچھ ہے وہ قرآن سے بہت ہی مختلف ہے، ان اختلافات کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ کس حد تک پیراستہ اور ہر قسم کے خرافات سے پاک ہے، یہ جو قرآن پیغمبر سے کہتا ہے: ”اس سے پہلے تو غافل تھا“ اس عبرت انگیز داستان کی خالص واقعیت سے ان کی عدم آگہی کی طرف اشارہ ہے (اگر احسن القصص سے مراد واقعہ یوسف ہو)۔

موجودہ تورات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کی خون آلود قمیص دیکھی تو کہا: یہ میرے بیٹے کی قبا ہے جسے جانور نے کھالیا ہے، یقیناً یوسف چیر پھاڑ ڈالا گیا ہے۔  
پھر یعقوب نے اپنا گریبان چاک کیا، ٹاٹ اپنی کمر سے باندھا اور مدی دراز تک اپنے بیٹے کے لئے گریہ کرتے رہے، تمام بیٹوں اور بیٹیوں نے انہیں تسلی دینے میں کسر اٹھا نہ رکھی لیکن انہیں قرار نہ آیا اور کہا کہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ اسی طرح غمزدہ قبر میں جاؤں گا۔

جبکہ قرآن کہتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام فراست سے بیٹوں کے جھوٹ کو بھانپ گئے اور انہوں نے اس معصیت میں داد و فریاد نہیں کی اور نہ اضطراب دکھایا جیسا کہ انبیاء کی سنت ہے اس مصیبت کا بڑے صبر سے سامنا کیا، اگرچہ ان کا دل جل رہا ہے، آنکھیں اشکیار تھیں، فطری طور پر کثرتِ گریہ سے ان کی بینائی جاتی رہی، لیکن قرآن کی تعبیر کے مطابق انہوں نے صبر جمیل کا مظاہرہ کیا اور اپنے اوپر قابو رکھا (کظیم)۔ انہوں نے گریبان چاک کرنے، داد و فریاد کرنے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننے سے گریز سے کیا جوکہ عزاداری کی مخصوص علامات تھیں۔

بہر حال اسلام کے بعد بھی یہ واقعہ مشرق و مغرب کے مؤرخین کی تحریروں میں بعض اوقات حاشیہ آرائی کے آیا ہے،

فارسی اشعار میں سب سے پہلے ”یوسف وزلیخا“ ہے اور اس کے بعد نویں صدی کے مشہوراعر عبدالرحمن جامی کی ”یوسف زلیخا“ ہے۔ (1)

۵۔ داستانِ یوسف ایک ہی جگہ کیوں بیان ہوئی؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دیگر انبیاء کے واقعات کے برعکس حضرت یوسف کا واقعہ ایک ہی جگہ بیان ہوا ہے جبکہ اس کے برعکس باقی انبیاء کے حالاتِ زندگی علیحدہ علیحدہ حصوں کی شکل میں قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ خصوصیت اس بنا پر ہے کہ اس واقعے کی کڑیاں خاص وضع و کیفیت کے باوجود اگر ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں تو ان کا باہمی ربط ختم ہوجاتا ہے، مکمل نتیجہ اخذ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سارا واقعہ ایک ہی جگہ ذکر ہو، مثلاً حضرت یوسف کے خواب کا آخری حصہ بیان نہ کیا جائے تو اس پہلے حصے کا کوئی مفہوم نہیں بنتا، یہی وجہ ہے کہ سورہ کے آخر میں ہے کہ جس وقت حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے بھائی مصر میں آئے اور ان کے باعظمت مقام کے سامنے جھک گئے تو حضرت یوسف نے اپنے والد گرامی کی طرف رخ کر کے کہا:

اے میرے پدر بزرگوار! یہ ہے میرے خواب کی تعبیر کہ جو میں نے ابتداء میں دیکھا تھا، خدا نے اسے سچ کر دکھایا ہے۔ (یوسف/۱۰۰)

یہ مثال اس واقعہ کے آغاز و اختتام کے درمیان نہ ٹوٹنے والے تعلقات کو واضح کرتی ہے، جبکہ دوسرے انبیاء کے واقعات اس طرح نہیں ہیں اور ان کے واقعات کا ہر حصہ الگ نتیجہ رکھتا ہے۔

اور ایک خصوصیت اس سورہ کی یہ ہے کہ قرآن مجید میں دیگر انبیاء کے حالات و واقعات آئے ہیں عام طور پر ان میں سرکش اقوام کے ساتھ ان کے مقابلوں کی تفصیل ہے کہ جن میں آخرکار ایک گروہ ایمان لے آتا ہے اور دوسرا اپنی مخالفت عذاب الہی سے نابود ہوجانے تک جاری رکھتا ہے لیکن داستانِ یوسف میں اس سلسلے میں بات نہیں کی گئی بلکہ زیادہ تر خود حضرت یوسف کی زندگی کے بارے میں ہے اور زندگی کی سخت وادیوں سے ان کے گزرنے کی داستان ہے کہ جس میں آخرکار انہیں ایک طاقتور حکومت حاصل ہوجاتی ہے اور یہ واقعہ اپنی مثال آپ ہے۔

۶۔ سورہ یوسف کی فضیلت:

اسلامی روایات میں اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں مختلف فضائل مذکور ہیں، ان میں سے ایک حدیث حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں:

من قرء سورة يوسف في كل يوم أوفى كل ليلة بعثه الله يوم القيامة وجماله مثل مال يوسف ولا يصيبه فزع يوم القيامة وكان من خيار عباد الله الصالحين.

جو شخص ہر روز یہ ہر سب سورہ یوسف کی تلاوت کرے گا، خدا اسے روزِ قیامت اس حالت میں اٹھائے گا کہ اس کا حُسن وجمال حضرت یوسف علیہ السلام کا سا ہوگا اور اسے روزِ قیامت کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور وہ خدا کے بہترین صالح اور نیک بندوں میں سے ہوگا۔ (2)

ہم نے بار بار کہا ہے کہ قرآن کی سورتوں کی فضیلت میں جو روایات آئی ہیں ان کا مطلب سطحی مطالعہ نہیں ہے اور ان کا مقصد یہ نہیں کہ بغیر غور و فکر اور بغیر عمل کے پڑھا جائے بلکہ ان سے مراد ایسی تلاوت ہے کہ جو فکر کی تمہید ہے اور ایسا غور و فکر کہ جو عمل کا سرآغاز ہے۔

اس سورہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی سزندگی کا طرزِ عمل اس سورہ کی روشنی میں مرتب کرے اور ہوا و بوس، مال و منال، جاہ و جلال اور مقام و منصب کے شدید طوفانوں کے مقابلے میں اپنے آپ پر قابو رکھے، یہاں تک کہ زندان کی تاریکیوں میں پاکدامنی محفوظ رکھنے کو برائی سے آلودہ قصرِ شاپی پر مقدم رکھے تو ایسے شخص کے قلب و روح کا حُسن وجمال حضرت یوسف کے حُسن وجمال کی طرح ہے اور قیامت کے دن کہ جب اندر کی ہر چیز نمایاں ہوجائے گی وہ خیرہ کن زیبائی حاصل کرے گا اور خدا کے صالح اور نیک بندوں کی صف میں شامل ہوگا۔

اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ چند ایک روایات میں عورتوں کو اس سورہ کی تعلیم دینے سے منع کیا گیا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عزیر مصر کی بیوی اور مصر کی ہوس باز عورتوں سے مربوط آیات اگرچہ پورے عفت بیان کے ساتھ ہیں مگر ہوسکتا ہے بعض عورتوں کے لئے تحریک کا باعث ہوں اور اس کے برعکس تاکید کی گئی ہے کہ عورتوں کو

سورہ نور کی تعلیم دی جائے کہ جس میں حاب کے بارے میں آیات ہیں -  
 لیکن ان روایات کی اسناد پر گز قابل اعتماد نہیں ہیں جبکہ اس برعکس روایات بھی موجود ہیں کہ جن میں گھروالوں کو اس  
 سورہ کی تعلیم دینے کا شوق دلایا گیا ہے -  
 علاوہ ازیں اس سورہ میں غور و خوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ عورتوں کے لئے کوئی نقطہ  
 ضعف موجود نہیں ہے بلکہ عزیز مصر کی بیوی کا واقعہ ان سب کے لئے درس عبرت ہے کہ جو شیطانی وسوسوں میں  
 گرفتار ہوتی ہیں -

- 1- کشف الظنون: حاج خلیفہ، ج ۲، ص ۶۶۱.
- 2- مجمع البیان، محل بحث سورہ کے ضمن میں.

سورہ یوسف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
 ۱ اَلرُّ تِلْكَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ  
 ۲ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ  
 ۳ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا اَوْحٰیْنَا اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِہِ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ

ترجمہ

- خدا کے نام سے جو بخشنے والا مہربان ہے -
- ۱- اَلرُّ وہ واضح کتاب کی آیات ہیں -
  - ۲- ہم نے اس پر عربی قرآن نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھو (اور غور و فکر کرو) -
  - ۳- ہم نے تیرے سامنے بہترین واقعہ بیان کیا ہے، تجھ پر اس قرآن کی وحی کر کے، اگرچہ اس سے پہلے تو غافلین میں سے تھا -

یہ داستان، ”احسن القصص“ ہے  
 اس سورہ کا آغاز بھی حروف مقطعات (الف. لامراء) سے ہوا ہے کہ جو عظمت قرآن کی نشانی ہے اور اس بات کی مظہر  
 ہے کہ یہ عمیق اور معنی خیز حروف الف با کے سادہ ترین اجزاء سے ترکیب دی گئی ہیں -  
 قرآن کے حروف مقطعات کے بارے میں اب تک تین مواقع پر (سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف کی ابتداء میں) کافی بحث  
 ہوچکی ہے لہذا اب تکرار کی ضرورت نہیں اور ہم یہ ثابت کرچکے ہیں کہ یہ حروف عظمت قرآن پر دلالت کرتے ہیں -  
 شاید یہی وجہ ہے کہ حروف مقطعات کے فوراً بعد عظمت قرآن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ”یہ کتاب بین  
 کی آیت ہیں“ وہ کتاب جو ضوفشاں ہے، حق کو باطل سے جدا کر کے دکھانے والی ہے، صراط مستقیم کی رہنما ہے اور  
 نجات و کامیابی کا راستہ بتانے والی ہے (الرُّ تِلْكَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ) -  
 یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس آیت میں دُور کے اسم اشارہ (تِلْكَ) سے استفادہ کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر سورہ بقرہ اور  
 بعض دیگر سورتوں کی ابتداء میں بھی موجود ہے، اس کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ ایسی تمام تعبیرات ان آیات کی  
 عظمت کی طرف اشارہ ہیں، یعنی یہ آیات ایسی بلند و برتر ہیں کہ گویا ان کا مقام بہت ہی بالا ہے، آسمانوں کی بلندی پر  
 بیکراں فضاؤں کی گہرائیوں میں کہ جن تک پہنچنے کے لئے بہت تگ و دو کی ضرورت ہے، ایسے ہی گرے پڑے مطالب  
 کی طرح نہیں ہیں کہ جو ہر قدم پر انسان کو مل جاتے ہیں -  
 ایسی تعبیر کے نمونے فارسی ادب میں بھی ہیں کہ ایک بلند مرتبہ شخصیت کے حضور ہم کہتے ہیں آنجناب، انمقام  
 محترم..... وغیرہ۔  
 اس کے بعد ان آیات کے نزول کا مقصد یوں بیان کیا گیا ہے: ہم نے اسے عربی قرآن بھیجا ہے تاکہ تم اسے اچھی طرح  
 سمجھ سکو (اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ) -  
 قصد صرف ان آیات کی قرائت، تلاوت اور تیرکا پڑھنا نہیں ہے بلکہ اصل انہیں سمجھنا ہے اور یہ تمام انسانی وجود کو  
 عمل کی دعوت ہے -

باقی رہا قرآن عربی میں ہونا تو اس کی شہادت دنیا کی مختلف زبانوں کا مطالعہ کرنے والوں نے دی ہے کہ یہ ایسی وسیع زبان ہے کہ جو لسان وحی کی ترجمان ہوسکتی ہے اور خدا کی باتوں کے مفہوم اور باریکیوں کو واضح کرتی ہے، اس کے علاوہ مسلم ہے کہ اسلام نے جزیرہ عربستان سے طلوع کیا ہے کہ جو تاریکی، ظلمت، وحشت اور بربریت کا مرکز ہے، ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اسے وہاں کے لوگوں ہی کو اپنے گرد جمع کرنا تھا اور اسے اس طرح سے گویا واضح ہونا چاہیے تھا کہ اُن پڑھ اور علم و دانش سے بے بہرہ افراد کو تعلیم دینا اور تعلیم ہی کے ذریعے انہیں تبدیل کرتا اور اس دین کے نفاذ کے لئے ایسا حقیقی بیج ہوتا کہ دنیا کے تمام علاقے اس کے زیر سایہ آجاتے۔

البتہ قرآن ایسی زبان کا حامل ہونے کے باوجود ساری دنیا کے لوگوں کے لئے قابل فہم نہیں ہے (اور اگر کسی اور زبان میں ہوتا تو پھر بھی یہی کچھ ہوتا) کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسی عالمی زبان نہیں ہے کہ جسے ساری دنیا کے لوگ سمجھتے ہوں لیکن یہ بات ساری دنیا کے لوگوں کے لئے اس کے تراجم کے ذریعے اس سے فائدہ اٹھانے میں رکاوٹ نہیں ہے یا اس سے بالاتر یہ بات اس میں رکاوٹ نہیں کہ اس زبان سے تدریجی طور پر آشنا ہو کر خود آیات کو سمجھ سکیں اور مفہم وحی کا اسی کے الفاظ میں ادراک کرسکیں۔

بہرحال قرآن کے عربی ہونے کا ذکر کہ جو قرآن میں دس مواقع آیا ہے ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تہمت لگائی کہ انہوں نے یہ بات ایک عجمی شخص سے یاد کی ہیں اور قرآن کے مضامین میں ایک فکر کا نتیجہ ہیں نہ کہ سرچشمہ وحی سے پھوٹے ہیں۔

ضمنی طور پر بے دریغ یہ تعبیرات تمام مسلمانوں کے لئے اس ذمہ داری کا تعین کرتی ہیں کہ وہ سب کوشش کریں اور عربی زبان کو اپنی دوسری زبان کے طور پر سیکھیں اس لئے کہ یہ وحی کی زبان ہے اور حقائق اسلام کے سمجھنے کی کلید ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ہم وحی کے ذریعے اور یہ قرآن بھیج کر تم سے ایک بہترین قصہ بیان کر رہے ہیں اگرچہ اس سے پہلے تو غافلین میں تھے (نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ)۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ”أَحْسَنَ الْقَصَصِ“ پورے قرآن کی طرف اشارہ ہے اور وہ ”بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ“ کو اس کے لئے قرینہ قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ لفظ ”قصہ“ یہاں صرف داستان اور واقعہ کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اصل لغت کے لحاظ سے کسی چیز کے آثار کی جستجو کرنے کے معنی میں ہے اور جو چیز ایک دوسرے کے پیچھے ہو عرب اسے ”قصہ“ کہتے ہیں اور چونکہ ایک موضوع کو بیان کرتے وقت کلمات اور جملے بے دریغ بیان ہوتے ہیں اس لئے کام کو ”قصہ“ کہا جاتا ہے۔

بہرحال خدا نے اس قرآن کو ”أَحْسَنَ الْقَصَصِ“ قرار دیا ہے کہ جس کا بیان نہایت زیبا ہے اور جس کے لفظ انتہائی فصیح و بلیغ ہیں اور جس کے لفظ کے معانی نہایت اعلیٰ اور عمیق ترین ہیں، جو ظاہری نظر سے بہت زیبا، انتہائی شریں اور خوشگوار اور باطنی لحاظ سے بہت ہی معنی خیز ہے۔

متعدد روایات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تعبیر پورے قرآن کے لئے بھی استعمال ہوئی ہے اگرچہ یہ احادیث زیر بحث آیت کی تفسیر کے طور پر نہیں ہیں، (غور کیجئے گا)۔

مثلاً ایک حدیث علی بن ابراہیم نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے، آپ نے فرمایا: ”أحسن القصص هذا القرآن؛ بہترین قصہ یہ قرآن ہے۔“ (۱)

روضۃ الکافی میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ایک خطبہ میں ہے:

ان أحسن وأبلغ الموعظة وأنفع التذکر کتاب اللہ عزّ ذکرہ۔

بہترین قصہ بلیغ ترین و عظیم و نصیحت اور مفید ترین تذکر اور یاددہانی کتاب خدا ہے۔ (۲)

لیکن اس کے بعد آیات کی جن میں حضرت یوسف کی سرگزشت بیان کی گئی ہے کا تعلق زیر بحث سے ملتا ہے کہ ذہن انسانی زیادہ تر اس معنی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور خدا نے حضرت یوسف کے واقعے کو ”أحسن القصص“ کا نام دیا ہے یہاں تک کہ شاید اس سورہ کی ابتدائی آیات کا مطالعہ کرتے وقت بہت سے لوگوں کے ذہن میں اس کے معنی کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں آئے گا۔

مگر ہم نے بار بار کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ ایسی آیات دونوں معانی کرنے کے لئے ہوں، قرآن بھی بطور عموم ”أحسن القصص“ ہے اور حضرت یوسف کی داستان بھی بطور خصوص ”أحسن القصص“ ہے۔

یہ واقعہ کیسے بہترین نہ ہو جبکہ اس کے بیجان انگیز پیچ و خم میں زندگی کے اعلیٰ ترین دروس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس واقعے میں ہر چیز پر خدا کے ارادے کی حاکمیت کا ہم اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں۔

حسد کرنے والوں کا منحوس انجام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی سازشوں کو نقشِ بر آب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں -

بے عفتی کی عار و ننگ اور پارسائی و تقویٰ کی عظمت و شکوہ اس کی سطور میں ہم مجسم پاتے ہیں -  
کنویں کی گہرائی میں ایک ننھے بچے کی تنہائی، زندان کی تاریک کوٹھری میں بے گناہ قیدی کے شب و روز، یاس و نامیدی کے سیاہ پردوں کے پیچھے نورِ امید کی تجلی اور آخر کار ایک وسیع حکومت کا عظمت و شکوہ کہ جو آگاہی و امانت کا نتیجہ ہے، یہ تمام چیزیں اس داستان میں انسان کی آنکھوں کے سامنے ساتھ ساتھ گزرتی ہیں -  
وہ لمحے کہ جب ایک معنی خیز خواب سے ایک قوم کی سرنوشت بدل جاتی ہے -  
وہ وقت کہ جب ایک قوم کی زندگی ایک بیدار خدائی زمام دار کے علم و آگہی کے زیر سایہ نابودی سے نجات پالیتی ہے -  
اور ایسے ہی دسیوں درس، جس داستان میں موجود ہوں وہ کیوں نہ ”أحسن القصص“ ہو -  
البتہ یہی کافی نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان ”حسن القصص“ ہے اہم بات یہ ہے کہ ہم میں یہ لیاقت ہو کہ یہ عظیم درس ہماری روح میں اتر جائے -

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حضرت یوسف (علیہ السلام) کے واقعے کو ایک اچھے رومانوی واقعے کے عنوان سے دیکھتے ہیں، ان جانوروں کی طرح جنہیں ایک سرسبز و ادب اور پھل پھول سے لدے ہوئے باغ میں صرف گھاس نظر آتی ہے کہ جو اُن کی بھوک زائل کر دے -

ابھی تک بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو اس داستان کو جھوٹے پر وبال دے کر کوشش کرتے ہیں کہ اس سے ایک سیکسی (sexy) داستان بنالیں جبکہ اس واقعے کے لئے یہ بات ناشائستہ ہے اور اصل داستان میں تمام اعلیٰ انسانی قدریں جمع ہیں، آئندہ صفحات میں دیکھیں گے کہ اس واقعے کے جامع اور خوبصورت پیچ و خم کو نظر انداز کر کے نہیں گزرا جاسکتا، ایک اعر شیریں سخن کے بقول:  
کبھی کبھی اس داستان کے پُر کشش پہلوؤں کی مہک انسان کو اس طرح سرمست کر دیتی ہے کہ وہ بے خود ہوجاتا ہے -

انسان کی زندگی پر اس داستان کا اثر

قرآن کا بہت سا حصہ گزشتہ قوموں کی سرگزشت اور گزرے ہوئے لوگوں کے واقعاتِ زندگی کی صورت میں ہے، اس پہلو پر نظر کرنے سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایک تربیت کنندہ اور انسان ساز کتاب میں یہ سب تاریخ اور داستانیں کیوں ہیں -

لیکن ذیل کے چند نکات کی طرف توجہ کرنے سے یہ مسئلہ واضح ہوجاتا ہے:

1- تاریخ انسانی زندگی کے مختلف مسائل کی تجربہ گاہ ہے اور جو چیزیں انسان عقلی دلائل سے اپنے ذہن میں منعکس کرتا ہے انہیں تاریخ کے صفحات میں عینی صورت میں کھلا ہوا پاتا ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ معلومات میں سے زیادہ قابل اعتماد وہ ہیں جو حسّی پہلو رکھتی ہیں، واقعاتِ زندگی میں تاریخ کا اثر واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے، انسان اپنی آنکھوں سے صفحاتِ تاریخ میں اختلاف و انتشار کی وجہ سے کسی وم کی مرگ بار شکست دیکھتا ہے اور اسی طرح اتحاد و ہم بستگی کے باعث کسی دوسری قوم کی درخشاں کامیابی کا مشاہدہ کرتا ہے، تاریخ اپنی زبان بے زبانی سے ہر قوم کے مکتب، روش اور طرزِ عمل کے قطعی اور ناقابل انکار نتائج بیان کرتی ہے -  
گزشتہ لوگوں کے حالات ان کے نہایت قیمتی تجربات کا مجموعہ ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ زندگی کا ماحصل تجربے کے علاوہ کچھ بھی نہیں -

تاریخ ایک آئینہ ہے جو اپنے اندر تمام انسانی معاشروں کا ڈھانچہ منعکس کرتا ہے، یہ آئینہ ان کی برائیاں، اچھائیاں، کامیابیاں، ناکامیاں، فتوحات، شکستیں اور ان سب امور کے عوامل و اسباب دکھاتا ہے، اسی بنا پر گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ انسان کی عمر کو بالکل ان کی عمر جتنا طویل کر دیتا ہے کیونکہ اس طرح وہ ان کی پوری عمر کے تجربات سمیٹ لیتا ہے، اسی بنا پر حضرت علی علیہ السلام اپنے ابرو مند فرزند کے نام اپنے تاریخی وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:  
ای بنی ائی وان لم اکن عمرت عمر من کان قبلی فقد نظرت فی أعمالهم وفکرت فی اخبارهم وسرت فی آثارهم حتّٰی عدت کأحدھم بل کأئی بما انتھٰی الی من امورهم قد عمرت من اولھم الی آخرھم.

اے میرے! بیٹے اگر گزشتہ لوگوں کی عمر یکجا مجھے حاصل نہیں تاہم میں نے ان کے اعمال دیکھے ہیں، ان کے واقعات میں غور فکر کیا ہے اور ان کے آثار کی سیر و سیاحت کی ہے اس طرح سے گویا میں ان میں سے ایک ہو گیا ہوں بلکہ اس بنا پر کہ میں نے ان کی تاریخ کے تجربات معلوم کئے ہیں تو گویا میں نے ان کے اولین و آخرین کے ساتھ زندگی گزاری ہے -

البتہ، یہاں تاریخ سے مراد وہ تاریخ ہے جو خرافات، اتہامات، دروغ گوئیوں، چاپلوسیوں، ثناخوانیوں، تحریفوں اور مسخ شدہ واقعات سے خالی ہو لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسی تاریخیں بہت کم ہیں، اس سلسلے میں قرآن نے حقیقی تاریخی کے جو نمونے پیش کئے ہیں اس کے اثر کو نظر سے اوجھل نہیں رہنا چاہیے۔

ایسی تاریخ کی ضرورت ہے کہ جو آئینے کی طرح صاف ہو نہ کہ کٹر نما ہو، ایسی تاریخ کہ جو صرف واقعات ذکر نہ کرے بلکہ اس کی بنیاد اور نتائج بھی تلاش کرے۔

ان حالات میں قرآن کہ جو تربیت کی ایک اعلیٰ کتاب ہے تاریخ سے استفادہ کیوں نہ کرے اور گزشتہ لوگوں کے واقعات سے مثالیں اور شواہد پیش نہ کرے۔

۲۔ علاوہ ازیں تاریخ ایک خاص قوتِ جذبہ رکھتی ہے اور انسان بچپن سے بڑھاپے تک اپنی عمر کے تمام ادوار میں اس زبردست قوتِ جذبہ کے زیر اثر رہتا ہے، اسی بنا پر دنیا کی ادبیات کا ایک اہم حصہ اور اشاء پردازوں کے عظیم آثار اور واقعات پر مشتمل ہیں۔

شعراء اور عظیم مصنفین کے بہترین آثار چاہے وہ فارسی میں ہوں یا دوسری زبانوں میں یہی داستانیں اور واقعات ہیں، گلستانِ سعدی، شاینامہ فردوسی، خمسہ نظامی اور معاصر مصنفین کے دلکش آثار، اسی طرح ہيجان آفرین فرانسیسی مصنف ویکٹر بوگو، برطانیہ کے شکسپیئر اور جرمنی کے گوٹے سب کی تصانیف داستان کی صورت میں ہیں۔ داستان اور واقعہ چاہے نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی، نمائش کے انداز میں یا فلم کے پڑھنے والے اور دیکھنے والے پر اترا انداز ہوتا ہے اور ایسی تاثیر عقلی استدلال کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان عقلی سے پہلے حسّی ہے اور وہ جس قدر فکری مسائل میں غور و فکر کرتا ہے اس سے زیادہ حسّی مسائل میں غوطہ زن ہوتا ہے زندگی کے مختلف مسائل جس قدر میدان حسّ سے دُور ہوتے ہیں اور خالص حوالے سے ہونے میں اسی قدر ثقیل اور سنگین ہوتے ہیں اور اتنی ہی دیر سے ہضم ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ عقلی استدلال کو مضبوط بنانے کے لئے حسّی مثالوں سے مدد لی جاتی ہے، بعض اوقات ایک مناسب اور برمحل مثال استدلال کا اثر کئی گنا زیادہ کر دیتی ہے، اسی لئے کامیاب علماء وہ ہیں جو بہترین مثالیں انتخاب کرنے پر زیادہ دسترس رکھتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ عقلی استدلال حسّی، عینی اور تجرباتی مسائل کا ماحصل ہیں۔

۳۔ داستان اور تاریخ ہر شخص کے لئے قابلِ فہم ہے جبکہ اس کے برعکس استدلال کی رسائی میں سب لوگ برابر کے شریک نہیں ہیں۔

اسی لئے وہ کتاب کہ جو عمومیت رکھتی ہے اور سب کے لئے ہے، نیم وحشی، اُن پڑھ عرب کے بیابانی بدو سے لے کر عظیم مفکر اور فلسفی تک کے استفادہ کے لئے ہے اسے حتمی طور پر تاریخ، داستانوں اور مثالوں کا سہارا لینا چاہیے۔ ان تمام پہلوؤں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تمام تاریخیں اور داستانیں بیان کر کے قرآن نے تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بہترین راستہ اپنایا ہے۔

خصوصاً اس نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن نے کسی موقع پر بھی خالی تاریخی واقعات ہی بیان نہیں کر دیئے بلکہ ہر قدم پر اس سے نتائج اخذ کئے ہیں اور اس سے تربیتی حوالے سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ آپ اسی صورت میں اس کے کئی نمونے دیکھیں گے۔

۱۔ نور الثقلین: ج ۲، ص ۴۹۔

۲۔ نور الثقلین: ج ۲، ص ۴۹۔



۵ قَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ۔  
۶ وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَّبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُنمِّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔

ترجمہ

۴۔ وہ وقت (یاد کرو) جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: ابا جان! میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔

۵۔ اس نے کہا: اے میرے بیٹے، اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تیرے لئے خطرناک سازش کریں گے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

۶۔ اور اس طرح تیرا پروردگار تجھے منتخب کرے گا، تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور آل یعقوب پر تمام کرے گا جیسے اس سے پہلے تیرے باپ ابراہیم اور اسحاق پر تمام کی ہے، تیرا پروردگار عالم اور حکیم ہے۔

امید کی کرن اور مشکلات کی ابتدا

حضرت یوسف (علیہ السلام) کے واقعے کا آغاز قرآن ان کے عجیب اور معنی خیز خواب سے کرتا ہے کیونکہ یہ خواب دراصل حضرت یوسف (علیہ السلام) کی تلاطم خیز زندگی کا پہلا موڑ شمار ہوتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے آپ بڑے شوق اور وارفتگی سے باپ کے پاس آئے اور انہیں ایک نیا واقعہ سنایا جو ظاہراً زیادہ اہم نہ تھا لیکن درحقیقت ان کی زندگی میں ایک تازہ باب کھلنے کا پتہ دے رہا تھا۔

یوسف (علیہ السلام) نے کہا: ابا جان! میں نے کل رات گیارہ ستاروں کو دیکھا کہ وہ آسمان سے نیچے اترے، سورج اور چاندان کے ہمراہ تھے، سب کے سب میرے پاس آئے اور میرے سامنے سجدہ کیا (إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ)۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے یہ خواب شب جمعہ دیکھا تھا کہ جو شب قدر بھی تھی (وہ رات جو مقدرات کے تعین کی رات ہے)۔

یہ کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے جب یہ خواب دیکھا اس وقت آپ کی عمر کتنے سال تھی، اس سلسلے میں بعض نے نو سال، بعض نے بارہ سال اور بعض نے سات سال عمر لکھی ہے، جو بات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت آپ بہت کم سن تھے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ لفظ ”رأیت“ کا اس آیت میں تاکید اور قاطعیت کے ساتھ تکرار ہوا ہے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میں ان بیشتر افراد کی طرح نہیں ہوں کہ جو خواب کا کچھ حصہ بھول جاتے ہیں اور اس کے بارے میں تردد و شک سے بات کرتے ہیں، مینے پورے یقین سے دیکھا ہے کہ گیارہ ستاروں، سورج اور چاند نے میرے سامنے سجدہ کیا ہے، اور اس امر میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں ضمیر ”ہم“ استعمال ہوئی ہے کہ جو ذوی العقول کے لئے بولی جانے والی جمع منکر کی ضمیر ہے، اسی طرح لفظ ”ساجدین“ بھی آیا ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا سجدہ کرنا کوئی اتفاقی امر نہ تھا بلکہ ایک واضح پروگرام کے ماتحت وہ عاقل افراد کی طرح سجدہ کر رہے تھے۔

البتہ واضح ہے کہ سجدہ سے یہاں مراد خضوع اور احترام ہے ورنہ سورج، چاند اور ستاروں کے لئے سجدے کا مفہوم عام انسانوں کے سجدے کا سا نہیں ہے۔

اس بیجان انگیز اور معنی خیز خواب پر خدا کے پیغمبر یعقوب (علیہ السلام) فکر میں ڈوب گئے کہ سورج، چاند اور آسمان کے گیارہ ستارے، وہ بھی گیارہ ستارے نیچے اترے اور میرے بیٹے یوسف کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، یہ کس قدر معنی آفریں ہے، یقیناً سورج اور چاند میں اور اس کی ماں (یامیں اور اس کی خالہ) ہے اور گیارہ ستارے اس کے بھائی ہیں میرے بیٹے کی قدر و منزلت اور مقام اس قدر بلند ہوگا کہ آسمان کے ستارے، سورج اور چاند اس کے آستانہ پر جبہ سائی کریں گے، یہ بارگاہ الہی میں اس قدر عزیز اور باوقار ہوگا کہ آسمان والے بھی اس کے سامنے خضوع کریں گے، کتنا پُر شکوہ اور پُر کشش خواب ہے۔

لہذا پریشانی اور اضطراب کے انداز میں کہ جس میں ایک مسرت بھی تھی، اپنے بیٹے سے کہنے لگے: میرے بیٹے، اپنا یہ خواب بھائیوں کو نہ بتانا (قَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَيَّ إِخْوَتِكَ)، کیونکہ وہ تیرے خلاف خطرناک سازش کریں گے نہ کرنا ورنہ وہ تیرے لئے خطرناک سازش کریں گے کیونکہ شیطان انسان کا گھلا دشمن ہے۔ (فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا)۔ میں جانتا ہوں کہ شیطان انسان کا گھلا دشمن ہے (إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ)، وہ موقع کی تاڑ میں ہے تاکہ اپنے وسوسوں کا آغاز کرے، کینہ و حسد کی آگ بڑکائے، یہاں تک کہ بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے یہ نہیں کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ بھائی ترے بارے میں بُرا ارادی کریں گے بلکہ اسے ایک قطعی امر کی شکل میں خصوصاً لفظ ”کیداً“ کی تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو تاکید کی دلیل ہے آپ اپنے سب بیٹوں کی نفسیات سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ وہ یوسف کے بارے میں کتنے حساس ہیں، شاید یوسف کے بھائی بھی خواب کی تعبیر کے بارے میں ناواقف نہ تھے و لاوہ ازیں یہ خواب ایسا تھا جس کی تعبیر زیادہ پیچیدہ نہ تھی۔

دوسری طرف یہ خواب بچگانہ خوابوں کی طرح نہ تھا، ہوسکتا ہے کوئی بچہ خواب میں چاند اور ستاروں کو دیکھے لیکن باشعور موجودات کی طرح چاند ستارے اس کے آگے سجدہ کریں، یہ کوئی بچگانہ خواب نہیں ہے، ان وجوہ کی بنیاد پر حضرت یعقوب (علیہ السلام) بجا طور پر یوسف کے بارے میں بھائیوں کی طرف سے حسد کی آگ بھڑک اٹھنے کے بارے میں خوفزدہ تھے۔

لیکن یہ خواب صرف مستقبل میں یوسف (علیہ السلام) کے مقام کی ظاہری و مادی عظمت بیان نہیں کرتا تھا بلکہ نشاندہی کرتا تھا کہ وہ مقام نبوت تک بھی پہنچے گے کیونکہ آسمان والوں کا سجدہ کرنا آسمانی مقام کے بلند ی پر پہنچنے کی دلیل ہے اسے لئے تو ان کے پدر بزرگوار حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے مزید کہا: اور اس طرح تیرا پروردگار تجھے منتخب کرے گا (وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَّبُّكَ)، اور تجھے تعبیر خواب کا علم دے گا (وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ) (۱)۔

”احادیث“، ”حدیث“ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک واقعہ نقل کرنا، انسان چونکہ اپنا خواب ادھر ادھر بیان کرتا ہے لہذا یہاں یہ خواب کے لئے کنایہ ہے۔

اور اپنی نعمت تجھ پر اور آلِ یعقوب پر تمام کرے گا (وَيُنِّمُ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَى آلِ يَعْقُوبَ)، جیسے اس نے قبل ازیں تیرے باپ ابراہیم اور اسحاق پر کی ہے (كَمَا أَتَمَّهَا عَلَى أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ)۔

ہاں! تیرا پروردگار عالم ہے اور حکمت کے مطابق کام کرتا ہے (إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ)۔

.....

۱۔ ”تاویل“ در اصل کسی چیز کو لوٹا دینے کے معنی ہے اور کوئی کام یا بات اگر اپنے آخری مقصد تک پہنچ جائے تو اسے ”تاویل“ کہتے ہیں، خارجی طور پر خواب کا صورت پزیر ہوجانا بھی ”تاویل“ کا مصداق ہے۔

اہم نکات

۱۔ خواب دیکھنا:

رؤیا اور خواب دیکھنے کا مسئلہ ایسے مسائل میں سے رہا ہے جنہوں نے عام افراد اور اہل علم کی فکر نظر کو کئی پہلوؤں سے اپنی طرف مبذول رکھا ہے۔

یہ اچھے اور برے، وحشتناک اور دلپزیر، سرور آفریں اور غم انگیز مناظر جو انسان خواب میں دیکھتا ہے کیا ہیں؟ کیا یہ گزشتہ زمانے سے مربوط ہیں اور ان مناظر نے بیتے ہوئے زمانے میں انسانی روح کی گہرائیوں میں آشیانہ بنایا تھا یا یہ تغیرات کا مظہر ہیں یا آئندہ زمانے سے مربوط ہیں کہ جن کی فلم انسانی روح مخفی طریقے سے اپنے حساس کیمروں کے ذریعے بنا لیتی ہے یا پھر یہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں جن میں سے بعض کا تعلق گزشتہ سے ہے اور بعض کا آئندہ سے اور بعض ان آرزوں اور تمنائوں کا عکس ہیں کہ جو پوری نہیں ہوسکیں۔

متعدد آیات میں قرآن تصریح کرتا ہے کہ کم از کم کچھ خواب ایسے ہیں جو کہ مستقبل بعید یا مستقبل قریب کی عکاسی کرتے ہیں۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا مذکورہ بالا خواب اسی طرح اس سورہ کی آیہ ۳۶ میں مذکور قیدیوں کا خواب، نیز عزیز مصر کے خواب کا واقعہ آیہ ۴۳ میں ہے یہ مختلف خوابوں کے نمونے ہیں جو تمام تر مستقبل کے واقعات سے پردہ اٹھاتے ہیں، ان میں سے کوئی نسبتاً مستقبل بعید سے متعلق ہتے مثلاً حضرت ہوسف (علیہ السلام) کا خواب کہ جس کے بارے میں

کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس سال بعد صورت پذیر ہوا اور کوئی مستقبل قریب کے بارے میں بے مثلاً عزیز مصر کا خواب اور حضرت یوسف (علیہ السلام) کے ساتھی قیدیوں کا خواب کہ جو بہت جلد ہی وقوع پذیر ہو گئے۔ اس سورہ کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر تعبیردار خوابوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب کہ جس کی طرف سورہ فتح میں اشارہ ہوا ہے اور اسی طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا خواب جو سورہ صافات میں مذکور ہے (یہ خواب امر الہی بھی تھا اور اس کی تعبیر بھی تھی)۔ یہ بات جاذب نظر ہے کہ ایک روایت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے: الرؤیا ثلاثة بشری من الله وتحرین من الشیطان والذی یحدث بہ الانسان نفسه فیراہ فی منامہ۔ خواب تین قسم کے ہیں:

کبھی خدا کی طرف سے بشارت ہوتی ہے۔

کبھی شیطان کی طرف سے حزن و غم کا سامان ہوتا ہے اور

کبھی ایسے مسائل ہوتے ہیں جو انسانی فکر میں پلتے رہتے ہیں اور پھر وہ انہیں خواب میں دیکھتا ہے۔ (1)

واضح ہے کہ شیطانی خواب کچھ بھی نہیں ہیں کہ ان کی کوئی تعبیر ہو، البتہ رحمانی خواب کہ جو بشارت کا پہلو رکھتے ہیں یقیناً ایسے ہوتے ہیں کہ جو آئندہ کے کسی مسرت بخش واقعے سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

بہر حال ضروری ہے کہ ہم یہاں حقیقت خواب کے بارے میں مختلف نظریات کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کریں، حقیقت رؤیا کے بارے میں بہت سی تفسیرینکی گئی ہیں، شاید انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکے۔

۱۔ تفسیر مادی اور۔

۲۔ تفسیر روحانی۔

#### ۱ تفسیر مادی

مادیین کہتے ہیں کہ خواب کے چند علل و اسباب ہوسکتے ہیں:

(الف)۔ ہوسکتا ہے خواب انسان کے روزمرہ کے کاموں کا سیدھا نتیجہ ہو یعنی جو گزشتہ دنوں میں انسان کو پیش آتا ہے خواب کے وقت اس کی فکر کے سامنے وہ مجسم ہوجاتا ہے۔

(ب)۔ ہوسکتا ہے یہ وہ آرزوئیں ہوں جو پوری نہیں ہوئیں، جیسے پیاسا شخص خواب میں پانہ دیکھتا ہے اور جو شخص کسی کے سفر سے لوٹ آنے کے انتظار میں ہوتا ہے وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آگیا ہے۔

پرانے زمانے سے کہاوت ہے:

شتر در خواب بیند پنبہ دانہ! ...

اونٹ خواب میں بنولے دیکھتا ہے.....

(ج)۔ ہوسکتا ہے کسی چیز کے خوف کے سبب انسان اسے خواب میں دیکھے، کیونکہ بارہا تجربہ ہوا ہے کہ جو لوگ چور سے خوفزدہ ہوتے ہیں رات کو خواب میں چور دیکھتے ہیں، مشہور ضرب المثل ہے۔

دور از شتر بہ خواب و خواب آشفته نہ بین

اونٹ سے دور ہوکر سو جا تاکہ تو خواب پریشان نہ دیکھے۔

یہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

فرانڈ اور اس کے مکتب کے پیروکاروں نے خواب کے لئے ایک اور تفسیر مادی بیان کی ہے۔

وہ تفصیلی تمہیدات کے ساتھ اظہار کرتے ہیں کہ خواب نامراد و ناکام آرزوؤں کو پورا کرنے سے عبارت ہے کہ جو ہمیشہ تبدیل ہو کے ”میں“ کو فریب دینے کے لئے خود آگاہی کی منزل میں آتی ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ قبول کر لینے کے بعد نفس انسانی دو حصوں پر مشتمل ہے ایک حصہ آگاہ ہے (وہ کہ جو روز مرہ کے افکار، ارادی معلومات اور انسانی اختیارات سے مربوط ہے) دوسرا حصہ نا آگاہ ہے (وہ باطنی ضمیر میں تشنہ تمنائونکی شکل میں پنہاں ہے)، کہتے ہیں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری وہ خواہشیں جو ہم مختلف اسباب کی وجہ سے پوری نہیں کرسکتے اور ہمارے باطنی ضمیر میں جاگزیں ہیں وہ عالم خواب میں جب خود آگاہی کا سسٹم معطل ہوجاتا ہے تو اس طرح کی تخیلاتی تکمیل کے لئے خود آگاہ مرحلے کا رخ کرتی ہیں، کبھی وہ بغیر کسی تبدیلی کے منعکس ہوتی ہیں (یعنی عاشق اپنے اس محبوب کو عالم خواب میں دیکھتا ہے جو اس سے جدا ہوچکا ہے) اور کبھی اس کی شکل تبدیل ہوجاتی ہے اور وہ مناسب شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں، اس صورت میں خواب تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں۔

اس تفسیر کی بنا پر خوابوں کا تعلق ہمیشہ گزشتہ زمانے سے ہوتا ہے اور وہ کبھی بھی آئندہ کے بارے میں خبر نہیں دیتے

اور وہ صرف ضمیرِ نا آگاہ کے پڑھنے کا اچھا وسیلہ بن سکتے ہیں ، اسی بنا پر نفسیاتی بیماریوں کے علاج کے لئے اکثر بیمار کے خوابوں سے مدد لی جاتی ہے کیونکہ ان کا علاج ضمیرِ نا آگاہ کے ظاہر ہونے پر منحصر ہوتا ہے ۔  
غذا شناسی کے بعض ماہرین خواب اور بدن کی غذائی ضرورت کے درمیان رابطے کے قائل ہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ مثلاً اگر انسان خواب میں دیکھے کہ اس کے دانتوں سے خون نکل رہا ہے تو لازماً اس کے بدن میں وٹامن سی کی کمی ہے اور اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ وٹامن بی کی کمی میں گرفتار ہے ۔

## ۲۔ تفسیر روحانی

لیکن روحانی فلاسفر خوابوں کی ایک اور تفسیر کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ خواب چند قسم کے ہیں :  
الف۔ وہ خواب کہ جو انسان کی گزشتہ زندگی کی آرزوؤں سے مربوط ہیں اور انسان کے خوابوں کا ایک اہم حصہ انہیں سے مربوط ہوتا ہے ۔  
ب۔ وہ خواب کہ جو مفہوم سے عاری اور خیالی پریشاں ہوتے ہیں یہ تو ہمت کا نتیجہ ہوتے ہیں (اگرچہ ممکن ہے ان کے نفسیاتی اسباب بھی ہوں)  
ج۔ وہ خواب کے جو آئندہ سے مربوط ہیں اور مستقبل کے بارے میں گواہی دیتے ہیں ۔  
اس میں شک نہیں کہ جو خواب انسان کی گزشتہ زندگی سے مربوط ہیں اور وہ مناظر کے جو انسان کی اپنی طویل زندگی میں دیکھے ہوئے ان کی تصویر کشی کی کوئی خاص تعبیر نہیں ہے ۔  
اسی طرح خوابانے پریشاں کہ جو افکار پریشاں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور جنہیں اصطلاح میں ”اضغاث احلام“ کہا جاتا ہے ان افکار کی طرح ہیں کہ جن بخار اور ہزیان کی حالت میں پیدا ہوجاتے ہیں، زندگی کے آئندی مسائل کے بارے میں ان کی بھی کوئی خاص تعبیر نہیں ہوتی، اگرچہ روحانیات اور نفسیات کے ماہرین ان سے انسان کی ناآگاہ ضمیر کو سمجھنے کا کام لیتے ہیں اور ان سے آگاہی کو نفسیاتی بیماریوں کے علاج کی کلید سمجھتے ہیں، اس بنا پر ان کی تعبیر نفسیاتی اسرار اور بیماریوں کی تشخیص کے لئے ہے ناکہ زندگی کے آئندہ حوادث و واقعات کے لئے ۔  
باقی رہے وہ خواب کہ جو مستقبل سے مربوط ہیں انہیں بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔  
ایک قسم صریح اور واضح خوابوں کی ہے کہ جن کے لئے کسی قسم کی تعبیر کی ضرورت نہیں، بعض اوقات ایسے خواب مستقبل قریب یا بعید میں کسی معمولی فرق کے بغیر صورت پزیر ہوجاتے ہیں ۔  
دوسری قسم: آئندہ کے واقعات کی حکایت کرنے کے باوجود خاص ذہنی و روحانی عوامل کے زیر اثر جن کی شکل متغیر ہوجاتی ہے اور جو تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں ۔  
ان خوابوں کی ہر قسم کے لئے بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جن سب کا انکار نہیں کیا جاسکتا، نہ سرف مذہبی مصادر اور تاریخی کتب میں ان کی مثالیں مذکور ہیں بلکہ ہماری اپنی خاص زندگی میں یا ایسے افراد کی زندگی میں جنہیں ہم جانتے ہیں ان کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ انہیں پرگز اتفاقات کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا ۔  
.....

1۔ بحار الانوار، ج ۱۴، ص ۴۴۱، بعض علماء نے ان خوابوں میں ایک قسم کا اضافہ کیا ہے اور وہ ایسا خواب ہے جو انسان کے مزاج اور بدن کی کیفیت کا سیدھا نتیجہ ہو، اس کی طرف آئندہ مباحث میں اشارہ ہوگا ۔

## چند خواب

یہاں ہم چند ایسے خوابوں کے نمونے پیش کرتے ہیں کہ جنہوں نے عجیب انداز سے آئندہ کے واقعات سے پردہ اٹھایا ہے اور جنہیں ہم نے قابل اعتماد افراد سے سنا ہے ۔  
۱۔ ہمدان کے ایک مشہور اور کاملاً قابل وثوق عالم مرحوم اخوند ملا علی نے مرحوم آقا میرزا عبدالنبی سے کہ جو تہران کے بزرگ علماء میں سے تھے، اس طرح نقل کیا ہے :  
جب میں سامرا میں تھا تو مازندران سے مجھے ہر سال تقریباً تقریباً ایک سو تومان (1) بھیجے جاتے تھے اور اسی وجہ سے پہلے ضرورت پڑتی تو میں قرض لے لیتا اور اس رقم کے پہنچنے پر اپنے سارے قرض ادا کر دیتا ۔  
ایک سال مجھے خبر ملی کہ اس سال فصل کی حالت بہت خراب رہی ہے لہذا وہ رقم نہیں بھیجی جائے گی، میں بہت پریشان ہوا، اسی پریشانی کے عالم میں سو گیا، اچانک میں نے خواب میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا،

آپ نے مجھے پکار کر کہا: وہ الماری کھولو (ایک الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)، وہاں ایک سو تومان ہے وہ لے لو۔ میں خواب سے بیدار ہوا، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میرے دروازے پر دستک ہوئی، زوال کے بعد کی بات ہے، میں نے دیکھا کہ اہل تشیع کے عظیم مرجع تقلید مرحوم میزا شیرازی کا بھیجا ہوا قاصد ہے، وہ کہنے لگا: میرزا تمہیں بلا رہے ہیں۔

مجھے تعجب ہوا کہ اس وقت مجھے وہ مرد بزرگ کس لئے بلارہے ہیں، میں گیا تو دیکھا کہ وہ ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں (میں اپنا خواب بھول چکا تھا)، اچانک حضرت میرزا شیرازی نے کہا: میرزا عبدالنبی! اس الماری کا دروازہ کھولو اور اس میں ایک سو تومان ہیں اٹھالو۔ فوراً خواب کا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، اس واقعہ سے مجھے بہت تعجب ہوا، میں نے چاہا کچھ کہوں لیکن دیکھا کہ میرزا اس سلسلے میں کوئی بات کرنے کے لئے مائل نہیں ہیں میں وہ رقم لے کر باہر آگیا۔

۲۔ ایک قابل اعتماد دوست نقل کرتا ہے: کتاب ”ریحانۃ الادب“ کے، مولف مرحوم تبریزی کا ایک لڑکا تھا، اس کا دایاں ہاتھ خراب تھا (شاید اسے شدید رومانٹزم تھا) حالت یہ تھی کہ وہ مشکل سے قلم اٹھا سکتا تھا، طے پایا کہ وہ علاج کے لئے مغربی جرمنی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ میں جس بحری جہاز میں تھا اس میں خواب دیکھا کہ میری والدہ فوت ہو گئی ہیں۔ میں نے ڈائری کھولی اور یہ واقعہ دن اور وقت کے ساتھ لکھ لیا، کچھ عرصے کے بعد میں ایران واپس آیا، عزیزوں میں سے کچھ لوگ میرے استقبال کے لئے آئے، میں نے دیکھا کہ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھے ہیں تو مجھے تعجب ہوا، خواب کا واقعہ میرے ذہن سے بالکل اتر چکا تھا، آخر کار انہوں نے آہستہ آہستہ مجھے بتایا کہ میری والدہ فوت ہو گئیں ہیں۔

مجھے فوراً وہ خواب یاد آیا، میں نے ڈائری کھولی اور وفات کے دن کے بارے میں سوال کیا تو دیکھا کہ ٹھیک اسی روز میری والدہ فوت ہوئیں تھیں۔

۳۔ مشہور اسلامی مولف سید قطب اپنی تفسیر ”فی ظلال القرآن“ میں سورہ یوسف سے مربوط آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

تم نے خوابوں کے بارے میں جو تمام باتیں کہی ہیں اگر میں ان تمام کا انکار بھی کر دوں تو بھی میں اس واقعے کا انکار نہیں کر سکتا جو خود میری ساتھ پیش آیا کہ جب میں امریکا میں تھا، وہاں میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے بھانجے کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے اور وہ دیکھ نہیں سکتا میرا بھانجہ اس وقت میرے سب افراد خانہ کے ساتھ مصر میں تھا، میں اس واقعے پر پریشان ہوا میں نے فوراً گھر والوں کو مصر خط لکھ بھیجا اور اپنے بھانجے کی آنکھوں کے بارے میں خصوصیت سے سوال کیا۔

کچھ عرصے بعد میرے خط کا جواب آیا، اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اس کی آنکھوں سے داخلی طور پر خون رستا ہے اور وہ دیکھ نہیں سکتا اور اس وقت زیر علاج ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ داخلی طور پر اس کی آنکھوں سے خون اس طرح سے رستا تھا کہ عام مشاہدے سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا، صرف طبی آلات سے اسے دیکھنا ممکن تھا لیکن بہر حال وہ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو چکا تھا۔

بہر کیف میننے خواب میں یہاں تک کہ داخلی طور پر رسنے والے خون کو واضح طور پر دیکھا تھا۔ ایسا خواب کہ جن سے اسرار و رموز سے پردہ اٹھا ہے اور آئندہ سے مربوط حقائق یا حالات منکشف ہوئے ہیں بہت زیادہ ہیں، یہاں تک کہ دیر سے یقین کرنے والے افراد بھی ان کا انکار نہیں کر سکتے اور نہ انہیں محض اتفاق قرار دے سکتے ہیں۔

آپ اپنے قریبی دوستوں سے تحقیق کر کے عام طور پر ایسے خوابوں کی مثالیں معلوم کر سکتے ہیں جن کی تفسیر مادی حوالے سے ہرگز نہیں ہو سکتی اور صرف فلاسفہ کی روحانی تفسیر اور استقلالِ روح کے اعتقاد سے ان کی تعبیر ہو سکتی ہے۔

لہذا ایسے تمام خوابوں سے مجموعی طور پر ایک مستقل روح کی موجودگی کے شاید کے طور پر استفادی کیا جاسکتا ہے (2)۔

۲۔ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے تعبیر کیسے بتائی

زیربحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے ڈرانے کے علاوہ اجمالی طور خواب کی تعبیر بھی بیان کر دی، انہوں نے کہا کہ تُو برگزیدہ خدا ہوگا، خدا تجھے تعبیر خواب کا علم دے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور آل یعقوب پر تمام کرے گا۔

اس امر پر یوسف کے خواب کی دلالت کہ وہ آئندہ بلند روحانی و مادی مقامات پر فائز ہوں گے بالکل قابل فہم ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے حضرت یعقوب (علیہ السلام) کو یہ کیسے علم ہوا کہ آئندہ یوسف کو تعبیر خواب کا علم حاصل ہوگا، کیا یہ ایک اتفاقی خبر تھی جو حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو دی اور اس کا ان کے خواب سے کوئی تعلق نہ تھا یا یہ کہ انہوں نے یہ بات اسی خواب سے معلوم کی۔

ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے یہ بات حضرت یوسف (علیہ السلام) نے خواب ہی سے کشف کی اور ممکن ہے ایسا ان دومیں سے ایک طریقے سے ہوا ہو۔

پہلا، یہ کہ یوسف نے اس کم سنی کے باوجود خصوصی طور پر بھائیوں کی آنکھوں سے بچ کر اپنے باپ سے خواب بیان کیا (یہ بات اس سے معلوم ہوئی کہ والد نے انہیں وصیت کی کہ اسے چھپانے کی کوشش کریں) یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ یوسف بھی اپنے خواب سے ایک خاص احساس رکھتے تھے تبھی تو اسے کسی کے سامنے بیان نہیں کیا، یوسف جیسے ایک ننھے سے بچے میں ایسا احساس پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ تعبیر خواب کے علم کے لئے اس میں ایک روحانی صلاحیت موجود ہے، اس سے انہوں نے محسوس کیا کہ اس صلاحیت کی پرورش سے اس سلسلے میں وہ ایک وسیع علم حاصل کر لیں گے۔

دوسرا، یہ کہ عالم غیب سے انبیاء و رسل کا ارتباط مختلف ذرائع سے تھا، کبھی قلبی الہامات کے ذریعے کبھی فرشتہ وحی کے نزول کے ذریعے اور کبھی خواب کے ذریعے، حضرت یوسف (علیہ السلام) اگرچہ اس وقت تک ابھی مقام نبوت تک نہیں پہنچے تھے تاہم یوسف کے لئے ایسے معنی خیز خواب کا ہونا نشاندہی کرتا ہے کہ وہ آئندہ اس طریق سے عالم غیب سے ارتباط پیدا کریں گے لہذا فطرتاً انہیں خواب کی تعبیر اور مفہوم کو سمجھنا چاہئے تاکہ وہ عالم غیب سے اس قسم کا رابطہ رکھ سکیں۔

### ۳۔ رازداری کا سبق

ان آیات سے جہاں ہمیں بہت سے درس ملتے ہیں ایک درس رازداری ہے جو بعض اوقات بھائیوں تک سے اختیار کرنا پڑتی ہے، انسان کی زندگی میں ہمیشہ ایسے راز ہوتے ہیں جو اگر فاش ہو جائیں تو ہوسکتا ہے اس کا مستقبل یا معاشرے کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے۔

اس اسرار کی حفاظت کے بارے میں اپنے اوپر کنٹرول کرنا وسعتِ ظرف اور قوتِ ارادی کی ایک نشانی ہے، ایسے بہت سے افراد ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں کمزوری کی بنا پر اپنے انجام یا معاشرے کو خطرے میں ڈال دیا اور ایسی بہت سی پریشانیاں ہیں جو رازداری نہ رکھنے کی وجہ سے انسان کو پیش آتی ہیں۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا (علیہ السلام) سے منقول ہے:

لایکون المؤمن مومنا حتی تکون فیہ ثلاث خصال سنة من ربه وسنة من نبیہ وسنة من ولیہ فاما السنة من ربه فکتمان السر واما السنة من نبیہ فمدارة الناس واما السنة من ولیہ فالصبر فی البساء والضراء۔

مومن۔ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس میں تین خصلتیں نہ ہوں، ان میں سے ایک پروردگار کی سنت، ایک پیغمبر کی سنت ہے اور امام ولی کی سنت ہے:

خدا کی سنت رازوں کو چھپانا ہے۔

پیغمبر کی سنت لوگوں سے نرمی اور مدارات کرنا ہے، اور

امام کی سنت مصیبت اور پریشانیوں پر صبر کرنا ہے۔ (3)

(البتہ یہاں مراد زیادہ تر دوسروں کے رازوں کو چھپانا ہے)۔

ایک حدیث میں امام صادق (علیہ السلام) سے منقول ہے:

سرک من دمک فلا یجرین من غیرہ او اوداجک۔

تیرے اسرار اور راز تیرے خون کی طرح ہیں جنہیں صرف تیری ہی رگوں میں جاری ہونا چاہئے۔ (4)

1 تومانی ایرانی سکہ ہے (مترجم)

### تفسیر نمونہ جلد 09

۷ لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِلْسَّائِلِينَ۔  
۸ اِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنَ الْعُصْبَةِ إِنَّ آبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔  
۹ أَفْتُلُوا يُوسُفَ أَوْ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ۔  
۱۰ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَقْوَاهُ فِي غِيَابَةِ الْجَبِّ يَلْتَقِطُهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ۔

ترجمہ

- ۷- یوسف اور ان کے بھائیوں (کے واقعے) میں سوال کرنے والوں کے لئے (ہدایت کی) نشانیاں تھیں ۔  
۸- جس وقت کہ (بھائیوں نے) کہا: یوسف اور اس کا بھائی (بنیامین) باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم زیادہ طاقتور ہیں، یقیناً ہمارا باپ کھلی گمراہی میں ہے ۔  
۹- یوسف کو قتل کر دو یا اسے دور دراز کی زمین میں پھینک دو تاکہ باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو اور اس کے بعد (اپنے گناہ سے توبہ کر لینا اور) نیک بن جانا ۔  
۱۰- ان میں سے ایک نے کہا: یوسف کو قتل نہ کرو اور اگر کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو اسے کسی اندھے کنویں میں پھینک دو تاکہ قافلوں میں سے کوئی اسے اٹھا لیں (اور اسے اپنے ساتھ کسی دور کے مقام پر لے جائیں) ۔

بھائیوں کی سازش

یہاں سے یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں کی یوسف (علیہ السلام) کی خلاف سازش شروع ہوتی ہے، پہلی آیت میں ان بہت سے اصلاحی دروس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس داستان میں موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے: یقیناً یوسف اور اس کے بھائیوں (کی داستان میں سوال کرنے والوں کے لئے نشانیاں تھیں) لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِلْسَّائِلِينَ) ۔  
اس بارے میں کہ ان سوال کرنے والوں سے کون سے اشخاص مراد ہیں، بعض مفسرین (مثلاً قرطبی نے تفسیر جامع میں اور دوسرے حضرات نے) کہا ہے کہ یہ سوال کرنے والے مدینہ کے یہودیوں کی ایک جماعت تھی جو اس سلسلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف سوالات کیا کرتے تھے لیکن ظاہری طور پر آیت مطلق ہے اور کہتی ہے کہ اس واقعے میں تمام جستجو کرنے والوں کے لئے آیات، نشانیاں اور دروس چھپے ہوئے ہیں ۔  
اس سے بڑھ کر کیا درس ہوگا کہ چند طاقتور افراد ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہ جس کا سرچشمہ حسد تھا ظاہراً ایک کمزور اور تنہا شخص نابود کرنے کے لئے اپنی تمام تر کوشش صرف کرتے ہیں مگر اسی کام سے انہیں خبر نہیں ہوتی کہ وہ اسے ایک حکومت کے تخت پر بٹھا رہے ہیں اور ایک وسیع مملکت کا فرمان روا بنا رہے ہیں اور آخر کار وہ سب اس کے سامنے سر تعظیم و تسلیم خم کرتے ہیں، یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ جب خدا کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اتنی طاقت رکھتا ہے کہ اس کام کو اس کے مخالفین کے ہاتھوں پایہ تکمیل تک پہنچا دے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ایک پاک اور صاحب ایمان انسان اکیلا نہیں ہے اور اگر سارا جہان اس کی نابودی پر کمر باندھ لے لیکن خدا نہ چاہے تو کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا ۔

حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے بارہ بیٹے تھے، ان میں یوسف (علیہ السلام) اور بنیامین ایک ماں سے تھے، ان کی والدہ کا نام راحیل تھا، یعقوب (علیہ السلام) ان دونوں بیٹوں سے خصوصاً یوسف (علیہ السلام) سے زیادہ محبت کرتے تھے کیونکہ ایک تو یہ ان کے چھوٹے بیٹے تھے لہذا فطرتاً زیادہ توجہ اور محبت کے محتاج تھے اور دوسرا ان کی والدہ

(راحیل) فوت ہو چکی تھیں اس بنا پر بھی انہیں زیادہ محبت کی ضرورت تھی علاوہ ازیں خصوصیت کے ساتھ حضرت یوسف (علیہ السلام) میں نابغہ اور غیر معمولی شخصیت ہونے کے آثار نمایاں تھے، مجموعی طور پر ان سب باتوں کی بنا پر حجرت یعقوب (علیہ السلام) واضح طور پر ان سے زیادہ پیار محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

حاسدبھائیوں کی توجہ ان پہلوؤں کی طرف نہیں تھی اور وہ اس پر بہت ناراحت اور ناراض تھے، خصوصاً شاید ماؤں کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے بھی فطرتاً ان میں رقابت موجود تھی لہذا وہ اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے کہ یوسف اور اس کے بھائی کو باپ ہم سے زیادہ پیار کرتا ہے حالانکہ ہم طاقتور اور مفید لوگ ہیں اور باپ کے امور کو بہتر طور پر چلا سکتے ہیں، اس لئے اسے ان چھوٹے بچوں کی نسبت ہم سے زیادہ محبت کرنا چاہئے جب کہ ان سے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا (اِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنَ الرَّحْمَنِ وَعَصْبَةٌ) - (۱)

اس طرح یکطرفہ فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے باپ کے خلاف کہا کہ ہمارا باپ واضح گمراہی میں ہے (إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ)۔

حسد اور کینے کہ آگ نے انہیں اجازت نہ دی کہ وہ معاملے کے تمام اطراف پر غور و فکر کرتے اور ان دو بچوں سے اظہار محبت پر باپ کے دلائل معلوم کرتے کیونکہ ہمیشہ ذاتی مفادات ہر شخص کی فکر پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور اسے یکطرفہ فیصلوں پر ابھارتے ہیں کہ جن کا نتیجہ حق و عدالت کے راستے سے گمراہی ہے۔

البتہ ان کی مراد دین و مذہب کے اعتبار سے گمراہی نہ تھی بلکہ بعد میں آنے والی آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ اپنے باپ کی عظمت اور نبوت پر ان کا عقیدہ تھا اور انہیں صرف ان کے طرز معاشرت پر اعتراض تھا۔

بغض، حسد اور کینے کے جذبات نے آخر کار بھائیوں کو ایک منصوبہ بنانے پر آمادہ کیا، وہ ایک جگہ جمع ہوئے اور دو تجاویز ان کے سامنے تھیں کہنے لگے: یوسف کو قتل کر دو یا اسے دور دراز کے کسی علاقے میں پھنک دو تاکہ باپ کی محبت کا پورا رخ تمہاری طرف ہو جائے ( اَقْتُلُوا يُوسُفَ أَوْ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ)۔

ٹھیک ہے کہ تمہیں اس کام پر احساس گناہ ہوگا اور وجدان کی مذمت ہوگی کیونکہ اپنے چھوٹے بھائی پر یہ ظلم کروگے لیکن اس گناہ کی تلافی ممکن ہے، توبہ کر لینا اور اس کے بعد صالح جمعیت بن جانا ( وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ)۔

اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی مراد یہ تھی کہ یوسف (علیہ السلام) کو باپ کی آنکھوں سے دور کرنے کے بعد ان کے ساتھ تمہارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا اور اس طرف سے تمہیں جو پریشانی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔

ان میں سے پہلی تفسیر صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس عمل کے بارے میں انہیں احساس گناہ تھا اور اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ تھوڑا سا خوف خدا رکھتے تھے، اسی بنا پر وہ یہ گناہ انجام دینے کے بعد توبہ تجویز کر رہے تھے لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ انجام جرم سے پہلے توبہ کے بارے میں گفتگو کرنا درحقیقت وجدان کو دھوکا دینے کے مترادف ہے اور گناہ کے لئے راستہ ہموار کرنے کے لئے ہے اور بات کسی طرح بھی پشیمانی اور ندامت کی دلیل نہیں بنتی۔

دوسرے لفظوں میں حقیقی توبہ یہ ہے کہ گناہ کے بعد انسان میں ندامت اور شرمندگی کی حالت پیدا ہو جائے لیکن گناہ سے پہلے توبہ کے بارے میں گفتگو کرنا توبہ نہیں ہے۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان جب گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ضمیر کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا مذہبی اعتقادات اس کے سامنے بندباندھ دیتے ہیں اور گناہ کی طرف قدم اٹھانے سے روکتے ہیں، اس موقع پر وہ شخص اس بند سے گزرنے کے لئے اور گناہ کی طرف راستہ ہموار کرنے کے لئے اپنے ضمیر اور مذہب کو دھوکا دیتا ہے کہ میں گناہ کر لینے کے فوراً بعد اس کی تلافی کر لوں گا، ایسا نہیں ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں گا، میں توبہ کر لوں گا، بارگاہ الہی میں حاضر ہوں گا، نیک عمل بجالاؤں گا اور آخر کار آثار گناہ دھو ڈالوں گا، یعنی جس طرح انجام گناہ کے لئے ایک شیطانی منصوبہ بناتا ہے ضمیر کو دھوکا دینے اور مذہبی عقائد پر مسلط ہونے کے لئے بھی ایک شیطانی منصوبہ بناتا ہے اور اکثر اوقات یہ شیطانی منصوبہ بھی بیت موثر ثابت ہوتا ہے اور اس محکم دیوار کو اس ذریعے سے اپنے راستے سے ہٹا دیتا ہے، حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ یوسف کو راستے سے ہٹا لینے کے بعد باپ کی توجہ اور نگاہ تمہاری طرف ہو جائے گی ( يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ)، یہ نہیں کہا کہ باپ کا دل تمہاری طرف مائل ہو جائے گا ( يَخْلُ لَكُمْ قَلْبٌ)، کیونکہ انہیں اطمینان نہیں تھا کہ باپ اتنی جلدی اپنے بیٹے یوسف کو بھول جائے گا، یہی کافی ہے کہ باپ کی ظاہری توجہ ان کی طرف ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اگر باپ کا رخ اور نظر مائل ہو جائے تو یہ دل کے مائل ہونے کی بنیاد بن جائے گا، جب باپ کی نظر



ان کی طرف ہوئی تو آہستہ آہستہ دل بھی ہو جائے گا۔ لیکن بھائیوں میں سے ایک بہت سمجھدار تھا یا اس کا ضمیر نسبتاً زیادہ بیدار تھا اسی لئے اس نے یوسف کو قتل کرنے کے منصوبے کی مخالفت کی اور اسی طرح کسی دور دراز علاقے میں پھنک آنے کی تجویز کی بھی، کیونکہ ان منصوبے میں یوسف (علیہ السلام) کی ہلاکت کا خطرہ تھا، اس نے ایک تیسرا منصوبہ پیش کیا، وہ کہنے لگا: اگر تمہیں ایسا کام کرنے پر اصرار ہی ہے تو یوسف (علیہ السلام) کو قتل نہ کرو بلکہ اسے کسی کنویں میں پھینک دو (اس طرح سے کہ وہ زندہ رہے) تاکہ راہ گزاروں کے کسی قافلے کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اس طرح یہ ہماری اور باپ کی آنکھوں سے دور ہو جائے (قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَالْقَوْهَ فِي غِيَابَةِ الْجُبِّ يَلْتَقِطُهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ)۔

۱۔ ”عصبہ“ ایسی جماعت اور گروہ کے معنی میں ہے کہ جس کے افراد باہم شریک کار ہوں اور کسی کام کی انجام دہی میں ہم آہنگ ہوں، یہ لفظ جمع کا معنی دیتا ہے اور اس کا مفرد نہیں ہے۔

چند نکات

۱۔ ”غیابات الجب“ کا مفہوم:

”جب“ اس کنویں کو کہتے ہیں جسے پتھروں سے چُنا گیا ہو، شاید زیادتر بیابانی کنویں اسی قسم کے ہوتے ہیں اور ”غیابت“ کنویں میں پوشیدہ جگہ کو کہتے ہیں کہ جونگاہوں سے غیب اور اوجھل ہو، یہ تعبیر گویا اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ جو معمولاً بیابانی کنوؤں میں ہوتی ہے اور وہ یہ کہ کنویں کی تہ میں پانی کی سطح کے قریب، کنویں کی دیوار میں طاقچہ کی صورت میں ایک چھوٹی سی جگہ بنا دیتے ہیں تاکہ اگر کوئی کنویں کی تہ میں جائے تو اس پر بیٹھ سکے اور جو برتن اپنے ساتھ لے جائے، خود پانی میں جائے بغیر اسے بھر لے، ظاہر ہے کہ اگر کنویں کے اوپر سے دیکھا جائے تو یہ جگہ صحیح طور پر نظر نہیں آتی، اسی بنا پر اسے ”غیابات“ کہا گیا ہے۔ (1)

ہمارے ہاں بھی اس قسم کے کنویں پائے جاتے ہیں۔

۲۔ اس تجویز کا مقصد:

اس میں شک نہیں کہ یہ تجویز پیش کرنے والے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ یوسف (علیہ السلام) کو کنویں میں اس طرح پھینکا جائے کہ وہ ختم ہو جائے بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ کنویں کے پنہاں مقام پر رہے تاکہ صحیح وسالم قافلوں کے ہاتھ لگ جائے۔

۳۔ ”ان کنتم فاعلین“ کا مطلب:

اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہنے والے نے حتیٰ یہ تجویز بھی ایک قطعی اور فیصلہ کن بات کے طور پر پیش نہیں کی شاید وہ ترجیح دیتا تھا کہ یوسف کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے۔

۴۔ کنویں والی تجویز کس نے پیش کی:

کنویں والی تجویز پیش کرنے والے کا نام کیا تھا، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس کا نام ”روبین“ تھا کہ جو ان سب سے زیادہ سمجھدار شمار ہوتا تھا، بعض نے ”یہودا“ کا نام لیا ہے اور بعض نے ”لاوی“ کا ذکر کیا ہے۔

۵۔ انسانی زندگی میں حسد کے تباہ کن اثرات:

ایک اور اہم درس جو ہم اس واقعے سے سیکھتے ہیں یہ ہے کہ کس طرح حسد انسان کو بھائی کے قتل یا اس سے بھی زیادہ سخت تکلیف دہ مقام تک لے جاتا ہے اور اگر اس اندرونی آگ پر قابو نہ پایا جائے تو یہ کس طرح دوسروں کو بھی آگ میں دھکیل دیتی ہے اور کد حسد کرنے والے کو بھی۔

اصولاً جب کوئی نعمت کسی دوسرے کو میسر آتی ہے اور خود انسان اس سے محروم رہ جاتا ہے تو اس میں چار مختلف حالتیں پیدا ہوتی ہیں:

پہلی یہ کہ وہ آرزو کرتا ہے کہ جس طرح یہ نعمت دوسروں کو حاصل ہے مجھے بھی ہو، اس حالت کو ”غبطہ“ (رشک)

کہتے ہیں اور قابلِ تعریف حالت ہے کیونکہ یہ انسان کو ایسی اصلاحی کوشش کی طرف ابھارتی ہے اور معاشرے پر کوئی برا اثر مرتب نہیں کرتی۔

دوسری یہ کہ وہ خواہش کرتا ہے کہ یہ نعمت دوسروں سے چھن جائے اور وہ اس مقصد کے لئے کوشش کرنے لگتا ہے، یہی وہ تنہائی مضموم حالت ہے جسے ”حسد“ کہتے ہیں، یہ حالت انسان کو دوسروں کے خلاف غلط کوشش پر ابھارتی ہے اور خود اپنے بارے میں کسی اصلاحی کوشش پر آمادہ نہیں کرتی۔

تیسری یہ کہ وہ تمنا کرے کہ خود یہ نعمت حاصل کر لے اور دوسرے اس سے محروم رہ جائیں، اسی حالت کو ”بخل“ اور اجارہ داری کہتے ہیں یعنی ہر چیز انسان اپنے لئے چاہے اور دوسروں کی اس سے محرومیت پر لذت محسوس کرے۔ چوتھی یہ کہ وہ چاہے کہ دوسرا اس نعمت میں رہے اگرچہ وہ خود مہرومیت میں زندگی بسر کرے، یہاں تک کہ وہ اس پر بھی تیار ہو کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ بھی دوسروں کو دے دے اور اپنے مفادات سے صرف نظر کرے اس بالاوبرتر حالت کو ”ایثار“ کہتے ہیں کہ جو اہم ترین اور بلند انسانی صفات میں سے ہے۔

بہر حال حسد نے صرف بردرانِ یودف کو اپنے بھائی کے قتل کی سرحد تک نہیں پہنچایا بلکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حسد انسان کو خود اس کی اپنی نابودی پر بھی ابھارتا ہے اسی بنا پر اسلامی احادیث میں اس گھٹیا صفت کے خلاف جہاد کے لئے بلا دینے والی تعبیرات دکھائی دیتی ہیں، نمونے کے طور پر ہم یہاں چند ایک احادیث نقل کرتے ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

خدا نے موسیٰ بن عمران کو حسد سے منع کیا اور ان سے فرمایا:

ان الحاسد ساخط لنعمی صاقل لقسمی الذی قسمت بین عبادی ومن یک کذلک فلسنت منہ ولیس منی

یعنی۔ حسد کرنے والا میرے بندوں کو ملنے والی نعمتوں پر ناخوش رہتا ہے اور اپنے بندوں میں جو کچھ میں نے تقسیم کیا ہے اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے، جو شخص ایسا ہو نہ وہ مجھ سے ہے اور نہ میں اس سے ہوں۔ (2)

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

آفة الدین الحسد والعجب والفخر۔

دین کے لئے تین چیزیں آفت اور مصیبت ہیں حسد، خود پسندی اور غرور۔

ایک اور حدیث میں اسی امام (علیہ السلام) سے منقول ہے:

ان المومن یغبط ولا یحسد، والمناقق یحسد ولا یغبط

اہل ایمان رشک کرتے ہیں حسد نہیں کرتے لیکن منافق حسد کرتے ہیں رشک نہیں کرتے۔ (3)

۶۔ ماں باپ کے لئے ایک سبق:

اس واقعے کے اس حصے سے یہ درس بھی لیا جاسکتا ہے کہ ماں باپ کو اولاد سے اظہارِ محبت میں بہت زیادہ غور و خوض کرنا چاہیئے، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے اس معاملے میں کسی خطا کا ارتکاب نہیں کیا تھا اور وہ حضرت یوسف (علیہ السلام) اور ان کے بھائی بنیامین سے جو اظہارِ محبت کرتے تھے وہ کسی اصول اور وجہ کے تحت تھا اور جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں تاہم یہ ماجرا نشاندہی کرتا ہے کہ ضروری ہے کہ اس مسئلے میں انسان بہت حساس ہو اور اس پہلو کو سختی سے ملحوظ رکھے کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بیٹے سے اظہارِ محبت دوسرے بیٹے کے دل میں ایسے جذبات پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ہر کام کر گزرنے پر تیار ہوجاتا ہے، اس طرح وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی اپنی شخصیت درہم برہم ہو گئی ہے اور پھر وہ اپنے بھائی کی شخصیت کو نقصان پہنچانے کے لئے کسی حد کو خاطر میں نہیں لاتا، یہاں تک کہ اگر وہ خود کسی رد عمل کا مظاہرہ نہ کر سکے تو اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے اور بعض اوقات نفسیاتی بیماری کا شکار ہوجاتا ہے۔

ایک واقعہ مجھے نہیں بھولنا کہ میرے ایک دوست کا چھوٹا بچہ بیمار تھا، فطری طور پر اسے زیادہ محبت کی ضرورت تھی، باپ نے بڑے بیٹے کو اس کی خدمت پر لگا دیا، تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ بڑا بیٹا ایک ایسی نفسیاتی بیماری میں گرفتار ہو گیا کہ جس کی شناخت نہیں ہوتی تھی، میں نے اس عزیز دوست سے کہا کہ اس کی وجہ اظہارِ محبت میں عدم عدالت ہی نہ ہو؟ وہ میری اس بات کا یقین نہیں کرتا تھا، وہ ایک ماہرِ نفسیات کے طبیب کے پاس گیا، طبیب نے کہا کہ تمہارے بیٹے کو کوئی خاص بیماری نہیں ہے اس بیماری کی وجہ یہ ہے کہ وہ محبت کی کمی کے مسئلے میں گرفتار ہے اور اس کی شخصیت پر ضرب لگی ہے جب کہ اس کے چھوٹے بھائی کو یہ تمام محبت حاصل ہوئی ہے۔

اسی لئے اسلامی احادیث میں ہے کہ:

ایک روز امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

بعض اوقات میں اپنے کسی بچے سے اظہارِ محبت کرتا ہوں ، اسے اپنے زانو پر بٹھاتا ہوں، اسے بکری کی دستی دیتا ہوں اور اس کے منہ میں چینی ڈالتا ہوں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ حق دوسرے کا ہے لیکن پھر بھی یہ کام اس لئے کرتا ہوں تاکہ وہ میرے دوسرے بچوں کے خلاف نہ ہو جائے اور جیسے برادرانِ یوسف نے ہوسف کے ساتھ کیا وہ اس طرح نہ کرے (4) -

1. تفسیر المنار سے اقتباس، مذکورہ آیت کے ذیل میں ۔  
 2. اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۷۔  
 3. اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۷۔  
 4. بحار، ج ۴، ص ۷۸۔

### تفسیر نمونہ جلد 09

۱۱ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ۔  
 ۱۲ أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبُ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔  
 ۱۳ قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَضْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذَّنْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ۔  
 ۱۴ قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذَّنْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَخَاسِرُونَ۔

ترجمہ

- ۱۱۔ (یوسف کے بھائی باپ کے پاس آئے اور ) کہنے لگے: ابا جان! تم (ہمارے بھائی) یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان کیوں نہیں کرتے حالانکہ کہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں ۔  
 ۱۲۔ اسے کل ہمارے ساتھ (شہر سے باہر) بھیج دو تاکہ خوب کھائے پئے، کھیلے کودے اور سیر و تفریح کرے اور ہم اس کے محافظ ہیں ۔  
 ۱۳۔ باپ نے کہا: اس کے دور ہونے سے میں غمگین ہوں گا اور مجھے ڈر ہے کہ اسے بھیڑیا نہ کھاجائے اور تم اس سے غافل رہو۔  
 ۱۴۔ انہوں نے کہا: اگر اسے بھیڑیا کھاجائے، جب کہ ہم طاقتور گروہ ہیں، تو ہم زیا کاروں میں سے ہوں (اور ہرگز ایسا ممکن نہیں ہے)

منحوس سازش

یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے جب یوسف کو کنوئیں میں ڈالنے کی آخری سازش پر اتفاق کر لیا تو یہ سوچنے لگے کہ یوسف (علیہ السلام) کو کس طرح لے کر جائیں لہذا اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک اور منصوبہ تیار کیا، اس کے لئے وہ باپ کے پاس آئے اور اپنے حق جتانے کے انداز میں، نرم و نازل لہجے میں محبت بھرے شکوے کی صورت میں کہنے لگے: ابا جان! آپ یوسف کو کیوں کبھی اپنے سے جدا نہیں کرتے اور ہمارے سپرد نہیں کرتے، آپ ہمیں بھائی کے بارے میں امین کیوں نہیں سمجھتے حالانکہ ہم یقیناً اس کے خیر خواہ ہیں (قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ)۔ آئے! جس کا آپ متہم سمجھتے ہیں اسے جانے دیجئے، علاوہ ازیں ہمارا بھائی نو عمر ہے، اس کا بھی حق ہے، اسے بھی شہر سے باہر کی آزاد فضا میں گھومنے پھرنے کی ضرورت ہے، اسے گھر کے اندر قید کر دینا درست نہیں، کل اسے ہمارے ساتھ بھیجنے تاکہ یہ شہر سے باہر نکلے، چلے پھرے، درختوں کے پھل کھائے، کھیلے کودے اور سیر و تفریح کرے (أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبُ)۔ (۱)

اور اگر آپ کو اس کی سلامتی کا خیال ہے اور پریشانی ہے تو ”ہم سب اپنے بھائی کے محافظ و نگہبان ہوں گے“ کیونکہ آخر یہ ہمارا بھائی اور ہماری جان کے برابر ہے (وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ)۔

اس طرح انہوں نے بھائی کو باپ سے جدا کرنے کا بڑا ماہرانہ منصوبہ تیار کیا، ہو سکتا ہے انہوں نے یہ باتیں یوسف (علیہ السلام) کے سامنے کی ہوں تاکہ وہ بھی باپ سے تقاضا کریں اور ان سے صحرا کی طرف جانے کی اجازت لے لیں۔ اس منصوبے میں ایک طرف باپ کے لئے انہوں نے باپ کے لئے یہ مشکل پیدا کر دی تھی کہ اگر وہ یوسف کو ہمارے سپرد نہیں کرتا تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہمیں متہم سمجھتا ہے اور دوسری طرف کھیل کود اور سیر و تفریح کے لئے شہر سے باہر جانے کی یوسف (علیہ السلام) کے لئے تحریک تھی۔

جی ہاں! جو لوگ غفلت میں ضرب لگانا چاہتے ہیں ان کے منصوبے ایسے ہی ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے تمام نفسیاتی اور جذباتی پہلوؤں سے کام لیتے ہیں لیکن صاحبانِ ایمان افراد کو ”المومن کیس“ (مومن ہوشیار ہوتا ہے) کے مصداق ایسے خوبصورت ظواہر سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے اگرچہ ایسی سازش بھائی کی سے کیوں نہ ہو۔

حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے برادرانِ یوسف کی باتوں کے جواب میں بجائے اس کے کہ انہیں بُرے ارادے کا دیتے کہنے لگے میں تمہارے ساتھ یوسف کو بھیجنے پر تیار نہیں ہوں تو اس کی دو وجوہ ہیں:

پہلی یہ کہ یوسف کی جدائی میرے لئے غم انگیز ہے (قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ)۔ اور دوسری یہ کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے ارد گرد کے بیابانوں میں خونخوار بھیڑے ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ مبادا کوئی بھیڑیا میرے فرزندِ دلہند کو کھاجائے اور تم اپنے کھیل کود، سیر و تفریح اور دوسرے کاموں میں مشغول ہوں، (وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الدَّيْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ)۔

یہ بالکل فطری امر تھا کہ اس سفر میں بھائی اپنے آپ میں مشغول ہوں اور اپنے چھوٹے بھائی سے غافل ہوں اور بھیڑیوں سے بھرے اس بیابان میں کوئی بھیڑیا یوسف کو آئے، البتہ بھائیوں کے پاس باپ کی پہلی دلیل کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ یوسف کی جدائی کا غم ایسی چیز نہ تھی کہ جس کی وہ تلافی کر سکتے بلکہ شاید اس بات نے بھائیوں کے دل میں حسد کی آگ کو اور بھڑدیا ہو۔

دوسری طرف بیٹے کو باہر لے جانے کے بارے میں باپ کی دلیل کا جواب تھا کہ جس کے ذکر کی چندان ضرورت نہ تھی اور وہ یہ کہ آخر کار بیٹے کو نشوونما اور تربیت کے لئے چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے باپ سے جدا ہونا ہے اور اگر وہ نورستہ کے پودے کی طرح ہمیشہ باپ کے زیرِ سایہ رہے تو نشوونما نہیں پاسکے گا اور بیٹے کے تکامل اور ارتقاء کے لئے باپ مجبور ہے کہ یہ جدائی برداشت کرے، آج کھیل کود ہے کل تحصیلِ علم و دانش ہے، پرسوں زندگی کے لئے کسب وکار اور سعی و کوشش ہے، آخر کار جدائی ضروری ہے۔

لہذا اصلاً انہوں نے اس کا جواب نہیں دیا بلکہ دوسری دلیل کا جواب شروع کیا کہ جو ان کی نگاہ میں اہم اور بنیادی تھی ”کہنے لگے: کیسے ممکن ہے ہمارے بھائی کو بھیڑیا کھاجائے حالانکہ ہم طاقتور گروہ ہیں، اگر ایسا ہو جائے تو ہم زیا کاروبد بخت ہونگے“ (قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الدَّيْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَّخَاسِرُونَ)۔

یعنی کیا ہم مُردہ ہیں کہ بیٹھ جائیں اور دیکھتے رہیں گے اور بھیڑیا ہمارے بھائی کو کھاجائے گا، بھائی کو بھائی سے جو تعلق ہوتا ہے اس کے علاوہ جو بات اس کی حفاظت پر ہمیں ابھارتی ہے یہ ہے کہ ہماری لوگوں میں عزت و آبرو ہے، لوگ ہمارے متعلق کیا کہیں گے، یہی ناکہ طاقتور موٹی گردنوں والے بیٹھے رہے اور اپنے بھائی پر بھیڑے کو حملہ کرتے دیکھتے رہے، کیا پھر ہم لوگوں میں جینے کے قابل رہیں گے۔

انہوں نے ضمناً باپ کی اس بات کا بھی جواب دیا کہ ہو سکتا ہے تم کھیل کود میں لگ جاؤ اور یوسف سے غافل ہو جاؤ اور وہ یہ کہ یہ مسئلہ گویا ساری دولت اور عزت و آبرو کے ضائع ہونے کا ہے ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ کھیل کود ہمیں غافل کر دے کیونکہ اس صورت میں ہم لوگ بے وقعت ہو جائیں گے اور ہماری کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔

یہاں سوال سامنے آتا ہے کہ تمام خطرات میں سے حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے صرف بھیڑے کے حملے کے خطرے کی نشاندہی کیوں کی تھی۔

بعض کہتے ہیں کہ کنعان کا بیابان بھیڑیوں کا مرکز تھا، اس لئے زیادہ خطرہ اسی طرف سے محسوس ہوتا تھا۔ بعض دیگر کہتے ہیں کہ یہ ایک خواب کی وجہ سے تھا کہ جو حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے پہلے دیکھا تھا کہ بھیڑیوں نے ان کے بیٹے یوسف پر حملہ کر دیا ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے کنائے کی زبان میں بات کی تھی اور ان کی نظر بھیڑیا صفت انسانوں کی طرف تھی، جیسے یوسف کے بعض بھائی تھے۔

بہر حال انہوں نے بہت حلیے کے لیے، خصوصاً حضرت یوسف (علیہ السلام) کے معصوم جذبات کو تحریک کی اور انہیں شوق دلایا کہ وہ شہر سے باہر تفریح کے لیے جائیں اور شاید یہ ان کے لیے پہلا موقع تھا کہ وہ باپ کو اس کے لیے راضی کریں اور بہر صورت اس کام کے لیے ان کی رضامندی حاصل کریں۔

.....

۱۔ ”برتع“ ”رتع“ (بروزن ”قطع“) کے مادہ سے دراصل جانوروں کے چرنے اور خوب کھانے کے معنی میں ہے لیکن کبھی انسان کے لیے تفریح کرنے اور کوب کھانے پینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

رُسُوا كُنْ جُھوٹ

آخر کار بھائی کامیاب ہو گئے، انہوں نے باپ کو راضی کر لیا کہ وہ یوسف (علیہ السلام) کو ان کے ساتھ بھیج دے، وہ رات انہوں نے اس خوش خیالی میں گزاری کہ کل یوسف کے بارے میں ان کا منصوبہ عملی شکل اختیار کرے گا اور راستے کی رکاوٹ اس بھائی کو ہم ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا دیں گے، پریشانی انہیں صرف یہ تھی کہ باپ پشیمان نہ ہو اور اپنی بات واپس نہ لے لے۔

صبح سویرے وہ باپ کے پاس گئے اور یوسف کی حفاظت کے بارے میں باپ نے ہدایت دہرائیں، انہوں نے بھی اظہارِ اطاعت کیا، باپ کے سامنے اسے بڑی محبت و احترام سے اٹھایا اور چل پڑے۔ کہتے ہیں کہ شہر کے دروازے تک باپ ان کے ساتھ آئے اور آخری دفعہ یوسف کو ان سے لے کر اپنے سینے سے لگایا، آنسو ان کی آنکھوں سے برس رہے تھے، پھر بھی یوسف کو ان کے سپرد کر کے ان سے جدا ہو گئے لیکن حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی آنکھیں اسی طرح بیٹوں کے پیچھے تھیں، جہاں تک باپ کی آنکھیں کام کرتی تھیں وہ بھی یوسف (علیہ السلام) پر نوازش اور محبت کرتے رہے لیکن جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ اَطُوبُ باپ انہیں نہیں دیکھ سکتا تو اچانک انہوں نے آنکھیں پھیر لیں، سالہاسال سے حسد کی وجہ سے جو ان کے اندر تہ بہ تہ بغض و کینہ موجود تھا وہ حضرت یوسف (علیہ السلام) پر نکلنے لگا، ہر طرف سے اسے مارنے لگے، وہ ایک سے بچ کر دوسرے سے پناہ لیتے لیکن کوئی انہیں پناہ نہیں دیتا۔

ایک روایت میں ہے کہ اس طوفانِ بلا میں حضرت یوسف (علیہ السلام) آنسو بہا رہے تھے اور جب وہ انہیں کنوئیں میں پھینکنے لگے تو اچانک حضرت یوسف (علیہ السلام) بنسنے لگے، بھائیوں کو بہت تعجب ہوا ہے کہ یہ بنسنے کو کونسا مقام ہے، گویا یوسف (علیہ السلام) نے اس مسئلے کو مذاق سمجھا ہے اور بات سے بے خبر ہے کہ سیاہ وقت اور بدبختی اس کے انتظار میں ہے لیکن یوسف (علیہ السلام) نے اس بنسنے کے مقصد سے پردہ اٹھایا اور سب کو عظیم درس دیا، وہ کہنے لگے:

مجھے نہیں بھولتا کہ ایک دن تم طاقتور بھائیوں، تمہارے قوی بازوؤں اور بہت زیادہ جسمانی طاقت پر میں نے نظر ڈالی تو میں بہت خوش ہوا اور میں نے اپنے آپ سے کہا کہ جس کے اتنے دوست اور مددگار ہوں اسے سخت حادثہ کا کیا غم ہے، اس دن میں نے تم پر بھروسہ کیا اور تمہارے بازوؤں پر دل باندھا، اب تمہارے چنگل میں گرفتار ہوں اور تم سے بچ کر تمہاری طرف پناہ لیتا ہوں اور تم مجھے پناہ نہیں دیتے، خدا نے تمہیں مجھ پر مسلط کیا ہے تاکہ میں یہ درس سیکھ لوں کہ اس کے غیر پر یہاں تک کہ بھائیوں پر بھی بھروسہ نہ کروں۔

بہر حال قرآن کہتا ہے: جب وہ یوسف کو اپنے ساتھ لے گئے اور انہوں نے متفقہ فیصلہ کر لیا کہ اسے کنوئیں کی مخفی جگہ پھینک دیں گے، اس کام کے لیے جو ظلم ستم ممکن تھا انہوں نے روا رکھا (فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غِيَابَةِ الْجُبِّ (۱)۔)

لفظ ”اجمعا“ نشاندہی کرتا ہے کہ سب بھائی اس پروگرام پر متفق تھے اگرچہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کو قتل کرنے میں وہ متفق نہ تھے۔

اصولی طور پر ”اجمعا“ ”جمع“ کے مادہ سے اکٹھا کرنے کے معنی میں ہے اور ایسے مواقع پر آراء و افکار جمع کرنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس وقت ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی، اسے تسلی دی اور اس کی دلجوئی کی اور اس سے کہا غم نہ کھاؤ ”ایک دن ایسا آئے گا کہ تم انہیں ان تمام منحوس سازشوں اور منصوبوں سے آگاہ کرو گے اور تمہیں پہچان نہیں سکیں گے (وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ وہ دن کہ جب تم تختِ حکومت پر تکیہ لگائے ہو گے اور تمہارے یہ بھائی تمہاری طرف دستِ نیاز پھیلائیں گے اور ایسے

تشنہ کاموں کی طرح کہ جو چشمہ خوش گوار کی تلاش میں تپتے ہوئے بیابان میں سرگرداں ہوتے ہیں، تمہارے پاس بڑی انکساری اور فروتنی سے آئیں گے، لیکن تم اتنے بلند مقام پر پہنچے ہو گے کہ انہیں خیال بھی نہیں ہوگا کہ تم ان کے بھائی ہو، اس روز تم ان سے کہو گے کہ کیا تمہی نہ تھے جنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی یوسف کے ساتھ یہ سلوک کیا اور اس دن یہ کس قدر شرمسار اور پشیمان ہوں گے۔

اسی سورہ کی آیت ۲۲ کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحی الہی وحی نبوت نہ تھی بلکہ یوسف کے دل پر الہام تھا تاکہ وہ جان لے کہ وہ تنہا نہیں ہے اور اس کا ایک حافظ و نگہبان ہے، اس وحی نے قلب یوسف (علیہ السلام) پر امید کی ضیا پاشی کی اور یاس و ناامیدی کی تاریکیوں کو اس کی روح سے نکال دیا۔

یوسف کے بھائیوں نے جو منصوبہ بنا رکھا تھا اُس پر انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق عمل کر لیا، لیکن آخر کار انہیں واپس لوٹنے کے بارے میں سوچنا تھا کہ جاکر کوئی ایسی بات کریں کہ باپ کو یقین آجائے کہ یوسف کسی سازش کے تحت نہیں بلکہ طبعی طور پر وادی عدم میں چلا گیا ہے اور اس طرح وہ باپ کی نوازشات کو اپنی جانب موڈ سکیں۔

اس مقصد کے لئے انہوں نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ بالکل وہی تھا جس کا باپ کو خوف تھا اور وہ جس کی پیش بینی کرچکے تھے، یعنی انہوں نے فیصلہ کیا کہ جاکر کہیں کہ یوسف کو بھیڑیا کہا گیا اور اس کے لئے فرضی کہانیاں پیش کریں۔

قرآن کہتا ہے: رات کے وقت بھائی روتے ہوئے آئے (وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ).

ان کے جھوٹے آنسوؤں اور ٹسوے بہانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹا رونا بھی ممکن ہے اور صرف روتی ہوئی آنکھ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔

باپ جو بڑی بے تابی اور بے قراری سے اپنے فرزند دلیند یوسف کی واپسی کے انتظار میں تھا اُس نے جب انہیں واپس آتے دیکھا اور یوسف ان میں دکھائی نہ دیا تو وہ لرز گیا اور کانپ اٹھا، حالات پوچھے تو انہوں نے کہا: اب جان! ہم گئے اور باہم (سواری اور تیر اندازی کے) مقابلوں میں مشغول ہو گئے اور یوسف کہ جو چھوٹا تھا اور ہم سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اسے ہم اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے، اس کام میں ہم اتنے محو ہو گئے کہ ہر چیز یہاں تک کہ بھائی کو بھی بھول گئے، اس اثنا میں ایک بے رحم بھیڑیا اس طرف اپنچا اور اس نے اسے چیر پھاڑ کھایا (قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّبُّ

لیکن ہم جانتے ہیں کہ تم ہرگز ہماری باتوں کا یقین نہیں کرو گا اگرچہ ہم سچے ہون کیونکہ تم نے پہلے ہی اس قسم کی پیش بینی کی تھی لہذا اسے بہانہ سمجھو گے (وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ).

بھائیوں کی باتیں بڑی سوچی سمجھی تھیں، پہلی بات یہ کہ انہوں نے باپ کو ”یا ابانا“ (اے ہمارے والد) کے لفظ سے مخاطب کیا کہ جس میں ایک جذباتی پہلو تھا، دوسری بات یہ کہ فطری طور پر ایسی تفریح گاہ میں طاقتور بھائی بھاگ دوڑ میں مشغول ہو گئے اور چھوٹے کو سامان کی نگہداشت پر مقرر کریں گے اور اس کے علاوہ انہوں نے باپ کو غفلت میں رکھنے کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور روتی ہوئی آنکھوں سے کہا کہ تم ہرگز یقین نہیں کرو گے اگرچہ ہم سچ بول رہے ہوں۔

نیز اس بناء پر کہ باپ کو ایک زندہ نشانی بھی پیش کریں ”وہ یوسف کی قمیص کو جھوٹے خون میں تر کئے ہوئے تھے“ (وہ خون انہوں نے بکری یا بھیڑ کے بچے یا برن کا لگا رکھا تھا) (وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ).

لیکن ”دروغ گو حافظہ ندارد“ ایک حقیقی واقعہ کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اس کے مختلف کوائف اور مسائل ہوتے ہیں، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک فرضی کہانی میں سمویا جاسکے لہذا برادران یوسف بھی اس نکتے سے غافل رہے کہ کم از کم یوسف (علیہ السلام) کی کرتے کو چند جگہ سے پھاڑ لیتے تاکہ وہ بھیڑئے کے حملے کی دلیل بن سکتا وہ بھائی کی قمیص کو اس سے بدن سے صحیح سالم اتار کر خون آلودہ کر کے باپ کے پاس لے آئے، سمجھدار اور تجربہ کار باپ کی جب اس کرتے پر نگاہ پڑی تو وہ سب کچھ سمجھ گئے اور کہنے لگے کہ تم جھوٹ بولتے ہو ”بلکہ نفسانی ہوا و ہوس نے تمہارے لئے یہ کام پسندیدہ بنا دیا ہے اور یہ شیطانی سازشیں ہیں“ (قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً).

بعض روایات میں ہے کہ:

انہوں نے کرتا اٹھا لیا اور اس کا پہلا حصہ آگے کر کے پکار کر کہا: تو پھر اس میں بھیڑئے کے پنجوں اور دانتوں کے نشان کیوں نہیں ہیں۔

ایک اور روایت کے مطابق:

حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے کرتا اپنے منہ پر ڈال لیا، فریاد کرنے لگے اور آنسو بہانے لگے، وہ کہہ رہی تھے: یہ

کیسا مہربان بھیڑیا تھا جس نے میرے بیٹے کو تو کھالیا لیکن اس کے کرتے کو ذرہ بھر نقصان نہ پہنچایا، اس کے بعد وہ بے ہوش ہو کر خشک لکڑی کی طرح زمین پر گر پڑے، بعض بھائیوں نے فریاد کی: اے وائے ہو ہم پر روز قیامت عدلی الہی کی عدالت میں ہم بھائی بھی ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں اور باپ کو بھی ہم نے قتل کر دیا ہے، باپ اسی طرح سحری تک بے ہوش رہے لیکن سہرگاہی کی نسیم سرد کے جھونکے ان کے چہرے پر پڑے تو وہ ہوش میں آگئے۔ (2)

باوجودیکہ یعقوب (علیہ السلام) کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی، ان کی روح جل رہی تھی لیکن زبان سے ہرگز ایسی بات نہ کہتے تھے جو ناشکری، یاس و ناامیدی اور جزع و فزع کی نشانی ہو بلکہ کہا ”میں صبر کروں گا، صبرِ جمیل، ایسی شکیبائی جو شکر گزاری اور حمد خدا کے ساتھ ہو (فَصَبْرٌ جَمِيلٌ)۔ (3)

اس کے بعد یعقوب (علیہ السلام) کہنے لگے: ”جو کچھ تم کہتے ہو اس کے مقابلے میں میں خدا سے مدد طلب کرتا ہوں“ (وَإِنَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ)، میں اس سے چاہتا ہوں کہ جامِ صبر کی تلقی میرے حلق میں شیریں کر دے اور مجھے زیادہ تاب و توانائی دے تاکہ اس عظیم طوفان کے مقابلے میں اپنے اوپر کنٹرول رکھ سکوں اور میری زبان نادرست اور غلط بات سے آلودہ نہ ہو۔

انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یوسف کی موت کی مصیبت پر مجھے شکیبائی دے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یوسف قتل نہیں ہوئے بلکہ کہا کہ جو کچھ تم کہتے ہو کہ جس کا نتیجہ بہر حال اپنے بیٹے سے جدائی ہے، میں صبر طلب کرتا ہوں۔

۱۔ مندرجہ بالا آیت میں ”لما“ کا جواب محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: فلما ذهبوا به واجمعوا ان يجعلوه في غيابت الجب عظمت فنتنهم (تفسیر قرطبی)۔

اور یہ حذف شاید اس بنا پر ہو کہ اس دردناک حادثے کی عظمت کا تقاضا تھا کہ کہنے والا اس کے بارے میں خاموش رہے یہ خود بلاغت کے فنون میں سے ایک فن ہے۔ (تفسیر المیزان)

2۔ تفسیر آلوسی مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

3۔ ”صبرِ جمیل“ صفت و موصوف کے قبیل میں سے ہے اور مبتدا محذوف کی خبر بھی ہے، یہ دراصل اس طرح تھا: ”صبری صبرِ جمیل“۔

چند اہم نکات

۱۔ ایک ترکِ اولیٰ کے بدلے

ابوحزمہ ثمالی نے ایک روایت امام سجاد (علیہ السلام) سے نقل کی ہے ابوحزمہ کہتے ہیں:

جمعہ کے دن میں مدینہ منورہ میں تھا، نمازِ صبح میں نے امام سجاد (علیہ السلام) کے ساتھ پڑھی، جس وقت امام نماز اور تسبیح سے فارغ ہو گئے تو گھر کی طرف چل پڑے، میں آپ کے ساتھ تھا۔

آپ (علیہ السلام) نے خادمہ کو آواز دی اور کہا:

خیال رکھنا جو سائل، ضرورت مند گھر کے دروازے سے گزرے اسے کھانا دینا کیونکہ آج جمعہ کا دن ہے۔

ابوحزمہ کہتے ہیں:

میں نے کہا: ہر وہ شخص کو مدد کا تقاضا کرتا ہے مستحق نہیں ہوتا، تو امام نے فرمایا:

ٹھیک ہے، لیکن میں اس سے ڈرتا ہوں کہ ان میں مستحق افراد ہوں اور ہم انہیں غذا نہ دیں اور اپنے گھر کے دروازے سے دھتکار دیں تو کہیں ہمارے گھر والوں پر وہی مصیبت نہ آن پڑے جو یعقوب (علیہ السلام) اور آلِ یعقوب پر آن پڑی تھی۔

اس کے بعد فرمایا:

ان سب کو کھانا دو کہ (کیا تم نے نہیں سنا ہے کہ) یعقوب (علیہ السلام) کے لئے ہر روز ایک گوسفند ذبح کی جاتی تھی، اس

کا ایک حصہ مستحقین کو دیا جاتا تھا، ایک حصہ وہ جناب خود اور ان کی اولاد کھاتے تھے ایک دن ایک سائل آیا، وہ

مومن اور روزہ دار تھا، خدا کے ہاں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی، وہ شہر (کنعان) سے گزرا، شنب جمعہ تھی، افطار کے

وقت وہ دروازہ یعقوب (علیہ السلام) پر آیا اور کہنے لگا: بچی کھچی غذا سے مدد کے طالب غریب و مسافر مہمان کی مدد

کرو، اس نے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی، انہوں نے سنا تو سہی لیکن اس کی بات کو باور نہ کیا، جب وہ مایوس ہو گیا اور

رات کی تاریکی ہر طرف چھا گئی تو وہ لوٹ گیا، جاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے بارگاہِ الہی میں

بھوک کی شکایت کی، رات اس نے بھوک ہی میں گزاری اور صبح اسی طرح روزہ رکھا جب کہ وہ صبر کئے ہوئے تھا

اور خدا کی حمد و ثنا کرتا تھا لیکن حضرت یعقوب (علیہ السلام) اور ان کے گھر والے مکمل طور پر سیر تھے اور صبح

کے وقت ان کا کچھ کھانا بچا بھی رہ گیا تھا۔

امام (علیہ السلام) نے اس کے بعد مزید فرمایا:

خدا نے اسی صبح حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی طرف وحی بھیجی: اے یعقوب! تپونے میرے بندے کو خوار کیا ہے اور میرے غضب کو بھڑکایا ہے اور تُو اور تیری اولاد نزولِ سزا کی مستحق ہوگئی ہے، اے یعقوب! میں اپنے دوستوں کو

زیادہ جلدی سرزنش کرتا اور سزا دیتا ہوں اور یہ اس لئے کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ (1)

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس حدیث کے بعد بے کہ ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں:

میں نے امام سجاد (علیہ السلام) سے پوچھا: کہ یوسف (علیہ السلام) نے وہ خواب کس موقع پر دیکھا تھا؟

امام (علیہ السلام) نے فرمایا: اسی رات۔ (2)

اس حدیث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و اولیائے حق سے ایک چھوٹی سی لغزش یا زیادہ صریح الفاظ میں ”ترکِ

اولیٰ“ کہ جو گناہ اور معصیت بھی شمار نہیں ہوتا تھا (کیونکہ اس سائل کی حالت حضرت یعقوب (علیہ السلام) پر واضح

نہیں تھی) بعض اوقات خدا کی طرف سے ان کی تنبیہ کا سبب بنتا ہے اور یہ صرف اس لئے ہے کہ ان کا بلند و بالا مقام

تقاضا کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات اور عمل کی طرف متوجہ رہیں کیونکہ:

حسنات الابرار سینات المقربین۔

وہ کام جو نیک لوگوں کے لئے نیکی شمار ہوتے ہیں مقربین بارگاہِ الہی کے لئے برائی ہیں۔

جہاں حضرت یعقوب (علیہ السلام) ایک سائل کے دردِ دل سے بے خبر رہنے کی وجہ سے یہ رنج و غم اٹھائیں تو ہمیں

سوچنا چاہئے کہ وہ معاشرہ جس میں چند لوگ سیر ہوں اور زیادہ تر لوگ بھوکے ہوں کیسے ممکن ہے کہ اس پر غضب

الہی نہ ہو اور کس طرح خدا سے سزا نہ دے۔

.....

1، 2- تفسیر بریان، ج ۲، ص ۲۴۳، اور نور الثقلین، ج ۲، ص ۴۱۱۔

۲- حضرت یوسف (علیہ السلام) کی دلکش دُعا

روایات اہل بیت (علیہ السلام) اور طرقِ اہل سنت میں ہے کہ جس وقت حضرت یوسف (علیہ السلام) کنویں کی تہ میں پہنچ

گئے تو ان کی امید ہر طرف سے منقطع ہوگئی اور ان کی تمام تر توجہ ذاتِ پاکِ خدا کی طرف ہوگئی، انہوں نے اپنے خدا

سے مناجات کی اور جبرئیل کی تعلیم سے راز و نیاز کرنے لگے کہ جو روایات میں مختلف عبارتوں میں منقول ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے خدا سے یوں مناجات کی:

اللہم یا مونس کل غریب ویا صاحب کل وحید ویا ملجا کل کائف ویا کاشف کل کربة ویا عالم کل نجوی یامنتھی کل شکوی ویا

حاضر کل ملاء یاحی یا قیوم اسئلک ان تقذف رجائک فی قلبی حئی لایکون لی ہم ولا شغل غیرک وان تجعل لی من امری

فرجاً ومخرجاً انک علی کل شیء قدیر۔

بارہا! اے وہ جو غریب مسافر کا مونس ہے اور تنہا کا ساتھی ہے، اے وہ جو ہر خائف کی پناہ گاہ ہے، ہر غم کو ہر طرف

کرنے والا ہے، ہر فریاد سے آگاہ ہے، ہر شکایت کرنے والے کی آخری امید ہے اور ہر مجمع میں موجود ہے، اے حی!

اے قیوم! (اے زندہ! اے ساری کائنات کے نگران!) میں تجھ سے چاہتا ہوں کہ اپنی امید میرے دل میں ڈال دے تاکہ تیرے

علاوہ کوئی فکر نہ رکھوں اور تجھ سے چاہتا ہوں کہ میرے لئے اس عظیم مشکل سے راہِ نجات پیدا کر دے کہ تُو ہر چیز

پر قادر ہے۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ اس حدیث کے ذیل میں یہ ہے کہ فرشتوں نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی آواز سنی تو عرض

کیا:

الہنا نسمع صوتاً ودعاء: الصوت صوت صبی والدعاء دعاء نبی!

پروردگار! ہم آواز اور دعا سن رہے ہیں آواز تو بچے کی ہے لیکن دعاء نبی کی ہے۔ (1)

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جس وقت حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے انہیں کنوینمیں پھنکا تو ان کا گرتہ

اتار لیا اور ان کا بدن برہنہ ہوگیا تو یوسف نے بہت داد و فریاد کی کہ کم از کم میرا گرتہ تو مجھے دے دو تاکہ اگر میں زندہ

رہوں تو میرا بدن ڈھانپے اور اگر مر جاؤں تو میرا کفن ہو، بھائی کہنے لگے: اسی سورج، چاند اور ستاروں سے کہ جنہیں

خواب میں دیکھا تھا تقاضا کرو کہ اس کنویں میں تیرے مونس و غمخوار ہوں اور تجھے لباس پہنائیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب غیر خدا سے مطلقاً ناامید ہوگئے تو مذکورہ بالا دعا کی۔ (2)



امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے ، آپ نے فرمایا:  
 جب انہوں نے یوسف کو کنویں میں پھینکا تو جبرائیل ان کے پاس آئے اور کہا: بچے! یہاں کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا : بھائیوں نے مجھے کنویں میں پھینک دیا ہے ۔  
 جبرائیل کہنے لگے: کیا تم کنویں سے باہر نکلنا چاہتے ہو؟  
 وہ کہنے لگے: خدا کی مرضی ہے ، اگر وہ چاہے گا تو مجھے باہر نکال لے گا ۔  
 جبرائیل نے کہا: خدا نے حکم دیا ہے کہ یہ دعا پڑھو تاکہ باہر آجاؤ۔  
 انہوں نے کہا کونسی دعاء؟  
 جبرائیل نے کہا : کہو:

اللّٰهُمَّ اِنِّى اسئلك بان لك الحمد لاله الا انت المنان، بديع السموات والارض، ذوالجلال والاکرام، ان تصلى على محمد و آل محمد وان تجعل لى مما انا فيه فرجاً ومكراً  
 پروردگارا ! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں، اے کہ حمد و تعریف تیرے لئے ہے، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں، تُو ہے جو بندوں کو نعمت بخشتا ہے، آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، صاحبِ جلال واکرام ہے، میں درخواست کرتا ہوں کہ محمد و آل محمد پر درود بھیج اور جس میں میں ہوں اس سے مجھے کشائش و نجات عطا فرما۔ (3)  
 کوئی مانع نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دونوں دعائیں کی ہوں ۔

1، 2۔ تفسیر قرطبی، ج 5، ص 373۔  
 3۔ نور الثقلین، ج 2، ص 416۔

۳۔ ”واجمعوا ان يجعلوه فى غيابت الجب“ کا مفہوم

یعنی ۔ انہوں نے اتفاق کیا کہ اسے کنویں کی مخفی جگہ پر ڈال دیں ۔ یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو کنویں میں پھینکا نہیں تھا بلکہ نیچے لے گئے تھے، کنویں کی تہ میں جہاں ایک چبوترا سا نیچے جانے والوں کے لئے بنایا جاتا ہے اور سطح آب کے قریب ہوتا ہے انہوں نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی کمر میں طناب ڈال کر وہاں تک پہنچایا اور وہاں چھوڑ دیا ، مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں جو متعدد روایات وارد ہوئیں ہیں وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں ۔

۴۔ تسویل نفس سے کیا مراد ہے؟

لفظ ”سوّلت“ تسویل کے مادہ سے ”تزنّین“ کے معنی میں ہے، بعض اوقات اس کا معنی ”سوسہ پیدا کرنا“ بھی بیان کیا جاتا ہے، ان تمام معانی کی بازگشت تقریباً ایک ہی مفہوم کی طرف ہے یعنی تمہاری نفسیاتی خواہشات نے تمہارے لئے یہ کام مزین کر دیا ہے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جس وقت سرکش ہوا ہوس انسانی روح اور فکر پر غلبہ کر لیتی ہے تو بدترین جرائم مثلاً بھائی کو قتل کرنا یا جلا وطن کرنا وغیرہ بھی انسان کی نظر میں ایسے پسندیدہ ہوجاتے ہیں کہ وہ انہیں ایک مقدس اور ضروری چیز خیال کرنے لگتا ہے، یہاں سے نفسیاتی مسائل کی ایک عمومی بنیاد کی طرف دریچہ کھلتا ہے وہ یہ کہ ہمیشہ کسی ایک مسئلے کی طرف افراطی میلان خصوصاً جب اس میں اخلاقی ردائل بھی شامل ہوں انسان کی قوتِ شناخت پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس کی نظر میں حقائق کو الٹ کر پیش کرتا ہے ۔

اسی لئے تہذیبِ نفس کے بغیر فیصلہ کرنا اور عینی حقائق کو پہچاننا ممکن نہیں ہے اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قاضی کے لئے عدالت شرط ہے تو اس کی دلیل یہی ہے اور قرآن مجید میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ بھی اسی طرف اشارہ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

اور تقویٰ اختیار کرو خدا تمہیں علم ودانش دے گا ۔

۵۔ دروغ گو حافظہ ندارد

حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بھائیوں کے سلوک کی داستان سے یہ مشہور حقیقت پھر درجہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ جھوٹا آدمی ہمیشہ کے لئے اپنا راز نہیں چھپا سکتا کیونکہ عینی حقائق جب خارجی وجود حاصل کر لیتے ہیں تو دیگر امور

کے ساتھ ان کے بے شمار روابط ہوتے ہیں اور جھوٹا آدمی جو اپنے جھوٹ کے ذریعے ایک غلط منظر تخلیق کرنا چاہتا ہے تو وہ جس قدر بھی زیرک و ہوشیار ہو ان تمام روابط کو محفوظ نہیں رکھ سکتا، بالفرض اگر وہ مسئلہ سے متعلق چند جعلی رابطے تیار بھی کر لے پھر بھی یہ بناوٹی رابطے حافظے میں ہمیشہ کے لئے رکھنا آسان کام نہیں ہے اور اس سے تھوڑی غفلت تضاد بیانی کا سبب بن جاتی ہے، علاوہ ازیں ان میں سے بہت سے روابط غفلت میں رہ جاتے ہیں اور انہی سے آخر کار حقیقت فاش ہو جاتی ہے، اور یہ ان تمام افراد کے لئے ایک درس ہے جنہیں اپنی عزت و آبرو ہے کہ وہ کبھی جھوٹ کا طواف نہ کریں، اپنی معاشرتی حیثیت کو خطرے میں نہ ڈالیں اور اپنے لئے خدا کا غضب نہ خریدیں۔

۶۔ صبرِ جمیل کیا ہے؟

سخت حوادث اور سنگین طوفانوں کے مقابلے میں پامردی و شکیبائی انسان کی روحانی عظمت اور بلند شخصیت کی نشانی ہے، ایسی عظمت کہ جس میں عظیم حوادث سما جاتے ہیں لیکن انسان ڈگمگاتا اور لرزتا نہیں۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا چھوٹے سے تالاب کے پانی کو ہلا دیتا ہے لیکن بحرِ اوقیانوس جیسے بڑے سمندروں میں بڑے بڑے طوفان آرام سے سما جاتے ہیں اور انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بعض اوقات انسان ظاہراً پامردی و شکیبائی دکھاتا ہے لیکن بعد میں جُہنے والی باتیں کرتا ہے کہ جو ناشکری اور عدم برداشت کی نشانی ہے، اس طرح وہ خود اپنے صبر و تحمل کا چہرہ بدنما کر دیتا ہے لیکن با ایمان، قوی الارادی اور عالی ظرف وہ لوگ ہیں کہ ایسے حوادث میں جن کا پیمانہ صبرِ لبریز نہیں ہوتا اور ان کی زبان پر کوئی ایسی بات نہیں آتی جو کہ ناشکری، کفران، بے تابی اور جزع و فزع کی مظہر ہو، ان کا صبر ”صبرِ زیبا“ اور ”صبرِ جمیل“ ہے۔

اس وقت یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس سورہ کی دوسری آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے اس قدر غم کیا کہ ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، کیا یہ بات صبرِ جمیل کے منافی نہیں؟

اس سوال کا جواب ایک جملے میں دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ مردانِ خدا کا دل احساسات اور عواطف کا مرکز ہوتا ہے، مقامِ تعجب نہیں کہ بیٹے کے فراق میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑے، یہ ایک حساس مسئلہ ہے، اہم یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر ضبط رکھیں یعنی کوئی بات اور کوئی حرکت رضائے الہی کے خلاف نہ کریں، اسلامی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبرِ اسلام اپنے بیٹے ابراہیم کی موت پر آنسو بہا رہے تھے تو اتفاقاً یہی اعتراض آپ پر کیا گیا کہ آپ ہمیں رونے سے منع کرتے ہیں لیکن آپ خود آنسو بہاتے ہیں تو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: آنکھیں روتی ہیں اور دل غم زدہ ہوتا ہے لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو خدا کو ناراض کر دے۔

حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

تدمع العين ويحزن القلب ولا نقول ما يسخط الرب.

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

ليس هذا بكاء ان هذا رحمة

یہ (بے تابی کا) گریہ نہیں ہے یہ تو (جذبات کا اظہار اور) رحمت ہے۔ (1)

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے سینے میں دل ہے پتھر نہیں اور فطری امر ہے کہ جن معاملات کا تعلق دل کے جذبات سے ہو ان پر وہ ردّ عمل تو کرتا ہے اور اس کا سادہ ترین اظہار آنکھوں سے اشکِ روان ہونا ہے، یہ عیب نہیں ہے بلکہ یہ تو حسن ہے، عیب یہ ہے کہ انسان ایسی بات کرے جس سے خدا غضب ناک ہو۔

1۔ بحار، طبع جدید، ج ۲۲، ص ۱۵۷، و ۱۵۱۔

۱۹ وَجَانَّتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَى دَلْوَهُ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَذَا غُلَامٌ وَأَسْرُوهُ بِضَاعَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ -  
۲۰ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ -

ترجمہ

۱۹۔ اور قافلہ آپہنچا (انہوں نے) پانی پر مامور (شخص کو پانی کی تلاش) کو بھیجا، اُس نے اپنا ڈول کنویں میں ڈالا اور وہ پکارا: خوشخبری ہو، یہ لڑکا ہے (خوبصورت اور قابلِ محبت) انہوں نے اسے ایک سرمایہ سمجھتے ہوئے دوسروں سے مخفی رکھا اور جو کچھ وہ انجام دیتے تھے خدا اس سے آگاہ ہے -  
۲۰۔ اور انہوں نے اسے چند درہموں کی معمولی قیمت پر بیچ دیا اور (اسے بیچتے ہوئے) وہ اس کے بارے میں بے اعتناء تھے (کیوں کہ وہ درتے تھے کہ کہیں ان کا راز فاش نہ ہو جائے)

سرزمین مصر کی جانب

یوسف (علیہ السلام) نے کنویں کی وحشت ناک تاریکی اور بولناک تنہائی میں بہت تلخ گھڑیاں گزاریں لیکن خدا پر ایمان اور ایمان کے زیر سایہ ایک اطمینان نے ان کے دل میں نورِ امید کی کرنیں روشن کردی تھیں اور انہیں ایک توانائی بخشی تھی تاکہ وہ اس بولناک تنہائی کو برداشت کریں اور آزمائش کی اس بھٹی سے کامیابی کے ساتھ نکل آئیں، اس حالت میں وہ کتنے دن رہے یہ خدا جانتا ہے، بعض مفسرین نے تین دن لکھا ہے اور بعض نے دو دن، بہر حال ایک قافلہ آپہنچا، ”وَجَانَّتْ سَيَّارَةٌ“ (۱)

اور اس قافلے نے وہیں نزدیک ہی پڑاؤ ڈالا، واضح ہے کہ قافلے کی پہلی ضرورت یہی ہوتی ہے کہ وہ پانی حاصل کرے، اس لئے ”انہوں نے پانی پر مامور شخص کو پانی کی تلاش میں بھیجا (فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ) (۲)“، ”اُس نے اپنا ڈول کنویں میں ڈالا“ (فَأَدْلَى دَلْوَهُ)۔

یوسف کنویں کی تہ میں متوجہ ہوئے کہ کنویں کے اوپر سے کوئی آواز آرہی ہے، ساتھ ہی دیکھا کہ ڈول اور رسی تیزی سے نیچے آرہی ہے، انہوں نے موقع غنیمت جانا اور اس عطیہ الہی سے فائدہ اٹھایا اور فوراً اس سے لپٹ گئے، بہشتی (۳) نے محسوس کیا کہ اس کا ڈول اندازے سے زیادہ بھاری ہے، جب اس نے زور لگا کر اسے اوپر کھینچا تو اچانک اس کی نظر ایک چاند سے بچے پر پڑی، وہ چلایا: خوشخبری ہو، یہ تو پانی کے بجائے بچہ ہے (قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَذَا غُلَامٌ)۔ آپستہ آپستہ قافلے میں سے چند لوگوں کو اس بات کا پتہ چل گیا لیکن اس بنا پر کہ دوسروں کو پتہ نہ چلے اور یہ خود ہی مصر میں اس خوبصورت بچے جو ایک غلام کے طور پر بیچ دیں ”اسے انہوں نے ایک اچھا سرمایہ سمجھتے ہوئے دوسروں سے مخفی رکھا“ (وَأَسْرُوهُ بِضَاعَةً) (۴)

البتہ اس جملے کی تفسیر میں کچھ اور احتمال بھی ذکر کئے گئے ہیں :

ایک یہ کہ یوسف (علیہ السلام) جن کے ہاتھ لگا انہوں نے اس کا کنویں سے ملنا مخفی رکھا اور کہا کہ یہ سرمایہ ہمیں کنویں کے مالکوں نے دیا ہے تاکہ اسے ان کے لئے مصر میں بیچ دیں -

دوسرا یہ کہ یوسف (علیہ السلام) کے بعض بھائی جو اس کی خبر لینے کے لئے یا اس کو غذا دینے کے لئے کبھی کبھی کنویں کے پاس آیا کرتے تھے جب انہیں اس واقعے کا پتہ چلا تو انہوں نے اس بات کو چھپایا کہ یوسف ان کا بھائی ہے، صرف یہ کہا کہ یہ ہمارا غلام ہے جو بھاگ آیا ہے اور یہاں چھپا بیٹھا ہے اور انہوں نے یوسف کی دھمکی دی کہ اصل معاملے سے پردہ اٹھائے گا تو قتل کر دیا جائے گا -

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے -

آیت کے آخر میں ہے : جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں خدا اس سے آگاہ ہے (وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ)۔

آخر کار انہوں نے یوسف (علیہ السلام) کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیا (وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ)۔

یوسف (علیہ السلام) کو بیچنے کے بارے میں اختلاف ہے، بعض انہیں یوسف کے بھائی سمجھتے ہیں، لیکن آیات کا ظاہر ی مفہوم یہ ہے کہ یہ کام قافلے والوں نے کیا، کیونکہ زیرِ نظر آیت میں بھائیوں کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی اور ان سے قبل کی آیت کے اختتام پر بھائیوں سے متعلق بحث ختم ہو گئی ہے اور جمع کی ضمیریں ”ارسلوا“، ”اسروہ“ اور ”شروہ“ سب ایک ہی طرف لوٹتی ہیں (یعنی، قافلے والے)۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو تھوڑی سی قیمت پر کیوں بیچ دیا، قرآن نے اسے

”بٹمن بخت“ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا کم از کم ایک قیمتی غلام سمجھے جاسکتے تھے۔ لیکن یہ معمول کی بات ہے کہ ہمیشہ چور یا ایسے افراد جن کے ہاتھ کوئی اہم سرمایہ بغیر کسی زحمت کے آجائے تو وہ اس خوف سے کہ کہیں دوسروں کو معلوم نہ ہو جائے اسے فوراً بیچ دیتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ اس جلد بازی میں وہ زیادہ قیمت حاصل نہیں کر سکتے۔

”بخت“ اصل میں کسی چیز کو ظلم کے ساتھ کم کرنے کے معنی میں، اسی لئے قرآن کہتا ہے:

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَانَهُمْ -

لوگوں کی چیزوں کو ظلم کے ساتھ کم نہ کرو۔ (ہود: ۸۵)

اس بارے میں کہ انہوں نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو کتنے داموں میں بیچا اور پھر یہ رقم آپس میں کس طرح تقسیم کی، اس سلسلے میں بھی مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے یہ رقم ۲۰ درہم، بعض نے ۲۲ درہم، بعض نے ۴۰ درہم اور بعض نے ۱۸ درہم لکھی ہے اور طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بیچنے والوں کی تعداد دس بیان کی جاتی ہے، اس ناچیز رقم میں سے ہر ایک کا حصہ واضح ہوجاتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:- یوسف کو بیچنے کے بارے میں وہ بے اعتناء تھے (وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ).

یہ جملہ درحقیقت گزشتہ جملے کی علت بیان کرنے کے لئے ہے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر انہوں نے یوسف کو تھوڑی سی رقم پر بیچ دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے اور اس کے بارے میں بے اعتناء تھے۔

ایسا یا اس لئے تھا کہ یوسف (علیہ السلام) کو قافلے والوں نے بے مول لیا تھا اور انسان جو چیز معمولہ قیمت پر لے عموماً کم قیمت پر ہی بیچتا ہے اور یا وہ ڈرتے تھے کہ مبادا ان کارا زفاش ہواور کوئی مدعی پیدا ہو جائے اور یا اس بناء پر کہ انہیں یوسف (علیہ السلام) میں غلام ہونے کی نشانیاں نظر نہیں آتی تھیں بلکہ آزادی اور حریت کے آثار ان کے چہرے سے ہویا تھے، اسی بنا پر نہ بیچنے والے ان میں کوئی دلچسپی رکھتے تھے نہ خریدار۔

.....

۱. کاروان کو ”سیارۃ“ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔

۲. ”وارد“ پانی لانے والے کے معنی میں ہے، اصل میں یہ لفظ ”ورود“ سے لیا گیا ہے جس کا معنی جیسے کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے پانی کا قصد کرنا اگرچہ بعد میں اس کے معنی میں وسعت پیدا ہوگئی اور ہر ورود و دخول کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا ہے۔

۳. ”بہشتی“ اردو میں پانی بھرنے والے کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

۴. بضاعۃ“ اصل میں ”بضع“ (بروزن ”نظر“) کے مادہ سے گوشت کے ایک ٹکڑے کے معنی میں ہے کہ جسے جدا کر لیا جائے، بعد ازاں اس معنی میں وسعت پیدا ہوگئی اور یہ لفظ مال اور سرمایہ کے اہم حصے کے لئے بھی استعمال ہونے لگا ”بضاعۃ“ بدن کے ٹکڑے کے معنی میں ہے اور ”حسن البضع“ موٹے اور پر گوشت انسان کے معنی میں آیا ہے اور ”بضع“ (بروزن ”حزب“) تین سے لے کر دس تک کے عدد کے معنی میں آیا ہے۔

۲۱ وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَادًّا وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ -

۲۲ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ -

ترجمہ

۲۱. اور وہ شخص جس نے اسے سر زمین مصر سے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا: اس کے مقام و منزلت کی تکریم کرنا شاید ہمارے لئے مفید ہو یا اسے ہم اپنے بیٹے کے طور پر اپنا لیں، اس طرح ہم نے یوسف کو اس سر زمین میں متمکن کر دیا، (ہم نے یہ کام کیا) تاکہ وہ خواب کی تعبیر سیکھ لے، خدا اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۲۲. اور جب وہ بلوغ و قوت کے مرحلے میں داخل ہوا تو ہم نے اسے ”حکم“ اور ”علم“ عطا کئے اور ہم اس طرح نیک لوگوں کو جزاء دیتے ہیں۔

مصر کے محل میں

حضرت یوسف (علیہ السلام) کی بھرپور داستان جب یہاں پہنچی کہ بھائی انہیں کنویں میں پھینک چکے تو ہر صورت

بھائیوں کے ساتھ ساتھ والا مسئلہ ختم ہو گیا، اب اس ننھے بچے کی زندگی کا ایک نیا مرحلہ مصر میں شروع ہوا، اس طرح سے کہ آخر کار یوسف مصر میں لائے گئے، وہاں انہیں فروخت کے لئے پیش کیا گیا، کیونکہ یہ نفیس تحفہ تھا لہذا معمول کے مطابق ”مصر“ کو نصیب ہوا کہ جو درحقیقت فرعونوں کی طرف سے وزیر یا وزیر اعظم تھا اور ایسے ہی لوگ ”تمام پہلوؤں سے ممتاز اس غلام“ کی زیادہ سے زیادہ قیمت دے سکتے تھے، اب دیکھتے ہیں کہ مصر کے گھر یوسف (علیہ السلام) پر کیا گزرتی ہے۔

قرآن کہتا ہے: جس نے مصر میں یوسف کو خریدا اس نے اپنی بیوی سے اس کی سفارش کی اور کہا کہ اس غلام کی منزلت کا احترام کرنا اور اسے غلاموں والی نگاہ سے نہ دیکھنا کیونکہ ہمیں امید ہے کہ مستقبل میں ہم اس غلام سے بہت فائدہ اٹھائیں گے یا اسے فرزند کے طور پر اپنا لینگے (وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ اَكْرَمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ اَنْ يَنْفَعَنَا اَوْ نَتَّخِذَهُ وَوَلَدًا)۔ (۱)

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ بیٹے کے شوق میں زندگی بسر کر رہا تھا، جب اس کی آنکھ اس خوبصورت اور آبرومند بچے پر پڑی تو اس کا دل آیا کہ یہ اس کے بیٹے کے طور پر ہو۔ اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: اس طرح اس سرزمین میں یوسف کو متمکن اور صاحب نعمت و اختیار کیا (وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ)۔

یہ ”تمکین فی الارض“ اس بناء پر تھا کہ یوسف کا مصر میں آنا اور خصوصاً مصر کی زندگی میں قدم رکھنا ان کی آئندہ کی انتہائی قدرت کے لئے تمہید تھا اور یا اس بنا پر تھا کہ مصر کے محل کی زندگی کنویں کی تہ کی زندگی سے کوئی موزانہ نہ تھا، وہ تنہائی، بھوک اور وحشت کی شدت کہاں اور یہ سب نعمت اور آسائش اور آرام و سکون کہاں۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے ایسا اس لئے کیا تاکہ اسے احادیث کی تاویل کی تعلیم دیں (وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيثِ)۔

”تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيثِ“ سے مراد ہے، جیسا ہے کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے تعبیر خواب کا علم ہے کہ جس کے ذریعے یوسف آئندہ کے اسرار کے اہم حصے سے آگاہ ہو سکتے تھے اور یا اس سے مراد وحی الہی ہے کیونکہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی خدائی آزمائشوں کی سنگلاخ گھاٹیوں سے گزر کر دربار مصر میں پہنچنے تک ایسی قابلیت پیدا کر لی تھی کہ حامل رسالت و وحی ہوں۔

لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: خدا اپنے کام پر مسلط اور غالب ہے، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے (وَاللّٰهُ عَلِيْبٌ عَلٰی اَمْرِهِ وَاَلَكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ)۔

خدا کے مظاہر قدرت میں سے ایک عجیب مظہر اور امور پر اس کا تسلط یوں ہے کہ بہت سے مواقع پر وہ انسان کی کامیابی اور نجات کے وسائل اس کے دشمنوں کے ہاتھوں فراہم کرتا ہے چنانچہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے سلسلے میں اگر بھائیوں کا منصوبہ نہ ہوتا تو وہ برگز کنویں میں نہ جاتے اور نہ فرعون کے عجیب خواب کا معاملہ ان کے سامنے پیش ہوتا اور نہ ہی یوسف (علیہ السلام) مصر بنتے۔

درحقیقت خدا نے بھائیوں کے ہاتھوں یوسف (علیہ السلام) کو تخت قدرت پر بٹھایا اگرچہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اسے بدبختی کے کنویں میں پھینک دیا ہے۔

اس نئے ماحول میں جو درحقیقت مصر کا ایک اہم سیاسی مرکز تھا یوسف (علیہ السلام) کو نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، ایک طرف خیرہ کن طاقت اور طاغوتیان مصر کے محلات (جنہیں خواب سمجھا جاتا) اور ان کی بے کراں ثروت کو دیکھتے ہوئے دوسری طرف بردہ فروشوں کے بازار کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا، وہ ان دونوں کا موازنہ کرتے اور دیکھتے کہ عام لوگوں کی اکثریت فراوان رنج و غم اور دکھ درد کا شکار ہے تو ان کی روح اور فکر پر بہت بوجھ پرتا اور وہ سوچتے کہ اگر مجھے طاقت حاصل ہو جائے تو یہ کیفیت ختم کر دوں۔

جی ہاں! انہوں نے بہت سی چیزیں اس شور و غل کے ماحول میں سیکھیں، ان کے دل میں ہمیشہ غم و اندوہ کا ایک طوفان موجزن ہوتا تھا کیونکہ ان حالات میں وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، اس دور میں وہ مسلسل خود سازی اور تہذیب نفس میں مشغول تھے۔

قرآن کہتا ہے: جب وہ بلوغ اور جسم و روح کے تکامل کے مرحلے میں پہنچا اور انوار وحی قبول کرنے کے قابل ہو گیا، تو ہم نے اسے حکم اور علم دیا (وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهُ اَنْبَاہُ حُكْمًا وَعِلْمًا)۔

اور اس طرح ہم نیکو کار لوگوں کو جزاء دیتے ہیں (وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ)۔

”اشد“ ”شد“ کے مادہ سے مضبوط گروہ کے معنی میں ہے، یہاں جسمانی اور روحانی استحکام کی طرف اشارہ ہے، بعض

نے کہا ہے کہ ”اشد“ جمع ہے جس کا مفرد نہیں ہے لیکن بعض نے اسے ”شد“ (بروزن ”سد“) کی جمع کہا ہے، بہر حال اس کے معنی کا جمع ہونا قابل انکار نہیں ہے۔

جو مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے یوسف کی جسمانی و روحانی بلوغت پر اسے ”حکم“ اور ”علم“ عطا کیا، یا تو مقام وحی و نبوت ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے اور یا ”حکم“ سے مراد عقل و فہم اور صحیح فیصلے کی قدرت ہے کہ جو ہوس پرستی اور اشتباہ سے خالی ہو اور ”علم“ سے مراد آگاہی اور دانش ہے کہ جس کے ساتھ جہالت نہ ہو، بہر حال ”حکم“ اور ”علم“ جو کچھ بھی تھے دو ممتاز اور قیمتی خدائی انعام تھے کہ جو کدا نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو ان کی پاکیزگی تقویٰ، صبر و شکیبائی اور توکل کی وجہ سے دئے تھے اور یوسف (علیہ السلام) کی یہ تمام خوبیاں لفظ ”محسنین“ میں جمع ہے۔

بعض مفسرین نے ”حکم“ اور ”علم“ کے بارے میں تمام تر احتمالات کو تین احتمالات کے طور پر ذکر کیا گیا ہے :

۱۔ ”حکم“ مقام نبوت کی طرف اشارہ ہے (چونکہ پیغمبر برحق حاکم ہے) اور علم اشارہ ہے علم دین کی طرف۔

۲۔ ”حکم“ سرکش ہوا ہوس کے مقابلے میں اپنے اوپر ضبط رکھنے کے معنی میں ہے کہ جو یہاں حکمتِ عملی کی طرف اشارہ ہے اور علم اشارہ ہے نظری حکمت و علم و دانش کی طرف اور ”حکم“ کو ”علم“ پر اس لئے مقدم کیا گیا ہے کہ انسان جب تک تہذیبِ نفس اور خودسازی نہ کر لے صحیح علم تک نہیں پہنچ سکتا۔

۳۔ ”حکم“ اس معنی میں ہے کہ انسان نفسِ مطمئنہ کے مقام پر پہنچ جائے اور اپنے اوپر کنٹرول حاصل کر لے اس طرح کہ نفسِ امارہ اور وسوسہ پیدا کرنے والے نفس پر اسے کنٹرول ہو جائے اور علم سے مراد انوارِ قدسیہ اور فیضِ الہی کی شعاعیں ہیں کہ جو علم ملکوت سے پاک انسان کے دل پر پڑتی ہے (2)

۱۔ ”مٹوا“ کا معنی ہے مقام، یہ مادہ ”ٹوی“ سے ہے جو اقامت کے معنی میں ہے لیکن یہاں حیثیت اور مقام و منزلت کے معنی میں ہے۔

2۔ تفسیر کبیر، ج ۱۸، ص ۱۱۱۔

چند اہم نکات

۱۔ مصر کا نام کیوں نہیں لیا گیا:

زیر نظر آیات میں جاذب توجہ مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ ان میں مصر کا نام نہیں لیا گیا ہے کہ وہ شخص جس نے مصر سے یوسف کو خریدا لیکن آیت میں یہ ہے ان نہیں ہوا کہ یہ شخص کون تھا، آئندہ آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی دفعہ اس شخص کے منصب سے پردہ نہیں اٹھتا بلکہ تدریجاً اس کا تعارف کروا لیا گیا ہے مثلاً آیہ ۲۵ میں فرمایا گیا ہے:

جس وقت یوسف نے زلیخا کے عشق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا اور بے رونی دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تو اس عورت کے شوہر کو اچانک دروازے پر دے کھا۔

جب ان آیت سے گزرتے ہوئے آیہ ۳۰ تک پہنچتے ہیں تو اس میں --- ”امراة العزیز“ (عزیز کی بیوی) کی تعبیر آئی ہے

یہ تدریجی بیان یا تو اس لیے ہے کہ قرآن اپنی سنت کے مطابق ہر بات کو ضراری مقدار کے مطابق بیان کرتا ہے جو کہ فصاحت و بلاغت کی نشانی ہے اور یہ کہ جسے آج کل بھی ادبے ات کا معمول ہے کہ ایک داستان بیان کرتے ہوئے اسے سر بستہ نکتے سے شروع کیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والے میں تجسس پیدا ہوا اور اس کی پوری توجہ اس داستان کی طرف کھنچ جائے۔

۲۔ علم تعبیرِ خواب اور مصر کا محل:

دوسرا سوال جو مذکورہ بالا آیات سے پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ علم تعبیرِ خواب اور مصر کے محل میں حضرت یوسف (علیہ السلام) کی موجودگی کا کیا رابطہ ہے کہ اس کی طرف ”لنلعمہ“ کی ”لام“ کہ جو لام غایت ہے کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن اگر ہم اس نکتے کی طرف توجہ دیں تو ہوسکتا ہے منکورہ سوال کا جواب واضح ہوجائے کہ خدائے تعالیٰ بہت سی علمی نعمات و عنایات گناہ سے پرہیز اور سرکش ہوا وبوس کے مقابلے میں استقامت کی وجہ سے بخشتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ نعمات کہ جو دل کی نورانیت کا ثمرہ ہیں، ایک انعام ہیں کہ جو خدا اس قسم کے اشخاص کو بخشتا ہے۔ ابن سیرین تعبیر خواب جاننے میں بڑے مشہور ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ کپڑا بیچا کرتے تھے اور بہت ہی خوبصورت تھے، ایک عورت انہیں اپنا دل دے بیٹھی، بڑے حیلے بہانے کر کے انہیں اپنے گھر میں لے گئی اور دروازے بند کر لئے، لیکن انہیں نے عورت کی بوس کے سامنے سرتسلیم خم نہ کیا اور مسلسل اس عظیم گناہ کے مفسد اس کے سامنے بیان کرتے رہے لیکن اس عورت کی بوس کی آگ اس قدر سرکش تھی کہ وعظ و نصیحت کا پانی اسے نہیں بجھا سکتا تھا۔

ابن سیرین کو اس چنگل سے نجات پانے کے لئے ایک تدبیر سوجھی، وہ اٹھے اور اپنے بدن کو اس گھر میں موجود گندگی کی چیزوں سے اس طرح کثیف، آلودہ اور نفرت انگیز کر لیا کہ جب عورت نے یہ منظر دیکھا تو ان سے متنفر ہو گئی اور انہیں گھر سے باہر نکال دیا کہتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد ابن سیرین جو تعبیر خواب کے بارے میں بہت فراست نصیب ہوئی اور ان کی تعبیر سے متعلق کتابوں میں عجیب و غریب واقعات لکھے ہوئے ہیں کہ جو اس سلسلے میں ان کی گہری معلومات کی خبر دیتے ہیں۔

اس بنا پر ممکن ہے کہ یہ خاص علم و آگاہی حضرت یوسف (علیہ السلام) کو مصر کی بیوی کی انتہائی قوت جذب کے مقابلے میں نفس پر کنٹرول رکھنے کی بنا پر حاصل ہوئی ہو۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار تعبیر خواب بیان کرنے والوں کے مرکز تھے اور یوسف (علیہ السلام) جیسا ذہین نوجوان مصر کے دربار میں دوسرے کے تجربات سے آگاہیاور علم الہی سے فیض حاصل کرنے کے لئے روحانی طور پر تیار ہوسکتا تھا۔

بہرحال یہ نہ پہلا موقع ہے، نہ آخری کہ خدانے جہادِ نفس کے میدان میں سرکش ہوا وبوس پر کامیابی حاصل کرنے والے اپنے مخلص بندے کو علوم و دانش کی ایسی نعمات و عنایات سے نوازا ہو کہ جنہیں کسی مادی ترازو سے نہیں تولا جاسکتا، مشہور حدیث ہے:

العلم نور یقذفہ اللہ فی قلب من یشاء۔

علم نور ہے خدا جس کے دل میں چاہتا ہے ڈالتا ہے۔

یہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ یہ وہ علم و دانش نہیں جو استاد کے سامنے زانو تلمذتہ کر کے حاصل کی جائے یا کسی کو بغیر کسی حساب و کتاب کے مل جائے، یہ تو انعامات ہیں، جہاد بالذہن میں سبقت لے جانے والوں کے لئے۔

۳۔ ”بلوغ اشد“ کیابے؟

ہم کہہ چکے ہیں کہ ”اشد“ استحکام اور جسمانی و روحانی قوت کے معنی میں ہے اور ”بلوغ اشد“ اس مرحلے تک پہنچنے کے معنی میں ہے لیکن قرآن مجید میں اس کا اطلاق عمرِ انسانی کے مختلف مراحل پر ہوا ہے۔ بعض اوقات یہ ”سن بلوغ“ کے معنی میں آیا ہے، مثلاً ہم پڑھتے ہیں:

یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ سوائے حسن طریقے سے، جب تک کہ وہ حد بلوغ کو نہ پہنچ جائے (بنی اسرائیل: ۳۴)۔

کبھی چالیس سال کی عمر تک پہنچنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً:

یہاں تک کہ بلوغ اشد کے مرحلے تک پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا، (احقاف: ۱۵)۔

اور کبھی یہ لفظ بڑھاپے سے قبل کے مرحلے کے لئے آیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اس کے بعد خدا تمہیں عالم جنین سے بچوں کی شکل میں باہر نکالتا ہے پھر تم جسم و روح کے استحکام کے مرحلے میں پہنچ جاتے ہو اس کے بعد بڑھاپے کے مرحلے میں، (المومن: ۶۸)

تعبیرات کا یہ فرق ہوسکتا ہے اس بنا پر ہو کہ روح و جسم کے استحکام کے لئے انسان کئی مراحل طے کرتا ہے اور بلا شبہ اس میں سے ہر مرحلہ ایک حد بلوغ ہے اور چالیس سال کی عمر کے عام طور پر فکر و عقل پختہ ہوتی ہے دوسرا مرحلہ ہے اور اسی طرح انسان کی عمر ڈھلنے لگے اور وہ کمزوری کی طرف مائل ہو تو یہ ایک اور مرحلہ ہے لیکن

بہر حال زیر بحث آیت جسمانی و روحانی بلوغ کے بارے میں ہے کہ جو حضرت یوسف (علیہ السلام) میں جوانی کی ابتدا ہی میں پیدا ہو گیا تھا ، اس سلسلے میں فخر الدین رازی نے ایک بات کی ہے جو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

چاند کی گردش کی مدت (جس میں وہ محاق تک پہنچتا ہے) ۲۷ دن ہیں، جب اسے چار حصوں میں تقسیم کریں تو ہر حصہ ۷ دن کا بنتا ہے (جس سے ایک ہفتہ بنتا ہے)۔

اسی لئے دانشمندیوں نے بدن انسانی کے حالات کو سات سات سال پر مشتمل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلا دور اس وقت کا ہے جب انسان پیدا ہوتا ہے تو ضعیف و ناتواں ہوتا ہے جسم کے لحاظ سے بھی اور روہ کے لحاظ سے بھی، لیکن جب وہ سات سال کا ہوجاتا ہے تو اس میں فکر و ہوش اور قوت جسمانی کے آثار ظاہر ہوجاتے ہیں ۔ دوسرا مرحلہ سات سال مکمل ہونے بعد شروع ہوتا ہے اور انسان اپنا تکامل و ارتقاء جاری رکھتا ہے یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے چودہ سال پورے ہوجاتے ہیں ۔

تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے تو پندرہ سال کی عمر وہ جسمانی اور روحانی بلوغ کے مرحلے میں پہنچتا ہے ، اس میں جسمانی شہوت حرکت مینا آتی ہے اور (اور پندرہ سال کی تکمیل پر ) وہ مکات ہوجاتا ہے ، پھر وہ اپنا تکامل و ارتقاء جاری رکھتا ہے یہاں تک کہ تیسرا دور ختم ہوجاتا ہے ۔

چوتھا دور ختم ہونے اور ۲۸ سال کی مدت پوری ہونے پر جسمانی رشد و نمو کی مدت ختم ہوجاتی ہے اور انسان ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتا ہے ۔

یہ نیا مرحلہ توقف کا مرحلہ ہے اور یہی ”بلوغ اشد“ کا زمانہ ہے اور یہ حالت توقف پانچویں دور کے اختتام یعنی ۳۵ سال تک جاری رہتی ہے (اور اس کے بعد تنزل کا دور شروع کا دور شروع ہوجاتا ہے)۔(1)

مندرجہ بالا تقسیم اگرچہ ایک حد تک قابل قبول ہے لیکن دقت نظر سے دیکھا جائے تو درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اول تو مرحلہ بلوغ دوسرے دور کے اختتام پر نہیں ہے ، اسی طرح رشد جسمانی کی انتہا، جیسا کہ آج کل ماہرین فن کہتے ہیں ، ۵۲ سال ہے اور بعض روایات کے مطابق مکمل فکری بلوغ ۴۰ سال میں ہوتا ہے ۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر جو کچھ سطور بالا میں کہا گیا ہے ایک ایسا ہماگیر شمار قانون شمار نہیں ہوتا جو سب اشخاص پر صادق آئے ۔

۴۔ نعمات الہی انبیاء کو بھی حساب کتاب سے ملتی ہیں:

آخری نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ ضروری ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں جس وقت قرآن حضرت یوسف (علیہ السلام) علم و حکمت دینے کے بارے میں بات کرتا ہے مزید کہتا ہے : ”ہم اس طرح نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں“ یعنی نعمات الہی انبیاء تک جو بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں ملتیں اور ہر شخص کو اس کی نیکو کاری اور اچھائی کی مقدار کے مطابق فیض الہی کے بحر سے فیض ملتا ہے اور وہ اسی حساب سے اس سے بہرور ہوتا ہے ، جیسا کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کو ان تمام مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت کرنے کی وجہ سے وافر حصہ نصیب ہوا ۔

1۔ تفسیر فخر رازی، ج ۱۸، ص ۱۱۱۔

تفسیر نمونہ جلد 09

۲۳ وَرَأَوْنَتُهَا فِي بُيُوتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْبٌ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ۔

۲۴ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِرِّهِمْ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ۔

ترجمہ



۲۳۔ اور جس عورت کے گھر میں یوسف رہتا تھا اس نے اس سے اپنے مطلب کے حصول کی خواہش کی اور دروازے بند کر دئے اور کہا کہ اس چیز کی طرف جلدی آؤ جو تمہارے لئے مہیا ہے، (یوسف نے) کہا : میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں وہ (مصر) میرا صاحبِ نعمت ہے اور اس نے مجھے محترم جانا (تو کیا ممکن ہے کہ میں اس پر ظلم کروں اور اس سے خیانت کروں) یقیناً ضلالم کامیاب نہیں ہوں گے اور فلاح نہیں پائیں گے۔

۲۴۔ اس عورت نے تو یہ ارادہ کیا اور وہ بھی اگر پروردگار کی برہان نہ دیکھتا تو ارادہ کرتا، ہم نے ایسا اس لئے کیا تاکہ بدی اور فحشاء کو اس سے دور رکھیں کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

مصر کی بیوی کا عشقِ سوزاں

حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے خوبصورت، پرکشش اور ملکوتی چہرے سے نہ صرف مصر کو اپنی طرف کر لیا بلکہ کی بیوی بھی بہت جلدی آپ (علیہ السلام) کی گرویدہ ہو گئی، آپ (علیہ السلام) کا عشق اس کی روح کی گہراہوں میں اتر گیا، جوں جوں وقت گزرتا گیا اس عشق کی حدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا لیکن یوسف (علیہ السلام) کہ جو پاکیزہ اور پرہیزگار انسان تھے انہیں خدا کے علاوہ کسی کی بھی فکر و سوچ نہ تھی، ان کا دل فقط عشقِ الہی کا گرویدہ تھا۔ کچھ اور امور بھی شامل ہو گئے جنہوں نے کی بیوی کے عشقِ سوزاں کو اور بھڑکادیا۔

ایک تو اسے اولاد نہ ہونے کا ارمان تھا، دوسرا اس کی رنگینیوں سے بھر پور اشراف کی زندگی تھی، تیسرا داخلی زندگی میں اسے کوئی پریشانی اور مسئلہ نہ تھا جیسا کہ اشراف اور ناز و نعمت میں پلنے والوں کی زندگی ہوتی ہے اور چوتھا دربارِ نصر میں کسی قسم کی کوئی پابندی اور قدغن نہ تھا، ان حالات میں وہ عورت کہ جو ایمان و تقویٰ سے بھی بے بہرہ تھی شیطانی وسوسوں کی موجوں میں غوطہ زن ہو گئی، یہاں تک کہ اس نے ارادہ کر لیا کہ اپنے دل کا راز یوسف سے بیان کرے اور اپنے دل کی تمنا ان سے پورا کرنے کا تقاضا کرے۔

اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس نے ہر ذریعہ اور ہر طور طریقہ اختیار کیا اور بڑی خواہش کے ساتھ کوشش کی کہ ان کے دل کو متاثر کرے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جس عورت کے گھر میں یوسف تھے اس نے اپنی آرزو پورا کرنے کے لئے پیہم ان سے تقاضا کیا (وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ)۔

”راودتہ“ اصل میں ”مروڈہ“ کے مادہ سے چراگاہ کی تلاش کے معنی میں ہے، مثل مشہور ہے: الرائد لا يكدب قومہ۔

جو چراگاہ کی تلاش میں جاتا ہے وہ اپنی قوم قبیلے سے جھوٹ نہیں بولتا۔

یہ بھی اسی مذکورہ معنی کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح سرما سلائی کہ جس سے آنکھوں میں آرام آرام سے سرما لگاتے ہیں کو ”مروڈ“ (بروزن منبر) کہا جاتا ہے۔

بعد ازاں یہ لفظ ہر اس کام کے لئے بولا جانے لگا جو نرمی، ملائمت اور آرام سے کیا جائے۔

یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ زوجہ نے اپنا مقصود پانے کے لئے بڑی نرمی سے اور کسی قسم کی دھمکی کے بغیر ملائمت اور اظہارِ محبت سے یوسف (علیہ السلام) کو دعوت دی۔

آخر کار جو آخری راستہ اسے نظر آیا یہ تھا کہ ایک دن انہیں تنہا اپنی خلوت گاہ پہنسا نے اور ان کے جذبات ابھارنے کے لئے تمام وسائل سے کام لے، جاذب ترین لباس پہنے، بہترین بناؤ سنگار کرے بہت مہک دار عطر لگائے اور اس طرح سے آرائش و زیبائش کرے کی یوسف (علیہ السلام) جیسے قوی انسان کو گھٹھے ٹیکنے پر مجبور کر دے۔ قرآن کہتا ہے: اس نے دروازوں کو اچھی طرح بند کر لیا اور کہا اُو میں تمہارے لئے حاضر ہوں (وَعَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ)۔

لفظ ”غلقت“ مبالغہ کا معنی دیتا ہے اور نشاندہی کرتا ہے کہ اس نے تمام دروازے مضبوطی سے بند کئے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یوسف کو محل کی ایسی جگہ پر لے گئی کہ جہاں کمروں کے اندر کمرے بنے ہوئے تھے اور جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے اس نے سات دروازے بند کئے تاکہ یوسف (علیہ السلام) کے لئے فرار کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔

علاوہ ازیں شاید وہ اس طرح حضرت یوسف (علیہ السلام) کو سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ راز فاش ہونے سے پریشان نہ ہوں کیونکہ ان بند دروازوں کے ہوتے ہوئے کسی شخص کے بس میں نہیں کہ وہ اندر آسکے۔

جب حضرت یوسف (علیہ السلام) نے دیکھا کہ تمام حالات لغزش و گناہ کی حمایت میں ہیں اور ان کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا تو انہوں نے زلیخا کو بس یہ جواب دیا: میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں (قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ)۔

اس طرح حضرت یوسف (علیہ السلام) نے زوجہ کی خواہش کو قطعی و حتمی طور پر رد کر دیا اور اسے سمجھایا کہ وہ ہرگز اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے، آپ نے ضمناً اسے اور تمام افراد کو یہ حقیقت سمجھا دی کہ ایسے سخت اور بحرانی حالات میں شیطانی وسوسوں اور ان سے کہ جو شیطانی عادات و اخلاق رکھتے ہیں نجات کے لئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کی طرف پناہ لی جائے، وہ خدا کہ جس کے لئے خلوت اور بزم ایک سی ہے اور جس کے ارادے کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔

اس مختصر سے جملے سے انہوں نے عقیدے اور عمل کے لحاظ سے خدا کی وحدانیت کا اعتراف کیا، اس کے بعد مزید کہا کہ تمام چیزوں سے قطع نظر ”میں ایسی خواہش کے سامنے کس طرح سے سر تسلیم خم کر لوں جب کہ میں مصر کے گھر میں رہتا ہوں، اس کے دستر خوان پر ہوں اور اسنے مجھے بہت احترام سے رکھا ہوا ہے“ (إِنَّ رَبِّيَ أَحْسَنُ مَثْوَىٰ)، کیا یہ واضح خیانت نہ ہوگی، ”یقیناًستمگار فلاح نہیں پائیں گے (إِنَّهُ لَا يَفْلِحُ الظَّالِمُونَ)۔ اس جملے میں ”رب“ سے کیا مراد ہے؟

اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے، اکثر مفسرین نے مثلاً مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اور مولف المنار نے المنار میں ”رب“ کو اس کے وسیع معنی میں لیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد مصر ہے کہ جس نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کے احترام و اکرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور شروع ہی میں ”اکرمی مٹواہ“ کہہ کر یوسف ع کے لئے اپنی بیوی سے سفارش کی تھی۔

یہ گمان بالکل غلط ہے کہ لفظ ”رب“ اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا کیونکہ اس سورۃ میں متعدد مقامات پر لفظ ”رب“ کا اطلاق غیر خدا پر ہوا ہے، کبھی حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زبان سے اور کبھی کسی اور کی زبان سے، مثلاً قیدیوں کے خواب کے واقعہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس قیدی کو آپ (علیہ السلام) نے آزادی کی بشارت دی تھی اس سے کہا کہ اپنے رب ”مصر“ سے میرا ذکر کرنا۔ (آیت ۴۲)۔

نیز حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زبانی ہے کہ :

> فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ < (آیت: ۵۰)

جب فرعون مصر کا فرستادہ ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا اپنے رب (فرعون) کے واپس جاؤ اور اس سے تقاضا کرو کہ وہ تحقیق کرے کہ زنان مصر نے اپنے ہاتھ کیوں کاٹ لئے تھے۔ اس سورہ کہ آیہ ۴۱ میں حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زبانی اور آیہ ۴۲ میں قرآن کی زبانی لفظ ”رب“ کا اطلاق مالک اور صاحبِ نعمت پر ہوا ہے۔

لہذا آپ دیکھ رہے ہیں کہ زیر بحث آیت کے علاوہ اسی سورہ میں چار مرتبہ لفظ ”رب“ کا اطلاق غیر خدا پر ہوا ہے اگرچہ اسی سورہ میں اور قرآن کی دوسری سورتوں میں یہ لفظ بار بار پروردگار عالم کے لئے استعمال ہوا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ یہ ایک مشترک لفظ ہے اور اس کا اطلاق دونوں معانی پر ہوتا ہے۔

بہر حال بعض مفسرین نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ زیر بحث آیت ”انہ ربی احسن مٹواہ“، میں لفظ ”رب“ ”خدا“ کے معنی میں ہے کیونکہ لفظ ”اللہ“ کہ جو ساتھ ذکر ہوا ہے، سبب بنتا ہے کہ ضمیر اسی کی طرف لوٹے، لہذا اس صورت میں جملے کا معنی یوں ہوگا:

میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو میرا پروردگار ہے اور جس نے میرے مقام کو محترم قرار دیا ہے اور مجھے حاصل نعمت اسی کی طرف سے ہے۔

لیکن ”اکرمی مٹواہ“ کے لفظوں سے مصر کی سفارش کی طرف توجہ کی جائے تو اسی لفظ ”مٹواہ“ کا تکرار زیر بحث آیت میں ہوا ہے، اس سے پہلے معنی کو تقویت ملتی ہے، تورات کی فصل ۳۹ شماره ۸، ۹ اور ۱۰ میں یوں ہے:- اور اس کے بعد یہ ہوا کہ اس کے آقا کی بیوی نے اپنی آنکھیں یوسف پر مرکوز کر دیں اور کہنے لگی: میرے ساتھ سو جا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا اور اپنے آقا کی بیوی سے کہا: جو کچھ اس گھر میں میرے ساتھ ہو رہا ہے میرا آقا اس سے آگاہ نہیں ہے، اس نے اپنی تمام ملکیت میرے سپرد کر رکھی ہے، اس گھر میں مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہے اور میرے کسی چیز کے لینے میں اس نے کوئی مضائقہ نہیں سمجھا، سوائے تیرے کہ جو اس کی بیوی ہے لہذا میں یہ قباحتِ عظیم کیسے انجام دوں گا کہ جو خدا کا معصیت ہے۔

تورات کے یہ جملے بھی پہلے معنی کی تائید کرتے ہیں۔

یہاں یوسف اور زوجہ کا معاملہ نہایت باریک مرحلے اور انتہائی حساس کیفیت تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق قرآن بہت معنی خیز انداز میں گفتگو کرتا ہے: مصر کی بیوی نے اس کا قصد کیا اور اگر یوسف بھی برہان پروردگار نہ دیکھتا تو

ارادہ کرتا) وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّآى بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔

اس جملے کے معنی کے متعلق مفسرین میں بہت اختلاف ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل تین تفسیر میں کیا جاسکتا ہے:

۱۔ مصر کی بیوی نے یوسف سے اپنی آزادی کو پورا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اس کے لئے اپنی انتہا پہ کوشش کی، یوسف بھی نوخیز جوان تھے، ابھی تک ان کی شادی بھی نہ ہوئی تھی اور نہایت بیجان انگیز جنسی کیفیت ان کے سامنے تھی وہ بھی طبع بشری کے تقاضے سے ایسا ارادہ کر لیتے اگر برہان۔ پروردگار یعنی روح، ایمان و تقویٰ، تربیتِ نفس اور آخر کار مقام عصمت اس میں حائل نہ ہوتا۔

اس بنا پر مصر کی بیوی کے ”ہم“ (قصد) اور یوسف کے قصد کے درمیان فرق یہ تھا کہ یوسف کی طرف سے ایک شرط سے مشروط تھا کہ جو حاصل نہ ہوئی (یعنی برہان پروردگار کا عدم وجود) لیکن کی بیوی کی طرف سے مطلق تھا اور چونکہ وہ اس قسم کے مقام تقویٰ و پرہیزگاری کی حامل نہ تھی اس لئے اس نے یہ ارادہ کر لیا اور آخری مرحلے تک اس پر قائم رہی، یہاں تک کہ اس کی پیشانی پتھر سے ٹکرائی۔

ایسے جملوں کی نظیر عربی اور فارسی ادب میں بھی موجود ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ بے لگام افراندے فلاں کسان کے پھلوں کا باغ غارت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے، مین نے بھی اگر سالہا سال مکتبِ استاد میں تربیت حاصل نہ کی ہوتی تو اس قسم کا ارادہ کرتا۔

اس بناء حضرت یوسف (علیہ السلام) کا ارادہ ایک شرط سے مشروط تھا، جو حاصل نہ ہوئی اور یہ شرط نہ صرف حضرت یوسف (علیہ السلام) کے مقام عصمت اور تقویٰ کے منافی نہیں بلکہ اس بلند مقام کی وضاحت ہے۔

اس تفسیر کے مطابق حضرت یوسف (علیہ السلام) سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ارادہ گناہ کی نشانی بنے بلکہ انہوں نے دل میں بھی ایسا ارادہ نہیں کیا۔

لہذا بعض ایسی روایات کہ جن میں ہے کہ یوسف (علیہ السلام) مصر کی بیوی سے خواہش پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے یہاں تک کہ لباس بھی اتار لیا تھا اور ایسی ہی دوسری عبارتیں کہ جنہیں نقل کرتے ہوئے شرم آتی ہے، سب بے بنیاد، مجہول اور جعلی ہیں اور ایسے اعمال آلودہ، بے لگام، ناپاک اور غلط افراد سے صادر ہوتے ہیں حضرت یوسف (علیہ السلام) اپنی پاکیزگی روح اور بلند مقام تقویٰ کے حامل تھے انہیں ایسے کاموں سے کس طرح متہم کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک حدیث میں یہی تفسیر بہت ہی جچی تلی اور مختصر عبارت میں بیان ہوئی ہے، حدیث کچھ یوں ہے:

عباسی خلیفہ مامون امام (علیہ السلام) سے پوچھتا ہے: کیا آپ حضرات نہیں کہتے کہ انبیاء معصوم ہیں۔

فرمایا: جی ہاں۔

اس نے کہا: پھر قرآن کی اس آیت کی تفسیر کیا ہے۔ ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّآى بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔“

امام نے فرمایا:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ و لَوْلَا اَنْ رَّآى بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَہم بھا کماہمت بہ لکن کان معصوما والمعصوم لا یہم بذنب ولا یاتیہ۔۔۔

یعنی۔ زوجہ نے یوسف (علیہ السلام) سے اپنی خواہش کی تکمیل کا ارادہ کیا اور یوسف بھی اگر اپنے پروردگار کی برہان نہ دیکھتے تو مصر کی بیوی کی طرح ارادہ کرتے لیکن وہ تو معصوم تھے اور معصوم کبھی بھی گناہ کا ارادہ نہیں کرتا اور گناہ کے پیچھے نہیں جاتا۔

مامون کو اس جواب پر بہت لطف آیا، اس نے کہا:

اللہ درک یا ابالحسن

آفرین آپ پر اے ابالحسن!

۲۔ مصر کی بیوی اور یوسف (علیہ السلام) میں سے کسی کا ارادہ بھی جنسی خواہش سے مربوط نہ تھا بلکہ حملہ کرنے اور ایک دوسرے کو مار پیٹنے کا ارادہ تھا۔ زوجہ چونکہ عشق میں شکست خوردہ تھی اس لئے اس میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور یوسف (علیہ السلام) اپنا دفاع کرنا چاہتے تھے اور اس عورت کے سامنے سر تسلیم خم نہینکرنا چاہتے تھے۔ اس امر کے لئے جو قرائن ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ زوجہ نے مطلب براری کا ارادہ تو بہت پہلے سے کیا ہوا تھا اور اس کے لئے اس نے تمام لوازمات پورے کر رکھے تھے لہذا اس بات کا کوئی موقع نہیں تھا کہ قرآن کہے کہ اس نے اس کام کا ارادہ کیا کیونکہ ارادے کا موقع نہ تھا۔

دوسرا یہ کہ اس شکست کے بعد سختی اور انتقام جوئی کی کیفیت پیدا ہونا فطری ہے کیونکہ یوسف (علیہ السلام) سے نرمی اور پیار محبت کے لئے جو کچھ اس کے بس میں تھا وہ کر چکی تھی اور چونکہ اس طرح ان پر اثر انداز نہیں ہوسکی تھی اس لئے اس نے دوسرا ہتھیار استعمال کرنا چاہا اور یہ سختی کا ہتھیار تھا۔

تیسرا یہ کہ آیت میں: ”كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَاءَ“، ہم نے بدی اور فحشاء دونوں کو یوسف سے دُور کر دیا)

”فحشاء“ کا معنی عہی بے حیائی اور اُلودہ ہونا ہے، اور ”سوء“ مصر کے تشدد سے نجات ہے۔ لیکن یوسف (علیہ السلام) نے چونکہ برہان پروردگار کو دیکھ لیا تھا لہذا اپنے آپ کو اس عورت سے دست وگریبان ہونے سے بچایا تا کہ کہیں وہ حملہ کر کے انہیں زخمی نہ کر دے اور یہ پھر ان کے ارادہ تجاوز کی دلیل بن جائے لہذا انہوں نے اس بات کو ترجیح دی کہ اس جگہ سے دُور چلے جائیں اور وہ دروازے کی طرف بھاگے۔

۳۔ اس میں شک نہیں کہ یوسف (علیہ السلام) جوان تھے، جوانی کے تمام احساسات اور جذبات بھی ان میں موجود تھے اگر چہ ان کے قوی جذبات ان کی عقل اور ایمان کے کے ماتحت تھے لیکن فطری بات یہ کہ جب ایسا انسان کسی انتہائی بیجان انگیز موقع سے دوچار ہوتو اس کے اندر ایک طوفان پیدا ہوتا ہے، جذبات اور عقل ایک دوسرے کے خلاف جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جذبات کو بھڑکانے والے عوامل کی موجیں جس قدر زیادہ قوی ہوں گی اس کا پلڑا بھاری ہوگا، یہاں تک کہ ہوسکتا ہے کہ ایک انتہائی مختصر لمحے کے لئے ان کی شدت اتنی زیادہ ہو کہ قدم تھوڑا سا آگے پڑے تو بولناک لغزش کا سامنا کرنا پڑے۔

اچانک ایمان و عقل کی قوت بیجان میں آجاتی ہے اور اصلاح کے مطابق آمادہ جنگ ہوجاتی ہے اور مخالف فوج کو شکست دے دیتی ہے اور جذبات کی قوت کے جو قعرِ مذلت کے کنارے پہنچ جاتی ہے اسے پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ یہ مختصر حساس اور بحرانی لحظہ کہ جو اطمینان و سکون کے دو زمانوں کے درمیان تھا، قرآن نے اس کی تصویر کشی کی ہے، اس بناء پر ”وہم بہا لولا ان را برہان رہ“ سے مراد ہے کہ جذبات اور عقل کی کش مکش میں یوسف (علیہ السلام) قعرِ مذلت وگناہ کے لبوں تک آپہنچے تھے کہ اچانک ایمان و عقل کی بہت زیادہ قوت جمع ہوگئی اور اس نے جذبات کے طوفان کو شکست دے دیاب کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یوسف (علیہ السلام) اگر اس پھسلن اور گرنے کی جگہ سے بچ گئے تو یہ کوئی معمولی کام تھا کیونکہ گناہ اور بیجان کے عوامل ان کے وجود سے بہت کمزور تھے، نہیں ایسا برگز نہیں بلکہ آپ (علیہ السلام) اپنی پاکیزگی کی حفاظت کے لئے اس حساس ترین لمحے میں جہاد بالذات کے انتہائی شدید معرکے سے گزرے۔

برہان پروردگار سے کیا مراد ہے؟

”برہان“ در اصل ”برہ“ کا مصدر ہے کہ جس کا معنی ہے ”سفید ہونا“ بعد ازاں ہر محکم و قوی دلیل کو برہان کہا جانے لگا تو مقصود واضح ہونے کا سبب بنے، اس بناء پر برہان الہی کہ جو نجاتِ یوسف (علیہ السلام) کا سبب بنی ایک قسم کی واضح خدائی دلیل ہے، اس کے بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ علم و ایمان، انسانی تربیت اور برجستہ و عمدہ صفات۔

۲۔ زنا کے حکم تحریمی کے بارے میں آگاہی و علم۔

۳۔ مقام نبوت و گناہ سے معصوم ہونا۔

۴۔ ایک قسم کی الہی امداد و نصرت جو ان کے نزدیک نیک اعمال کی وجہ سے اس حساس لمحے میں انہیں میسر آئی۔

۵۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ایک بُت تھا کہ جو زوجہ (علیہ السلام) مصر کا معبود شمار ہوتا تھا، اچانک اس عورت کی نگاہ اس بُت پر پڑی، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے وہ گھور رہا ہے اور اس کی خیانت آمیز حرکات کو غیض و غضب کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے، وہ اٹھی اور اس بُت پر پردہ ڈال دیا، یوسف (علیہ السلام) نے یہ منظر دیکھا تو ان کے دل میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، وہ لرز گئے اور کہنے لگے تُو تو اس بے عقل، بے شعور، حس و تشخیص سے عاری بُت سے شرم کرتی ہے، کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے پروردگار سے شرم نہ کروں کہ جو تمام چیزوں کو جانتا ہے اور تمام مکفی امور اور خلوت گاہوں سے باخبر ہے۔

اس احساس نے یوسف (علیہ السلام) یوسف (علیہ السلام) کو ایک نئی توانائی اور قوت بخشی اور شدید جنگ کہ جو ان کی روح کہ گہرائیوں میں جذبات اور عقل کے درمیان جاری تھی اس میں ان کی مدد کی تاکہ وہ جذبات کی سرکش موجوں کو پیچھے دھکیل سکیں۔ (۱)

اس کے باوجود کوئی مانع نہیں کہ یہ سب معانی یکجامراد ہوں کیونکہ ”برہان“ کے وسیع مفہوم میں سب موجود ہیں اور قرآنی آیات و روایات میں لفظ ”برہان“ کا مندرجہ بالا اکثر معانی پر اطلاق ہوا ہے۔

باقی رہیں وہ بے بنیاد روایات جو مفسرین نے نقل کی ہیں کہ جن کے مطابق حضرت یوسف (علیہ السلام) نے گناہ کا ارادہ کر لیا تھا کہ اچانک حالتِ مکاشفہ میں جبرائیل یا حضرت یعقوب (علیہ السلام) کو دیکھا کہ جو اپنی انگلی دانتوں سے کاٹ رہے تھے انہیں دیکھا تو یوسف (علیہ السلام) پیچھے ہٹ گئے۔ ایسی روایات کی کوئی معتبر سند نہیں ہے، یہ اسرائیلیات

کی طرح ہیں اور کوتاہ فکر انسانوں کے دماغوں کی پیداوار ہیں جنہوں نے مقام انبیاء کو بالکل نہیں سمجھا۔  
اب ہم باقی آیت کی تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہیں، قرآن مجید کہتا ہے: ہم نے یوسف کو اپنی ایسی برہان پیش کی تاکہ  
بدی اور فحشاء کو اس سے دور کریں (كَذَلِك لِنُصْرَفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ) ، کیونکہ وہ ہمارے برگزیدہ اور مخلص بندوں  
میں سے تھا (إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ہم نے جو اس کے لئے غیبی اور روحانی امداد بھیجی تاکہ وہ بدی اور گناہ سے رہائی پائے تو یہ  
بے دلیل نہیں تھا، وہ ایک ایسا بندہ تھا جس نے اپنے آپ کو آگاہی، ایمان، پرہیزگاری اور پاکیزہ عمل سے آراستہ کیا ہوا تھا  
اور اس کا قلب وروح شرک کی تاریکیوں سے پاک اور خالص تھا، اسی لئے وہ ایسی خدائی امداد کی اہلیت و لیاقت رکھتا  
تھا، اس دلیل کا ذکر نساندہی کرتا ہے کہ ایسی کدائی امداد جو طغیانی و بحرانی لمحات میں یوسف (علیہ السلام) جیسے انبیاء  
کو میسر آتی تھی ان سے مخصوص نہ تھی بلکہ جو شخص بھی خدا کے خالص بندوں اور ”عباد اللہ المخلصین“ کے امرے  
میں آتا ہو ایسی نعمات کے لائق ہے۔

.....

۱۔ نور الثقلین، ج ۲، ص ۴۲۲ و تفسیر قرطبی، ص ۳۳۹۸، ج ۵۔

چند اہم نکات

1۔ نفس سے جہاد:

ہم جانتے ہیں کہ اسلام میں افضل ترین جہاد جہاد با نفس ہے جیسے پیغمبر اکرم نے اپنی ایک مشہور حدیث میں ”جہاد اکبر“  
کا نام دیا ہے یعنی بڑے دشمن سے جہاد کہ جسے جہاد اصغر کا نام دیا گیا ہے میں اصولی طور پر اس وقت تک کامیابی  
ممکن نہیں جب تک کہ حقیقی معنی میں انسان جہاد اکبر کے مرحلے سے نہ گزرے۔

قرآن مجید جہاد اکبر کے میدان میں انبیاء اور دیگر اولیائے خدا سے مربوط بہت سے مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے،  
ان میں سے نہایت اہم حضرت یوسف (علیہ السلام) کی سرگزشت اور زوجہ مصر کے عشق سوازاں کی داستان میں ہے،  
اگرچہ اس کے تمام پہلوؤں کی قرآن نے اختصار کے سبب وضاحت نہیں کی تاہم ایک مختصر جملے ”وہم بہا لولا ان را  
برہان رہے“ کے ذریعے اس طوفان کی شدت کو بیان کیا ہے۔

اس میدان مقابلہ سے حضرت یوسف (علیہ السلام) رو سفید نکلے، ان کی کامیابی کی تین وجوہ ہیں:  
پہلی یہ کہ آپ (علیہ السلام) نے اپنے تئیں خدا کے سپرد کیا اور اسکے لطف و کرم کی پناہ لی (قال معاذ اللہ)۔  
دوسری یہ کہ آپ ع نے مصر کے احسانات کی طرف توجہ کی، جس کے گھر میں آپ (علیہ السلام) زندگی بسر کر رہے  
تھے۔

یا یہ کہ خدا کی لامتناہی نعمات کی طرف توجہ کی کہ جس نے انہیں وحشتناک کنویں کی تہ سے نکال کر امن وامان  
وسکون و آرام کے ماحول میں پہنچا دیا، اس امر نے آپ (علیہ السلام) کو اس بات پر ابھارا کہ اپنے گزشتہ اور آئندہ پر زیادہ  
غور و فکر کریں اور اپنے آپ کو زود گزر طوفانوں کے حوالے نہ کریں۔

تیسری یہ کہ یوسف (علیہ السلام) کی کود سازی و بندگی کہ جس میں خلوص شامل تھا اور جو ”انہ من عبادنا المخلصین“  
سے معلوم ہوتی ہے نے آپ (علیہ السلام) کو قوت بخشی کہ اس عظیم میدان میں کئی گنا وسوسوں کے مقابلے میں کہ جو  
اندر اور باہر سے آپ (علیہ السلام) پر حملہ آور ہوتے تھے گھٹنے نہ ٹیک دیں۔  
اور یہ درس ہے تمام آزاد انسانوں کے لئے کہ جو جہاد با نفس کے میدان میں اس خطرناک دشمن پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے  
ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دعائے صباح میں بہت دلکش پیرائے میں فرماتے ہیں:  
وان خذلنی نصرک عند محاربة النفس والشيطان فقد وکلنی خذ لانک الی حیث النصب والحرمان۔  
بار الہا! اگر نفس اور شیطان سے مقابلے کے وقت ہم تیری نصرت سے محروم رہ جائیں تو یہ محرومیت ہمیں رنج و حرمان  
کے سپرد کر دے گی اور ہماری نجات کی امید نہیں رہے گی۔  
ایک حدیث میں ہے:

ان النبی (ص) بعثت سریة فلما رجعوا قال مرحباً بقوم قضاوا الجهاد الاصغر وبقی علیہم الجهاد الاکبر، فقیل یا رسول اللہ مال الجهاد  
الاکبر، قال جہاد النفس۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ مسلمانوں کو ایک جنگ پر بھیجا، جب وہ (تھکے، ماندے اور مجروح بدن) واپس آئے تو فرمایا: آفرین ہے ان لوگوں پر کہ جنہوں نے جہادِ اصغر انجام دیا ہے لیکن اب جہادِ اکبر کی ذمہ داری ان پر باقی ہے۔

انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ جہادِ اکبر کیا ہے؟

فرمایا: نفس کے ساتھ جہاد۔ (1)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:  
المجاهد من جاهد نفسه۔

حقیقی مجاہد وہ ہے جو نفس کی سرکش خواہشوں کے خلاف جہاد کرے۔ (2)

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

من ملک نفسه اذا رغب، واذا رهب، واذا اشتهى، واذا غضب، واذا رضى، حرم الله جسده على النار۔

جو شخص چند حالت میں خود پر کنٹرول رکھے۔

جب اسے کسی کی طرف رغبت ہو، جب خوف میں ہو، جب شعلہ شہوت بھڑکتا ہو، جب عالمِ غیض و غضب میں ہو اور جب

کسی پر خوش ہو۔ (اپنے ارادے سے ان جذبات کو اس طرح کنٹرول میں رکھے کہ یہ اسے حکمِ خدا سے منحرف نہ

کر دیں) تو خدا اس کا بدن جہنم پر حرام کر دے گا۔ (3)

.....

1-وسائل الشیعیہ، ج ۱۱، ص ۱۲۲۔

2-وسائل الشیعیہ، ج ۱۱، ص ۱۲۴۔

3-وسائل الشیعیہ، ج ۱۱، ص ۱۲۳۔

۲۔ اخلاص کی جزا

جیسا کہ مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید اس خطرناک گرداب کہ جو زوجہ مصر نے پیدا کر دیا، سے یوسف (علیہ السلام) کی نجات کی نسبتِ خدا کی طرف دیتا ہے اور کہتا ہے:

ہم نے ”سوء“ اور ”فحشاء“ کو یوسف سے ڈور کر دیا۔

لیکن۔ بعد کا جملہ کہ جس میں کہا گیا ہے کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا، کی طرف توجہ کرنے سے یہ حقیقت

واضح ہوتی ہے کہ ان بحرانی لمحات میں خدا اپنے مخلص بندوں کو تنہا نہیں چھوڑتا اور ان کے لئے اپنی معنوی امداد

سے دریغ نہیں کرتا بلکہ اپنے غیبی الطاف و امداد سے کہ جن کی تعریف و توصیف کسی طرح بھی ممکن نہیں اپنے بندوں

کی حفاظت کرتا ہے اور یہ درحقیقت ایسی جزا ہے کہ جو خدائے بزرگ و برتر ایسے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ یہ دراصل

پاکیزگی، تقویٰ اور اخلاص کی جزا ہے۔

ضمنی طور پر اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں حضرت یوسف (علیہ السلام) کا ذکر

”مُخْلِصٌ“ (بروزن ”مطلق“) بصورتِ اسمِ مفعول ہوا ہے یعنی ”خالص کیا ہوا“ نہ کہ بصورتِ ”مُخْلِصٌ“ (بروزن ”مُحْسِنٌ“)

اسمِ فاعل کی شکل میں جس کا معنی ہے ”خالص کرنے والا“۔

غور و خوض سے معلوم ہوتا ہے کہ ”مُخْلِصٌ“ (لام کے نیچے زیر کی صورت میں) زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے

کہ جہانانسان تکامل و ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں ہو اور ابھی خود سازی کے عمل سے گزر رہا ہو، جیسا کہ قرآن حکیم

میں ہے:

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْأُفُكِ دَعَا اللَّهُ مَخْلَصِينَ لُهُ الدِّينِ

جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں خدا کو خلوص سے پکارتے ہیں۔ (عنکبوت: ۶۵)

اسی طرح ایک اور آیت میں ہے:

وَمَا أَمْرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مَخْلَصِينَ لَهُ الدِّينِ۔

انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ خدا کی خلوص کے ساتھ پرستش کریں۔ (بینة: ۵)

لیکن ”مُخْلِصٌ“ (لام پر زیر کی صورت میں) اعلیٰ مرحلے کے لئے بولا جاتا ہے کہ جو ایک مدت تک جہادِ بالنفس سے

حاصل ہوتا ہے وہی مرحلہ کہ جب شیطان انسان میں اپنے وسوسے پیدا کرنے سے مایوس ہوجاتا ہے، درحقیقت اس

مرحلے میں خدا کی طرف سے بیمہ ہوجاتا ہے۔

ارشاد الہی ہے:  
 قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغَوِّيَهُمْ أَجْمَعِينَ، إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ۔  
 شیطان نے کہا: تیری عزت کی قسم! ان سب کو گمراہ کروں گا مگر تیرے مخلص بندوں کو (۸۲-۸۳)۔  
 یوسف (علیہ السلام) اس مرحلہ پر پہنچے ہوئے تھے کہ اس بحرانی حالت میں انہوں نے پہاڑ کی طرح استقامت دکھائی اور  
 کوشش کرنا چاہیے کہ انسان اس مرحلے تک پہنچ جائے۔

### ۳۔ متین و پاکیزہ کلام

قرآن کے عجیب و غریب پہلوؤں میں سے ایک کہ جو اعجاز کی ایک نشانی بھی ہے، یہ ہے کہ اس میں کوئی چھپنے والی  
 ، رکبک ، ناموزوں، متبذل اور عفت و پاکیزگی سے عاری تعبیر نہیں ہے اور کسی عام آن پڑھ اور جہالت کے ماحول میں  
 پرورش پانے والے کا کلام برگز اس طرز کا نہیں ہوسکتا، کیونکہ ہر شخص کی باتیں اس کے افکار اور ماحول سے ہم  
 رنگ ہوتی ہیں۔

قرآن کی بیان کردہ تمام داستانوں میں ایک حقیقی عشقیہ داستان موجود ہے اور یہ حضرت یوسف (علیہ السلام) اور مصر  
 کی بیوی کی داستان ہے۔

یہ ایک خوبصورت اور ہوس آلودہ عورت کے ایک زیرک اور پاک دل نوجوان سے شعلہ ور عشق کی داستان ہے۔  
 کہنے والے اور لکھنے والے جب ایسے مناظر تک پہنچتے ہیں تو وہ مجبور ہوجاتے ہیں کہ یا تو بیرو اور اس واقعے کے  
 اصلی مناظر کی تصویر کشی کے لئے قلم کو کھلا چھوڑ دیں اور با زبان اصطلاح حق سخن ادا کر دیں اگرچہ اس میں ہزارہا  
 تحریک آمیز، چھپنے والے اور غیر اخلاقی لفظ آجائیں۔

یا وہ مجبور ہوجاتے ہیں کہ زبان و قلم کی نزاکت و عفت کی حفاظت کے لئے کچھ مناظر کو پردہ ابہام میں لپیٹ دیں اور  
 سامعین و قارئین کو سربستہ طور پر بات بتائیں۔

کہنے والا اور لکھنے والا کتنی بھی مہارت رکھتا ہو اکثر اوقات ان میں سے کسی ایک مشکل سے دوچار ہوجاتا ہے۔  
 کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ ایک آن پڑھ شخص ایسے شور انگیز عشق کے نہایت احساس لمحات کی دقیق اور مکمل  
 تصویر کشی بھی کرے لیکن بغیر اس کے کہ اس میں معمولی سی تحریک آمیز و عفت سے عاری تعبیر استعمال ہوں۔  
 لیکن قرآن اس داستان کے حساس ترین مناظر کی تصویر کشی شگفتہ انداز میں متانت و عفت کے ساتھ کرتا ہے، بغیر اس  
 کے کہ اس میں کوئی واقعہ چھوٹ جائے اور اظہار عجز ہو، جب کہ تمام اصول اخلاق و پاکیزگی بیان بھی محفوظ ہو۔  
 ہم جانتے ہیں کہ اس داستان کے تمام مناظر میں سے زیادہ حساس ”خلوت گاہ و عشق“ کا ماجرا ہے جیسے زوجہ مصر کی  
 بیقراری اور ہواہوس نے وجود بخشا۔

قرآن اس واقعے کی وضاحت میں تمام کہنے کی باتیں بھی کہہ گیا ہے لیکن پاکیزگی اور عفت کے اصول سے ہٹ کر اس  
 نے تھوڑی سی بات بھی نہیں کی، قرآن اس طرح سے کہتا ہے:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْت لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ۔

جس خاتون کے گھر یوسف تھے، اس نے ان سے تقاضا اور اظہار تمنا کی اور تمام دروازے بند کر لئے اور کہنے لگی  
 :جلدی او، اس کی طرف جو و تمہارے خاطر مہیا ہے، انہونے کہا : میں اس کام سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، (مصر) بزرگ  
 اور میرا مالک ہے، اس نے مجھے بڑی عزت سے رکھا ہے، یقیناً ظالم (اور آلودہ دامن افراد) فلاح نہیں پائیں گے  
 (یوسف: ۲۳)۔

اس آیت میں یہ الفاظ قابل غور ہیں :

۱۔ لفظ ”وارد“ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی شخص دوسرے سے کوئی چیز بڑی محبت اور نرمی سے مانگے (لیکن  
 زوجہ مصر یوسف سے جو کچھ طلب کرتی تھی) چونکہ یہاں واضح تھی لہذا قرآن نے اسی واضح کنایہ پر کفایت کی ہے  
 اور نام نہیں لیا۔

۲۔ یہاں قرآن لفظ ”امراة ال“ (یعنی - مصر کی بیوی) تک استعمال نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے ”الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا“ (وہ خاتون کہ  
 یوسف جس کے گھر میں رہتا تھا) یہ اس لئے ہے تاکہ کلام پردہ پوشی اور عفت بیان سے زیادہ قریب ہو۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے قرآن نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی حس حق شناسی کو بھی مجسم کیا ہے، یعنی یوسف  
 (علیہ السلام) نے تمام مشکلات کے باوجود اس کے سامنے سرتسلیم خم نہ کیا جس کے پنجے میں آپ کی زندگی تھی۔

۳۔ ”غَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ“ کہ جو مبالغے کا معنی دیتا ہے، دلالت کرتا ہے کہ تمام دروازے مضبوطی اور سختی سے بند کر  
 دے اور یہ اس بیجان انگیز منظر کی تصویر کشی ہے۔

۴۔ ”وَقَالَتْ هَيْبَتُ لَيْك“ اس کا معنی ہے ”جلدی او اس کی طرف جو تمہارے لئے مہیا ہے“ یا ”جاؤ کہ میں تمہارے اختیار میں ہوں۔“

اس جملے کے وصال یوسف سے بمکنار ہونے کے لئے زوجہ مصر کی آخری بات پیش کی گئی ہے لیکن ایک وزنی پرمتانت اور معنی خیز انداز میں بغیر کسی تحریک آمیز اور بد آموزی کے۔

۵۔ ”مَعَادَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ“ یہ جملہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اس حسین ساحرہ کی دعوت کے جواب میں کہا اکثر مفسرین کے بقول اس کا معنی ہے: ”میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں، تیرا شوہر مصر میرا بزرگ اور مالک ہے اور وہ میرا احترام کرتا ہے اور مجھ پر اعتماد کرتا ہے، میں اس سے کسی طرح کی خیانت کروں، یہ کام خیانت بھی اور ظلم بھی“

اس طرح قرآن حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ انہوں نے مصر کی بیوی کے احساسات بیدار کرنے کی کوشش کی۔

۶۔ ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٍ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهٍ“ ایک طرف قرآن اس خلوت گاہ عشق کے انتہائی حساس مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ کیفیت اس قدر تحریک آمیز تھی کہ اگر حضرت یوسف (علیہ السلام) عقل، ایمان یا عصمت کے بلند مقام پر نہ ہوتے تو گرفتار ہوجاتے، دوسری طرف آیت کے اس حصے میں قرآن طغیان گر شہوت کے دیو پر حضرت یوسف (علیہ السلام) کی آخری کامیابی پر ایک خوبصورت انداز میں خرات تحسین پیش کر رہا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ لفظ ”ہم“ استعمال ہوا ہے یعنی مصر کی بیوی نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا اور یوسف (علیہ السلام) نے بھی اگر برہان پروردگار نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی ارادہ کرتے۔

کیا کوئی لفظ یہاں قصد و ارادہ سے بڑھ کر متانت آمیز استعمال کیا جاسکتا ہے؟

#### تفسیر نمونہ جلد 09

۲۵ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَالْأَفْعِيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

۲۶ قَالَ هِيَ رَاوَدْتَنِي عَنْ نَفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ۔

۲۷ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ۔

۲۸ قَلَمًا رَأَى قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ۔

۲۹ يَوْسُفُ أَعْرَضَ عَنْ هَذَا وَاسْتَغْفِرِي لِذُنُوبِكِ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ۔

ترجمہ

۲۵۔ اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے (جبکہ زوجہ یوسف کا تعاقب کر رہی تھی) اور پیچھے سے اس کی قمیص پھاڑ دی اور اس دوران اس عورت کے سردار کو ان دونوں نے دروازے پر پایا، اس عورت نے کہا: جو تیرے اہل سے خیانت کا ارادہ کرے اس کی سزا سوائے زندان یا دردناک عذاب کے کیا ہوگی۔

۲۶۔ (یوسف) نے کہا: اس نے مجھے اصرار سے اپنی طرف دعوت دی اور اس موقع پر اس عورت کے خاندان میں سے ایک شاہد نے گواہی دی کہ اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو عورت سچ کہتی ہے اور یہ جھوٹوں میں سے ہے۔

۲۷۔ اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو پھر وہ عورت جھوٹ بولتی ہے اور یہ سچوں میں سے ہے۔

۲۸۔ جب (مصر نے) دیکھا تو اس (یوسف) کی قمیص پیچھے سے پھٹی تھی تو اس نے کہا کہ یہ تمہارے مکر و فریب میں سے ہے اور میں جانتا ہوں کہ عورتوں کا مکر و فریب عظیم ہوتا ہے۔

۲۹۔ یوسف! اس امر سے صرف نظر کرو اور (اے عورت!) تو بھی اپنے گناہ پر استغفار کر کہ تو خطا کاروں میں سی تھی۔



زوجہ مصر کی رسوائی

یوسف (علیہ السلام) کی انتہائی استقامت نے زوجہ کو تقریباً مایوس کر دیا، یوسف (علیہ السلام) اسی معرکے میں اس ناز وادا والی اور سرکش بوا و بوس والی عورت کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ اس لغزش گاہ میں مزید ٹھہرنا خطرناک ہے، انہوں نے اس محل سے نکل جانے کا ارادہ کیا، لہذا وہ تیزی سے قصر کے دروازے کی طرف بھاگے تاکہ دروازہ کھول کر نکل جائیں، زوجہ بھی بے اعتناء نہ رہی وہ بھی یوسف (علیہ السلام) کے پیچھے دروازے کی طرف بھاگی تاکہ یوسف (علیہ السلام) کو باہر نکلنے سے روکے، اس نے اس مقصد کے لئے یوسف کی قمیص پیچھے سے پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھنچا اس طرح سے کہ قمیص پیچھے سے لمبائی کے رخ پھٹ گئی) وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ۔

”استباق“ لغت میں دو یا چند افراد کے ایک دوسرے کے سبقت لینے کے معنی میں ہے اور ”قد“ لمبائی کے رخ پھٹنے کے معنی میں ہے جیسا کہ ”قط“ عرض میں پھٹ جانے کے معنی میں، اس لئے حدیث میں ہے : کانت ضربات علی بن ابی طالب (علیہ السلام) ابکاراً کان اذا اعتلى قد ، واذا اعترض قطعاً علی ابن ابی طالب (علیہ السلام) کی ضربیں اپنی نوع میں نئی اور انوکھی تھیں، جب اوپر سے ضرب لگاتے تو نیچے چیر دیتے اور جب عرض میں ضرب لگاتے تو دو نیم کر دیتے۔ (۱)

لیکن جس طرح ہوا یوسف دروازے تک پہنچ گئے اور دروازہ کھول لیا، اچانک مصر کو دروازے پیچھے دیکھا، جس طرح قرآن کہتا ہے: ان دونوں نے اس عورت کے آقا کو دروازے پر پایا (وَالْفَأْيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ)۔ ”الفیت“ ”الفاء“ کے مادہ سے اچانک پانے کے معنی میں ہے اور شوہر کو ”سید“ سے تعبیر کرنا جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے اہل مصر کے رواج کے مطابق تھا، وہاں کی عورتیں اپنے شوہر کو ”سید“ کہہ کر مخاطب کرتی ہیں، آج کی فارسی زبان میں بھی عورتیں اپنے شوہر کا ”آقا“ سے تعبیر کرتی ہیں۔

اب جب کہ زوجہ نے ایک طرف اپنے تئیں رسوائی کے آستانے پر دیکھا اور دوسری طرف انتقام کی آگ اس کی روح میں بھڑک اٹھی تو پہلی بات جو اسے سوچھی یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو حق بجانب ظاہر کرتے ہوئے اپنے شوہر کی طرف رخ کیا اور یوسف پر تہمت لگائی: اس نے پکار کر کہا جو شخص تیری اہلیہ سے خیانت کا ارادہ کرے اس کی سزا زندان یا دردناک عذاب کے سوا کیا ہوسکتی ہے (قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس خیانت کار عورت نے جب تک اپنے آپ کو رسوائی کے آستانے پر نہیں دیکھا تھا، بھول چکی تھی کہ وہ مصر کی بیوی ہے لیکن اس موقع پر اس نے ”اہلک“ (تیری گھر والی) کا لفظ استعمال کر کے کی غیرت کو ابھارا کہ میں تیرے ساتھ مخصوص ہوں لہذا کسی دوسرے کو نہیں چاہیے کہ میری طرف حرص کی آنکھ سے دیکھے، یہ گفتگو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے کے فرعون مصر کی گفتگو سے مختلف نہیں کہ وہ تخت حکومت پر بھروسے کے وقت کہتا تھا:

الیس لی ملک مصر۔

کیا مصر کی سلطنت کا میں مالک نہیں ہوں (زخرف: ۵۱)۔

لیکن جب اس نے دیکھا کہ تخت و تاج خطرے میں ہے اور میرے اقبال کا ستارا ٹوب رہا ہے تو کہا: یریدان ان یخرجکم من ارضکم۔

یہ دونوں بھائی (موسیٰ و ہارون) چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے نکال دیں۔ (طہ: ۶۳)

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ مصر کی بیوی نے یہ برگز نہیں کہا کہ یوسف میرے بارے میں برا ارادہ رکھتا تھا بلکہ مصر سے اس کی سزا کے بارے میںبات کی، اس طرح سے کہ اصل مسئلہ مسلم ہے اور بات صرف اس کی سزا کے بارے میں ہے، ایسے لمحے میں جب وہ عورت اپنے آپ کو بھول چکی تھی اس کی یہ جچی تلی گفتگو اس کی انتہائی حیلہ گری کی نشانی ہے۔ (2)

پھر یہ کہ پہلے وہ قید خانے کے بارے میں بات کرتی ہے اور بعد میں گویا وہ قید پر بھی مطمئن نہیں ہے ایک قدم اور آگے بڑھاتی ہے اور ”عذاب الیم“ کا ذکر کرتی ہے کہ جو سخت جسمانی سزا اور قتل تک بھی ہوسکتی ہے۔

اس مقام پر حضرت یوسف (علیہ السلام) نے کاموشی کو کسی طور پر جائز نہ سمجھا اور صراحت سے زوجی مصر کے عشق سے پردہ اٹھایا، انہوں نے کہا: اس نے مجھے اصرار اور التماس سے اپنی طرف دعوت دی تھی ( قَالَ هِيَ رَاوَدْتَنِي عَنْ نَفْسِي)۔

واضح ہے کہ اس قسم کے موقع پر ہر شخص ابتداء میں بڑی مشکل سے باور کرسکتا ہے کہ ایک نوخیز جوان غلام کہ جو شادہ شدہ نہیں ہے گناہ ہو اور ایک شوہر دار عورت کہ جو ظاہراً باوقار ہے گنہگار ہو، اس بناء پر الزام زوجہ کی نسبت

زیادہ یوسف کے دامن پر لگتا تھا لیکن چونکہ خدا نیک اور پاک افراد کا حامی و مددگار ہے، وہ اجازت نہیں دیتا کہ یہ نیک اور پارسا مجاہد نوجوان تہمت کے شعلوں کی لپیٹ میں آئے لہذا قرآن کہتا ہے: اور اس موقع پر اس عورت کے اہل خاندان میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اصلی مجرم کی پہچان کے لئے اس واضح دلیل سے استفادہ کیا جائے کہ اگر یوسف کا کرتہ آگے کی طرف سے پھٹا ہے تو وہ عورت سچ کہتی ہے اور یوسف جھوٹا ہے (وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ).

اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے وہ عورت جھوٹی اور یوسف سچا ہے (وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ).

اس سے زیادہ مضبوط دلیل اور کیا ہوگی۔ کنونکہ زوجہ کی طرف سے تقاضا تھا تو وہ یوسف کے پیچھے دوڑی ہے اور یوسف اس سے آگے دوڑ رہے تھے کہ وہ ان کے گرتے سے لپٹی ہے، تو یقیناً وہ پیچھے سے پھٹا ہے اور اگر یوسف نے کی بیوی پر حملہ کیا ہے اور وہ بھاگی ہے یا سامنے سے اپنا دفاع کیا ہے تو یقیناً یوسف کا کرتہ آگے سے پٹھا ہے۔ یہ امر کس قدر جاذب نظر ہے کہ کرتہ پھٹنے جا سادہ سا مسئلہ ہے گناہی کا تعین کر دیتا ہے، یہی چھوٹی سی چیز ان کی پاکیزگی کی سند اور مجرم کی رسوائی کا سبب ہوگئی۔

مصر نے یہ فیصلہ کہ جو بہت ہی چچا ٹلا تھا بہت پسند کیا، یوسف کی قمیص کو غور سے دیکھا، اور جب اس نے دیکھا کہ یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے (خصوصاً اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس دن تک اس نے کبھی یوسف سے کوئی جھوٹ نہیں سنا تھا) اس نے اپنی بیوی کی طرف رخ کیا اور کہا: یہ کام تم عورتوں کے مکر و فریب میں سے ہے، بے شک تم عورتوں کا مکر و فریب عظیم ہے (فَلَمَّا رَأَى قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ).

اس وقت مصر کو خوف ہوا کہ یہ رسوا کن واقعہ ظاہر نہ ہو جائے اور مصر میں اس کی آبرو نہ جاتی رہے، اس نے بہتر سمجھا کہ معاملے کو سمیٹ کر دبا دیا جائے، اس نے یوسف کی طرف رخ کیا اور کہا: اے یوسف تم صرف نظر کرو اور اس واقعے کے بارے میں کوئی بات نہ کہو (يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا)، پھر اس نے بیوی کی جانب رخ کیا اور کہا: تم بھی اپنے گناہ سے استغفار کرو کہ تم خطا کاروں میں سے تھی (وَاسْتَغْفِرِي لِذَنْبِكِ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ)۔ (3) بعض کہتے ہیں کہ یہ بات کہنے والا مصر نہ تھا بلکہ وہی شہید تھا لیکن اس احتمال کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے خصوصاً جب کہ یہ جملہ مصر کی گفتگو کے بعد آیا ہے۔

.....

- ۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
- 2۔ یہ کہ ”ما جزا“ میں لفظ ”ما“ نافیہ ہے یا استفہامیہ، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن دونوں صورتوں میں اس کے نتیجے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔
- 3۔ اس جملے میں ”من الخاطنین“ کہ جو جمع مکرر ہے کہا گیا ہے: کہ ”من الخاطنات“ کہ جو جمع مونث ہے، ایسا اس لئے ہے کہ بہت مواقع پر تغلیب کے طور پر جمع مذکر کا دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے یعنی تو خطا کاروں کے زمرے میں ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ شاہد کون تھا؟

شاہد کون تھا کہ جس نے یوسف اور مصر کی فائل اتنی جلدی درست کردی اور مہر لگادی اور بے گناہ کو خطا کار سے الگ کر دکھایا، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ مصر کی بیوی کے رشتہ داروں میں سے تھا اور لفظ ”من اہلہا“ اس پر گواہ ہے اور قانداً ایک حکیم، دانش مند اور سمجھدار شخص تھا اس واقعے میں کہ جس کا کوئی عینی شاہد نہ تھا اُس نے شگاف پیراہن سے حقیقت معلوم کر لی، کہتے ہیں کہ یہ شخص مصر کے مشیروں سے تھا اور اس وقت اس کے ساتھ تھا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ وہ شیر خوار بچہ تھا، یہ بچہ مصر کی بیوی کے رشتہ داروں میں سے تھا، اس وقت یہ بچہ وہی قریب تھا یوسف نے مصر سے خواہش کی کہ اس سے فیصلہ کروالو، مصر کو پہلے تو بہت تعجب ہوا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے لیکن جب وہ شیر خوار حضرت عیسیٰ کی طرح گہوارے میں بول اٹھا اور اس نے گنہگار کو بے گناہ سے الگ کر کے معیار بتایا تو وہ متوجہ ہوا کہ یوسف ایک غلام نہیں بلکہ نبی ہے یا نبی جیسا ہے۔

وہ روایات کہ جو اہل بیت (علیہ السلام) اور اہل تسنن کے طریقے سے منقول ہیں ان میں اس ایک دوسری تفسیر کی طرف اشارہ ہے، ان میں سے ایک روایت ابن عباس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے، آپ نے فرمایا:

چار افراد نے بچپن میں بات کی، فرعون کی آرایش کرنے والی کا بیٹا، یوسف کا شاہد، صاحبِ جریح اور عیسیٰ بن مریم۔ (1)

تغیر علی بن ابراہیم میں بھی امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

شہادت دینے والا چھوٹا بچہ گہوارے میں تھا۔ (2)

لیکن توجہ رہے کہ مندرجہ بالا دونوں احادیث میں سے کسی کی بھی سند محکم نہیں ہے بلکہ دونوں مرفوعہ ہیں۔ تیسرا احتمال یہ ذکر کیا گیا ہے کہ شاہد وہی گرتے کا پھٹا ہونا تھا کہ جس نے زبان حال میں شہادت دی، مگر کلمہ ”من اہلہا“ (شاہد کی بیوی کے خاندان میں سے تھا) کی طرف توجہ کرنے سے یہ احتمال بہت بعید نظر آتا ہے بلکہ یہ کلمہ اس احتمال کی نفی کرتا ہے۔

۲۔ مصر نے خفیف ر عمل کیوں ظاہر کیا؟

اس داستان میں جو مسائل انسان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسے اہم مسئلہ میں مصر نے صرف ایک ہی جملے پر قناعت کیوں کی، جب کہ یہ اس کی عزت و ناموس کا معاملہ تھا، اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ اپنے گناہ پر استغفار کرو کہ تُو خطا کاروں میں سے تھی۔ شاید یہی مسئلہ سبب بنا کہ اپنے اسرار فاش ہونے کے بعد مصر کی بیوی نے اشراف اور بڑے لوگوں کی بیویوں کو ایک خاص محفل میں دعوت دی اور ان کے سامنے اپنے عشق کی داستان کو صراحت سے اور کھول کر بیان کیا۔ کیا رسوائی کے خوف نے کو آمادہ کیا کی وہ اس معاملے کو طول نہ دے یا یہ کہ طاغوتی حکمرانوں کے لئے یہ کام اور عزت و ناموس کی حفاظت کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ وہ گناہ، برائی اور بے عفتی میں اس قدر غرق ہوتے ہیں کہ اس بات کی ان کی نظر میں حیثیت اور وقعت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ دوسرا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

۳ بحرانی لمحات میں نصرتِ الہی

داستان یوسف کا یہ حصہ ہمیں ایک اور بہت بڑا درس دیتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایسے انتہائی بحرانی لمحات میں پروردگار کی وسیع حمایت انسانی مدد کو اپنچتی ہے۔

جیسا کہ ارشاد الہی ہے:-

.....يَجْعَلُ لَهُ مَخْرَجًا، وَيَرْزُقُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ.

خدا اس کے لئے نجات کی راہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق دے گا کہ جہاں سے وہم بھی نہ ہو، (طلاق: ۲، ۳)۔

اسی کے مصداق ایسے ذرائع سے کہ انسان جن کے متعلق سوچتا بھی نہیں کہ کوئی امید کی کرن پیدا ہوگی، خدائے تعالیٰ کی مدد ہوتی ہے۔

کیا خبر تھی کی گرتے کا پھٹنا حضرت یوسف (علیہ السلام) کی پاکیزگی اور برائت کی سند بن جائے گا، وہی واقعات کو جنم دینے والا گرتہ کہ جو ایک یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں کو پھٹنا نہ ہونے کی وجہ سے باپ کے حضور ذلیل و رسوا کرتا ہے لیکن دوسری طرف یہ گرتہ کی ہوس آلود بیوی کو پھٹا ہونے کی وجہ سے خوار کرتا ہے اور تیسری طرف حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی بے نور آنکھوں کے لئے نورِ آفرین بن جاتا ہے اور اس کی بوئے آشنائی نسیمِ صبحگاہی کے ہمراہ مصر سے کنعان تک سفر کرتی ہے اور پیرِ کنعان کو خوش خبری لے کر آنے والے سوار کی خبر دیتی ہے۔ بہر حال خدا تعالیٰ کے ایسے پوشیدہ الطاف ہیں کہ جن کی گہرائی سے کوئی شخص آگاہ نہیں ہے اور جس وقت اس کے لطف کی بادِ صبا چلتی ہے تو منظر اس طرح سے بدل جاتے ہیں کہ سمجھدار ترین افراد بھی جس کی پیش گوئی کے قابل نہیں ہوتے۔

گرتے اگرچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے لیکن ایک اہم چیز ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مکرڑی کے جالے کے چند تار ایک ملت کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے تبدیل کر دیتے ہیں جیسا کہ ہجرتِ رسول کے وقت غارِ ثور پر ہوا۔

۴۔ مصر کی بیوی کا منصوبہ

مندرجہ بالا آیات میں عورتوں کے مکر کی طرف اشارہ ہوا ہے (البتہ ایسی عورتیں جو زوجہ مصر کی طرح بے لگام اور ہوس ران ہوں) اور اس مکر و فریب کو ”عظیم“ قرار دیا گیا ہے (ان کی دکن عظیم)۔

تاریخ میں اور تاریخ ہی کے تسلسل میں ایسی بہت سی داستانیں موجود ہیں، اس سلسلے میں بہت سی باتیں منقول ہیں کہ جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوس باز عورتیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے منصوبے بناتی ہیں جو بے نظیر ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا داستان میں ہم نے دیکھا ہے کہ زوجہ مصر نے عشق میں شکست کھانے کے بعد اور اپنے آپ کو رسوائی کے آستانے پر پاکر کس طرح بڑی مہارت سے اپنی پاک دامنی اور یوسف کی آلودگی کو پیش کیا، یہاں تک کہ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ یوسف نے میری طرف برا ارادہ کیا بلکہ اسے مسلم امر کے طور فرض کیا اور صرف ایسے شخص کی سزا کے متعلق سوال کیا اور ایسی سزا کا ذکر کیا جو صرف قید پر موقوف نہ تھی بلکہ اس کی کوئی حد نہ تھی۔

اسی واقعے میں ہم بعد میں دیکھے گئے کہ جب مصر کی عورتوں نے سرزنش کی اور اپنے غلام سے اس کے بے قرار عشق پر انگلی اٹھانی تو اس نے کس طرح اپنی برائت کے لئے انتہائی مکارانہ اور سوچے سمجھے طریقے سے حیران کن چال چلی۔

اور یہ ایسی عورتوں کے مکر کے بارے میں ایک اور تاکید ہے۔

1تفسیر المنار، ج ۱۲، ص ۲۸۷۔  
2تفسیر نور الثقلین، ج ۲، ص ۴۲۲۔

#### تفسیر نمونہ جلد 09

۳۰ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَةٌ الَّتِي تَرَاوُدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ -  
۳۱ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكًا وَأَتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتُ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْتَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ -  
۳۲ قَالَتْ فَذَلِكُنَّ الَّذِينَ لُمْتُنِّي فِيهِ وَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ مَا أَمَرُهُ لَيُصْجَتْنَ وَلَيَكُونَنَّ مِنَ الصَّاعِرِينَ -  
۳۳ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ -  
۳۴ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُمْ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ -

ترجمہ

۳۰ شہر کی بعض عورتوں نے کہا: زوجہ مصر اپنے جوان (اپنے غلام) کو اپنی طرف دعوت دیتی ہے اور اس جوان کا عشق اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے، ہم دیکھتی ہیں کہ وہ کھلی گمراہی میں ہے۔  
۳۱ جس وقت (مصر کی بیوی) کو ان کے خیال کی خبر ہوئی تو اس نے انہیں بلوایا (اور انہیں دعوت دی) اور ان کے لئے قیمتی تکیوں سے مجلس آراستہ کی اور ہر ایک کے ہاتھ میں (پھل کاٹنے کے لئے) چھری تھمادی اور اس موقع پر (یوسف سے) کہا: ان کی محفل میں داخل ہو، جب ان کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور (بے اختیار) انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہا حاشا للہ یہ بشر نہیں ہے یہ تو کوئی بزرگوار فرشتہ ہے۔  
۳۲ (کی بیوی نے) کہا: یہ وہی ہے جس (کے عشق) کی بناء پر تم نے مجھے سرزنش کی ہے، جی ہاں! میں نے اسے اپنی طرف دعوت دی ہے مگر یہ بچ نکلا اور جو کچھ میں کہتی ہوں اس نے انجام نہ دیا تو یہ انداز میں جائے گا تو یقیناً ذلیل و خوار ہوگا۔  
۳۳ (یوسف) نے کہا: پروردگارا! جس طرف یہ لوگ مجھے بلاتے ہیں اس سے قید خانہ مجھے زیادہ محبوب ہے اور اگر تونے ان کی چالوں کو مجھ سے دور نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہوجاؤں گا۔  
۳۴ اس کے پروردگار نے اس کی دعا قبول کر لی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دور کر دیں کیونکہ وہ سننے اور

جاننے والا ہے۔

زوجہ مصر کی ایک اور سازش  
زوجہ کے اظہارِ عشق کا معاملہ مذکورہ داستان میں اگرچہ خاص لوگوں تک تھا اور خود نے بھی اسے چھپا نے کی تاکید کی تھی تاہم ایسی باتیں چھپانے نہیں چھپتیں، خصوصاً بادشاہوں اور اہلِ دولت و اقتدار کے تو محلوں کی دیواریں بھی سنتی ہیں، بہر حال آخر کار یہ راز قصر سے باہر نکل گیا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: شہر کی کچھ عورتوں اس بارے میں ایک دوسرے سے باتیں کرتی تھیں اور اس بات کا چرچا کرتی تھیں کہ کی بیوی نے اپنے غلام سے راہ و رسم پیدا رلی اور اسے اپنی طرف دعوت دیتی ہے (وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَةٌ الَّتِي تَرَاوُدُ فَتَآهَا عَنْ نَفْسِهِ)، اور غلام کا عشق اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے (قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا)۔

پھر وہ یہ کہہ کر تنقید کرتیں کہ ”ہماری نظر میں تو وہ واضح گمراہی میں ہے (إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ)۔ واضح رہے کہ ایسی باتیں کرنے والی مصر کی طبقہ امراء کی عورتیں تھیں جن کے لئے فرعونوں اور مستکبرین کے محلات کی گھٹیا کہانیاں بہت دلچسپ ہوتی تھیں اور وہ ہمیشہ ان کی ٹوہ میں لگی رہتی تھیں۔  
اشراف کی یہ عورتیں کہ جو خود بھی زوجہ کی نسبت بوس رانی میں کسی طرح کم نہ تھیں ان کی چونکہ یوسف تک پہنچ نہیں تھی لہذا بقول ”جانماز آب می کشیدند“ مکر و فریب میں لگی ہوئی تھیں اور زوجہ کو اس کے عشق پر واضح گمراہی میں قرار دیتی تھیں، یہاں تک کہ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ راز بعض زنانِ مصر نے ایک سازش کے ساتھ پھیلا یا، وہ چاہتی تھیں کہ زوجہ مصر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے انہیں اپنے مہل میں دعوت دے تاکہ وہ خود وہاں یوسف کو دیکھ سکیں، ان کا خیال تھا کہ وہ یوسف کے سامنے ہوں تو ہوسکتا ہے ان کی نظر ان کی طرف مائل ہو جائے کہ جو شاید زوجہ مصر سے بھی بڑھ کر حسین تھیں اور پھر یوسف کے لئے ان کا جمال بھی نیا تھا اور پھر یوسف کے لئے مصر کی بیوی ماں یا مولیٰ یا ولی نعمت کا مقام رکھتی تھی اور ایسی کوئی صورت ان کے لئے نہ تھی لہذا وہ سمجھتی تھیں کہ زوجہ کی نسبت ان کے اثر کا احتمال زیادہ ہے۔

”شغف“ ”شغاف“ کے مادہ سے ہے، یہ دل کے اوپر کی گرہ یا دل پر موجود ایک پتلا سا چھلکا جس نے غلاف کی طرح اسے ڈھاپ رکھا ہوتا ہے، کو کہتے ہیں ”شَغَفَهَا حُبًّا“ وہ یوسف کی اتنی شیدائی ہو گئی ہے کہ اس کی محبت اس کے دل کے اندر اتر گئی ہے اور اس کی گہرائیوں میں سما گئی ہے اور یہ شدید محبت اور یہ عشقِ سوزاں کی طرف اشارہ ہے۔  
”آلوسی“ نے تفسیر ”روح المعانی“ میں کتاب ”اسرار البلاغہ“ سے عشق و محبت کے کئی مراتب کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

محبت کا پہلا درجہ میلان ہے، اس کے بعد ”علاقہ“ یعنی ایسی محبت جس کا تعلق دل سے ہو، اس کے بعد ”کلف“ یعنی شدید محبت ہے، پھر ”عشق“ کا درجہ ہے، اس کے بعد ”شغف“ (عین کے ساتھ) ہے یعنی وہ حالت کہ جس میں دل آتش عشق میں جلتا ہے اور اسے اس جلن سے لذت حاصل ہوتی ہے، اس کے بعد ”لوعۃ“ کا مرحلہ ہے اور پھر ”شغف“ کا درجہ ہے، یہ وہ مرحلہ ہے کہ جہاں عشق دل کے تمام گوشوں اور زاویوں میں اتر جاتا ہے اور اس کے بعد ”تندلۃ“ ہے، یہ وہ درجہ ہے کہ جس میں عشق عقلِ انسانی کو لے جاتا ہے اور آخری مرحلہ ”ہیوم“ ہے کہ جو مطلق بے قراری کا نام ہے اس مرحلے میں عاشق کو بے اختیار ہر طرف کھنچتی ہے۔ (۱)

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ کس شخص نے یہ راز فاش کیا تھا، زوجہ تو یہ رسوائی برگز گوارا نہیں کرتی تھی اور نہ تو خود اسے چھپانے کی تاکید کی تھی، رہ گیا ہو حکیم و دانا کہ جس نے اس کا فیصلہ کیا تھا، اس سے تو ویسے ہی یہ کام بعید نظر آتا ہے، بہر حال جیسا کہ ہم نے کہا کہ خرابیوں سے پُر ان محلات میں ایسی کوئی چیز نہیں کہ جسی مخفی رکھا جاسکے اور آخر کار ہر بات نامعلوم افراد کی زبانوں سے دریاہوں تک اور ان سے باہر کی طرف پہنچ جاتی ہے اور یہ فطری امر ہے کہ لوگ اسے زیبِ داستان کے لئے اور بڑھا چڑھا کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

زوجہ کو مصر کی حیلہ گر عورتوں کے بارے میں پتہ چلا تو پہلے وہ پریشان ہوئی، پھر اسے ایک تدبیر سوجھی، اس نے انہیں ایک دعوت پر مدعو کیا، فرش سجایا اور قیمتی گاؤں تکے لگادئے، وہ آبیٹھیں تو ہر ایک کے ہاتھ میں پھل کائے کے لئے چھری تھمادی (یہ چھریاں پھل کائے کی ضرورت سے زیادہ تیز تھیں) (۱) فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكًا وَأَلَتْ كُلًّا وَاحِدَةً مِّنْهُنَّ سِكِّينًا)۔ (۲)

یہ کام خود اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اپنے شوہر کی پروہ نہیں کرتی تھی اور گزشتہ رسوائی سے اس نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔

اس کے بعد اس نے یوسف کو حکم دیا کہ اس مجلس میں داخل ہو تاکہ تنقید کرنے والے عورتیں اس کے حُسن و جمال کو

دیکھ کر اسے اس کے عشق پر ملامت نہ کریں (وَقَالَتْ أَخْرَجْ عَلَيْنَ).

”ادخل“ (داخل ہوجاؤ) کی بجائے یہاں ”اخرج علیہن“ (ان کی طرف باہر نکلو) کی تعبیر استعمال ہونی ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زوجہ نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو کہیں باہر نہیں بٹھا رکھا تھا بلکہ اندر کے کسی کمرے میں کہ غالباً جہاں غذا اور پھل رکھا گیا تھا مشغول رکھا تھا تاکہ وہ محفل میں داخل ہونے والے دروازے سے نہ آئیں بلکہ بالکل غیر متوقع طور پر اور اچانک آئیں۔

زنانِ مصر جو بعض روایات کے مطابق دس یا اس سے زیادہ تھیں جب انہوں نے زیبا قامت اور نورانی چہرہ دیکھا اور ان کی نظر یوسف کے دلربا چہرے پر پڑی تو انہیں یوں لگا جیسے اس محل میں آفتاب اچانک بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہو اور آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے، وہ اس قدر حیران اور دم بخود ہوئیں کہ انہیں ہاتھ اور پاؤں میں اور ترنج بین میں فرق بھول گیا، انہوں نے یوسف کو دیکھتے ہی کہا یہ تو غیر معمولی ہے (فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ)، وہ خود سے اس قدر بے خود ہوئیں کہ (ترنج بین کی بجائے) ہاتھ کاٹ لئے (وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ) ، اور جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی دلکش آنکھوں میں تو عفت وحیا کا نور ضوفشاں ہے اور ان کے معصوم رخسار شرم وحیا سے گلگوں ہیں تو ”سب پکار اٹھیں کہ نہیں یہ جوان برگز گناہ سے آلودہ نہیں ہے یہ تو کوئی بزرگوار آسمانی فرشتہ ہے (وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ)۔ (3) اس بارے میں کہ زنانِ مصر نے اس وقت اپنے ہاتھوں کی کتنی مقدار کاٹی تھی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے یہ بات مبالغہ آمیز طور پر نقل کی ہے لیکن قرآن سے اجمالاً یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ اس وقت مصر کی عورتیں پوری طرح بازی ہار چکی تھیں، ان کے زخمی ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا، پریشانی کے عالم میں وہ بے روح مجسمے کی طرح اپنی جگہ چپکی سی بیٹھی تھیں، ان کی حالت کہہ رہی تھی کہ انہوں نے زوجہ سے کچھ کم نہیں کیا، اُس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور کہا۔ ”یہ وہ شخص ہے جس کے عشق پر تم مجھے طعنے دیتی تھیں) قَالَتْ فَذَلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ)۔

گویا زوجہ چاہتی تھی کہ انہیں کہے کہ تم نے تو یوسف کو ایک مرتبہ دیکھا ہے اور یوں اپنے ہوش و بواں گنوا بیٹھی ہو کہ تم نے اپنے ہاتھ تک کاٹ لئے ہیں، اس کے جمال میں مستغرق ہو گئی ہو اور اس کی ثنا خوانی کرنے لگی ہو تو پھر مجھے کیونکر ملامت کرتی ہو جب کہ میں صبح وشام اس کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہوں۔

زوجہ نے جو منصوبہ بنایا تھا اس میں اپنی کامیابی پر وہ بہت مغرور اور خوش تھی، وہ اپنے کام کو معقول ثابت کر رہی تھی، اس نے ایک ہی دفعہ تمام پردے ہٹا دئے اور پوری صراحت کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور کہا: جی ہاں! میں نے اسے اپنی آرزو پورا کرنے کے لئے دعوت دی تھی لیکن یہ بجا رہا (وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ)۔ اس کے بعد بجائے اس کے کہ اپنے گناہ پر اظہارِ ندامت کرتی یا کم از کم مہمانوں کے سامنے کچھ پردہ پڑا رہنے دیتی اور نے بڑی بے اعتنائی اور سخت انداز میں کہ جس سے اس کا قطعی ارادہ ظاہر ہوتا تھا، صراحت کے ساتھ اعلان کیا: اگر اس (یوسف) نے میرا حکم نہ مانا اور میرے عشقِ سوزاں کے سامنے سر نہ جھکایا تا یقیناً قید میں جانا پڑے گا (وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا أَمَرُهُ لَيُصْجَتْنَ وَيَكُونَنَّ مِنَ الصَّاغِرِينَ)۔

فطری امر ہے کہ جب مصر نے اس واضح خیانت پر اپنی بیوی سے فقط یہی کہنے پر قناعت کی کہ ”واستغفري لذنبك“ (اپنے گناہ پر استغفار کر) تو اس کی بیوی رسوائی کی اس منزل تک پہنچی، اصولی طور پر جیسا کہ ہم نے کہا ہے مصر کے فرعون اور وں کے کے دربار میں ایسے مسائل کوئی نئی بات نہ تھی۔

بعض نے تو اس موقع پر ایک تعجب انگیز روایت نقل کی ہے، وہ یہ کہ چند زنانِ مصر جو اس دعوت میں موجود تھیں وہ زوجہ کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے حق بجانب قرار دیا، وہ یوسف کے گرد جمع ہو گئیں اور ہر ایک نے یوسف کو رغبت دلانے کے لئے مختلف بات کی۔

ایک نے کہا: اے جوان! یہ اپنے آپ کو بچانا، یہ ناز و نخرے آخر کس لئے؟ کیوں اس عاشقِ دلدادہ پر رحم نہیں کرتے؟ کیا اس خیرہ کن جمالِ دل آرا کو نہیں دیکھتے، کیا تمہارے سینے میں دل نہیں ہے؟ کیا تم جوان نہیں ہو؟ کیا تمہیں عشق و زیبائی سے کوئی رغبت نہیں اور کیا تم پھر اور لکڑی کے بنے ہوئے ہو۔

دوسری نے کہا: میں حیران ہوں چونکہ حُسن و عشق کی وجہ سے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا لیکن کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ وہ مصر اور اس ملک کے صاحبِ اقتدار کی بیوی ہے؟ کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ اس کا دل تمہارے ہاتھ میں ہو تو یہ ساری حکومت تمہارے قبضے میں ہو گئی اور تم جو مقام چاہو تمہیں مل جائے گا۔

تیسری نے کہا: میں حیران ہوں کہ نہ تو تم اس کے جمالِ زیبا کی طرف مائل ہو اور نہ اس کے مال و مقام کی طرف لیکن کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ایک خطرناک انتقام جو عورت ہے اور انتقام لینے کی طاقت بھی پوری طرح اسکے ہاتھ میں ہے؟ کیا تمہیں اس کے وحشتناک اور تاریک زندان کا خوف نہیں؟ کیا تم اس کے قید تنہائی کے عالمِ غربت و بیچارگی

کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے؟

ایک طرف کی بیوی کی دھمکی اور ان آلودہ گناہ عورتوں کا وسوسہ تھا کہ جو اس وقت دلّالی کا کھیل کھیل رہی تھیں اور دوسری طرف یوسف کے لئے ایک شدید بحرانی لمحہ تھا، ہر طرف سے مشکلات کے طوفان نے انہیں گھیر کر رکھا تھا لیکن وہ تو پہلے سے اپنے آپ کو اصلاح سے آراستہ کے ہوئے تھے، نور ایمان، پاکیزگی اور تقویٰ نے ان کی روح میں ایک خاص اطمینان پیدا کر رکھا تھا، وہ بڑی شجاعت اور عزم سے اپنے موقف پر ڈٹے رہے، بغیر اس کے کہ وہ ان بوس باز اور ہوس ران عورتوں سے باتوں میں الجھتے انہوں نے پروردگار کی بارگاہ کا رُخ کیا اور اس طرح سے دعا کرنے لگے: پروردگار! جس طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت قید خانہ اپنی تمام تر سختیوں کے باوجود مجھے زیادہ محبوب ہے (قَالَ رَبِّ السَّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ).

اس کے بعد چونکہ وہ جانتے تھے کہ تمام حالات میں خصوصاً مشکلات میں لطفِ الہی کے سوا کوئی راہ نجات نہیں کہ جس پر بھروسہ کیا جائے، انہوں نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کیا اور اس سے مدد مانگی اور پکارے: پروردگار! اگر تو مجھے ان عورتوں کے مکر اور خطرناک منصوبوں سے نہ بچانے تو میرا دل ان کی طرف مائل ہو جائے گا اور مینجابلوں میں سے ہوجاؤں گا (وَالْأُتْرَفُ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ)، خداوند! میں تیرے فرمان کا احترام کرتے ہوئے اور اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہوئے اس وحشت ناک قید خانے کا استقبال کرتا ہوں، وہ قید خانہ کہ جس میں میری روح آزاد ہے اور میرا دامن پاک ہے اس کے بدلے میں اس ظاہری آزادی کو ٹھوکر مارتا ہوں کہ جس میں میری روح کو زندانِ بوس نے قید کر رکھا ہو اور جو میرے دامن کو آلودہ کر سکتی ہے۔

خدایا! میری مدد فرما، مجھے قوت بخش اور میری عقل، ایمان اور تقویٰ کی طاقت میں اضافہ فرما تاکہ میں ان شیطانی وسوسوں پر کامیابی حاصل کروں۔

اور چونکہ خدا تعالیٰ کا ہمیشہ سے وعدہ ہے کہ وہ مخلص مجاہدین کی (چاہے وہ نفس کے خلاف برسرِ پیکار ہوں یا ظاہری دشمن کے خلاف) مدد کرے گا، اس نے یوسف (علیہ السلام) کو اس عالم میں تنہا نہ چھوڑا، حق تعالیٰ کا لطف و کرم اس کی مدد کو آگے بڑھا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: اس کے پروردگار نے اس کی اس مخلصانہ دعا قبول کو قبول کیا (فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ)، ان کے مکر اور سازشوں کو پلٹا دیا (فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ) کیونکہ وہ سننے اور جاننے والا ہے (إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ) وہ بندوں کی دعا سنتا بھی ہے اور ان کے اندرونی اسرار سے بھی آگاہ ہے اور انہیں مشکلات سے بچانے کی راہ سے بھی واقف ہے۔

.....

۱. تفسیر روح المعانی، ج ۱۲، ص ۲۰۳۔

۲. ”متکا“ اس چیز کو کہتے ہیں جس پر تکیہ کیا جائے جیسے کرسیوں اور تخت کے ٹیک یا پشت بنی ہوتی ہے اور جیسا کہ اس زمانے کے محلات میں معمول تھا لیکن بعض نے متکا کا معنی ترنج بین کیا ہے کہ جو ایک قسم کا پھل ہے، جنہوں نے اس کا معنی ٹیک کیا ہے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ترنج بین کی بنی ہوئی تھی، فارسی میں اسے بالنگ کہتے ہیں، یہ ترش مزہ پھل ہوتا ہے جس کا چھلکا موٹا ہوتا ہے اور اس کے موٹے چھلکے کا مرہ بنایا جاتا ہے، بوسکتا ہے یہ پھل مصر میں ہمارے پھل سے مشابہ ہو اور مکمل طور پر ترش نہ ہو۔

3. ”حاشِ اللہ“ ”حشی“ کے مادہ سے ایک طرف کے معنی میں ہے اور ”تحاشی“ کنارہ کرنے کے معنی میں ہے اور ”حاشِ اللہ“ کا معنی یہ ہے کہ خدا منزہ ہے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یوسف بھی پاک و منزہ بندہ ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ طاغوت کے پرانے ہتھکنڈے

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کی بیوی نے اور مصر کی دوسری عورتوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے آزمائے، اظہارِ عشق کیا، شدید محبت ظاہر کی، اور تسلیم محض کا اظہار کیا، پھر لالچ دینے کی کوشش کی اور پھر ڈرایا دھمکایا، دوسرے لفظوں میں انہوں نے شہوت، زر اور زور کے تمام حربے استعمال کئے۔ یہی ہر خود غرض اور زمانے کے طاغوت کا متفقہ اصول ہے، یہاں تک کہ ہم نے خود بارہا دیکھا ہے کہ وہ مردانِ حق کا جھکانے کے لئے پہلے تو انتہائی نرم دلی اور خوش روئی کا مظاہرہ کرتے ہیں، پھر لالچ اور طرح طرح کی امداد کے ذریعے کام نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کچھ نہ بن پائے تو پھر اسی موقع پر نہایت سخت دھمکیاں دیتے ہیں اور ہرگز کوئی لحاظ نہیں رکھتے کہ یہ تضاد بیانی ہے اور وہ بھی ایک ہی مجلس میں، ان کا یہ طریقہ کس قدر بُرا، تکلیف دہ اور باعثِ تحقیر ہے۔

ان کے اس عمل کی دلیل واضح ہے، وہ تو اپنے ہدف کے متلاشی ہوتے ہیں لہذا ان کے لئے ذریعہ اہمیت نہیں رکھتا، دوسرے لفظوں میں وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہر ذریعے سے فائدہ اٹھانا جائز سمجھتے ہیں۔ اس دروان کمزور اور کم رُشد افراد پہلے ہی مراحل میں یا آخری مرحلہ میں جھک جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں لیکن اولیائے حق نور ایمان کے زیر سایہ حاصل کردہ عزم و شجاعت سے ان مراحل میں آگے نکل جاتے ہیں اور تمام تر قاطعیت سے اپنے سازش ناپذیر ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں اور آخری سانس تک کمال کی طرف رواں دواں رہتے ہیں۔

۲۔ تقویٰ یہ نہیں کہ۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب تک وہ گڑھے کے کنارے ہوتے ہیں تو اپنے تئیں بہت پاک دامن قرار پاتے ہیں اور تقویٰ و پارسائی کی ڈینگیں مارتے ہیں اور زوجہ جیسے آلودہ افراد انہیں ”ضلال مبین“ میں دکھائی دیتے ہیں لیکن جب ان کا اپنا پاؤں گڑھے میں جا پڑتا ہے تو پہلے ہی پاؤں پر وہ پھسل جاتے ہیں، یہ لوگ عملی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ ان کی باتیں زبانی دعویٰ سے زیادہ کچھ نہ تھیں۔

زوجہ تو کئی برس یوسف کے ساتھ رہنے کے بعد ان کے عشق میں گرفتار ہوئی لیکن اسے طعنے دینے والیاں تو پہلی نشست میں ہی مبتلائے عشو ہو گئیں اور ترنج بین کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں۔

۳۔ یوسف محفلِ زنان میں کیوں آئے؟

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے وہ یہ کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے زوجہ کی بات کیوں مانی اور اس بات پر کیوں آمادہ ہو گئے کہ زوجہ مصر کی محفل میں قدم رکھیں کہ جو گناہ کے لئے برپا کی گئی تھی یا وہ ایک گنہگار کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے تھی۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس محل میں یوسف (علیہ السلام) کی حیثیت ایک غلام اور بردہ کی تھی، وہ مجبور تھے کہ وہاں خدمت کریں ہوسکتا ہے زوجہ نے خدمت کے بہانے ہی سے ایسا کیا ہو کہ انہیں کھانے کے برتن یا پینے کی کوئی چیز لانے کے بہانے محفل میں لے گئی ہو جب کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) اس منصوبے اور سازش سے آگاہ نہ تھے۔

۴۔ ”یدعوننی الیہ“ اور ”کیدھن“ کا مفہوم

”یدعوننی الیہ“ کا معنی ہے ”جس چیز کی یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں“ اور ”کیدھن“ کا معنی ہے ”ان عورتوں کا منصوبہ“ ان الفاظ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصر کی بوس باز عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لینے اور یوسف (علیہ السلام) کی فریفتہ ہونے کے بعد باری باری خود بھی وہی کام کیا جو زوجہ نے کیا تھا اور انہوں نے بھی یوسف کو دعوت دی کہ وہ ان کے سامنے یا زوجہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور یوسف (علیہ السلام) نے ان سب کو ٹھکرادیا۔ یہ بات نشانہ بندی کرتی ہے کہ کی بیوی اس گناہ میں اکیلی نہ تھی اور کئی ایک اس کی شریک گناہ تھیں۔

۵۔ یوسف (علیہ السلام) خدا کی پناہ میں

جب انسان مشکلات میں گھرا ہوا اور کسی مصیبت کے کنارے تک پہنچ جائے تو اسے صرف خدا کی پناہ لینا چاہیئے اور اسی سے مدد طلب کرنا چاہیئے اگر اس کا لطف و کرم اور نصرت و مدد نہ ہوتو کوئی کام بھی نہیں ہوسکتا، یہ وہ سبق ہے جو حضرت یوسف (علیہ السلام) جیسے پاک دامن بزرگوار نے ہمیں دیا ہے، وہی ہیں جو کہتے ہیں: پروردگار! اگر تُو ان کے منحوس منصوبوں سے نجات نہ دے تو میں بھی ان کی طرف مائل ہوجاؤں گا اور اگر تُو نے مجھے ان کی ہلاکت خیز یوں میں تنہا چھوڑ دے تو طوفانِ حوادث مجھے اپنے ساتھ لے جائے، تُو ہے کہ میرا حافظ و نگہبان ہے نہ کہ میری طاقت اور تقویٰ۔

لطفِ الہی سے وابستگی کی یہ حالت بندگانِ خدا کو لامحدود طاقت اور عزم عطا کرنے کے علاوہ اس کے الطافِ خفی سے بہرہ ور ہونے کا سبب بنتی ہے، وہ الطاف کہ جن کی تعریف و توصیف ناممکن ہے ان کا صرف مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور اسی طرح ان کی تصدیق ہوسکتی ہے، ایسے ہی لوگ اس دنیا میں بھی لطفِ الہی سے سائے میں ہیں اور اُس جہان میں بھی لطفِ پروردگار سے ہمکنار ہوں گے، ایک حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

سبعة يظلهم الله في ظل عرشه يوم لا يظل الا ظل: امام عادل، وشاب نشأ في عبادة الله عزوجل، ورجل قلبه متعلق بالمسجد اذا



خرج منه حتى يعود اليه، ورجلان كانا في طاعة الله عز وجل فاجتمعا على زلک و تفرقا، ورجل ذكر الله عز وجل خاليا ففاضت عيناه، ورجل دعت امرأه ذات حسن وجمال فقال انى اخاف الله تعالى، ورجل تصديق بصدق فاحفاها حتى لا تعلم شماله ماتصديق بيمينه!

جس روز عرش الہی کے سائے علاوہ کوئی سائی نہ ہوگا اس دن اللہ تعالیٰ سات طرح کے لوگوں کو اپنے عرش کے سائے میں رکھے گا:

امام عادل، وہ جوان کی جس نے ابتدائے عمر ہی سے خدا کی بندگی میں پرورش پائی ہو، وہ شخص کہ جس کا دل مسجد اور عبادت الہی کے مرکز سے بندھا ہو، جب وہ اس سے نکلنا ہو تو اس کے خیال میں رہتا ہو یہاں تک کہ اس کی طرف لوٹ آتا ہو، وہ لوگ جو فرمان خدا کی اطاعت میں مل جل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے جدا ہوتے وقت ان کا روحانی رشتہ اتحاد اسی طرح برقرار رہتا ہو، وہ شخص کہ جو پروردگار کا نام سنتے وقت جس کی آنکھوں سے (احساس مسئولیت سے یا گناہوں کے خوف سے) آنسو جاری ہوجاتے ہوں، وہ شخص کہ جسے حسین وجمیل عورت اپنی طرف دعوت دے اور وہ کہے کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں، اور وہ شخص جو ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہو اور اپنے صدقے کو مخفی رکھتا ہو کہ دائیں ہاتھ سے دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ (1)

1. سفینة البحار، ج ۱، ص ۵۹۵ (ظل).

تفسیر نمونہ جلد 09

۳۵ ثُمَّ بَدَأَ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوْا الْآيَاتِ لَيْسَجُنُّهُ حَتَّىٰ جِئِينَ۔  
 ۳۶ وَدَخَلَ مَعَهُ السَّجْنَ فَتَيَانِ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ نَبِئْنَا بِتَأْوِيلِهِ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ۔  
 ۳۷ قَالَ لَا يَا تُبَيِّكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ذَلِكَمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ۔  
 ۳۸ وَاتَّبَعَتْ مِثْلَةَ آبَائِي إِِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ۔

ترجمہ

۳۵ جب (وہ یوسف کی پاکیزگی کی) نشانیاں دیکھ چکے تو انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اسے ایک مدت تک قید خانے میں رکھیں۔

۳۶ اور دونوں جوان اور اس کے ساتھ قید خانے میں داخل ہوئے ام میں سے ایک نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ شراب کے لئے (انگور) نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں روٹیاں اپنے سر پر اٹھانے ہوئے ہوں اور پرندے ان میں سے کھا رہے ہیں، ہمیں ان کی تعبیر بتاؤ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم نیکو کاروں میں سے ہو۔  
 ۳۷ یوسف نے کیا: اس سے پہلے کہ تمہارے کھانے کا راشن تم تک پہنچے میں تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر سے آگاہ کردوں گا، یہ وہ علم ہے کہ جس کی تعلیم میرے پروردگار نے مجھے دی ہے، میں نے ان لوگوں کے دین کو ترک کر رکھا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (اسی لئے میں ایسی نعمت کے لائق ہوا ہوں)  
 ۳۸ میں نے اپنے آباء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی پیروی کی ہے، ہمارے لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ کسی کو خدا کا شریک قرار دیں، یہ خدا کا ہم لوگوں پر فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزاری نہیں کرتے۔

بے گناہی کے پاداش میں قید

قصر میں یوسف (علیہ السلام) کی موجودگی میں زنان مصر کی حیران کن محفل اس شور و غوغا کے عالم میں تمام ہوئی، فطری بات تھی کہ یہ خبر کے کان تک پہنچ گئی، ان کے تمام واقعات سے واضح ہو گیا کہ یوسف (علیہ السلام) کو معمولی انسان نہیں ہے اور اس قدر پاکیزہ ہے کہ کوئی طاقت اسے گناہ پر ابھار نہیں سکتی، مختلف حوالوں سے اس کی پاکیزگی کی نشانیاں واضح ہوئیں۔

یوسف (علیہ السلام) کی قمیص کا پیچھے سے پھٹا ہونا، زنان مصر کے وسوسے کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ کرنا، قید خانے میں جانے کے لئے آمادہ ہونا اور زوجہ کی طرف سے قید اور عذاب الیم کی دھمکیوں کے سامنے سر نہ جھکانا یہ سب اس کی پاکیزگی کی دلیل تھیں، یہ ایسے دلائل تھے کہ کوئی شخص نہ اسے چھپا سکتا تھا نہ ان کا انکار کر سکتا تھا، ان کا لازمی نتیجہ زوجہ مصر کی ناپاکی اور جرم تھا، یہ جرم ثابت ہونے کے بعد عوام میں خاندان کی جنسی حوالے سے رسوائی کا خوف بڑھ رہا تھا، مصر اور اس کے مشیروں کو اس کے لئے صرف یہی چارہ دکھائی دیا کہ یوسف (علیہ السلام) کو منظر سے ہٹایا جائے، اس طرح سے کہ لوگ اسے اور اس کا نام بھول جائیں، اس کے لئے ان کی نظر میں بہترین راستہ اسے تاریک قید خانے میں بھیجا تھا کہ جس سے یوسف (علیہ السلام) کو بھلا بھی دیا جائے گا اور وہ یہ بھی سمجھے گے کہ اصلی مجرم یوسف (علیہ السلام) تھا، ایسے لئے قرآن کہتا ہے: جب انہوں نے (وہ یوسف کی پاکیزگی کی) نشانیاں دیکھ لیتو پختہ ارادہ کر لیا کہ اسے ایک مدت تک قید میں ڈالا جائے (ثُمَّ بَدَأَ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوْا الْآيَاتِ لَيْسَجُنَّهُ حَتَّىٰ جَبِينِ)۔

”بدا“ کامعنی ”نئی رائے پیدا ہونا“ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ پہلے اس کے بارے میں ان کا کوئی ارادہ نہ تھا اور پہلی مرتبہ زوجہ نے بات احتمال کے طور پر پیش کی تھی، بہر حال اس طرح یوسف (علیہ السلام) کی پاکدامنی کے گناہ میں قید خانے میں پہنچ گئے اور یہ پہلی مرتبہ نہ تھا کہ ایک قابل اور لائق انسان پاکیزگی کے جرم میں زندان میں گیا۔ جی ہاں! ایک الودہ اور گندے ماحول میں آزادی تو ان الودہ لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ چلتے ہیں، ایسے ماحول میں نہ صرف آزادی بلکہ سب کچھ انہیں کو میسر ہوتا ہے اور یوسف جیسے پاکدامن اور قیمتی افراد کہ جو اس ماحول کے رنگ میں رنگے نہیں جاتے اور پانی کے بہاؤ کے مخالف چلتے ہیں انہیں ایک طرف ہونا پڑتا ہے لیکن کب تک؟ کیا ہمیشہ کے لئے؟ نہیں، یقیناً نہیں۔

یوسف کے ساتھ زندان میں داخل ہونے والے دوجوان بھی تھے (وَدَخَلَ مَعَهُ السَّجْنُ فَنِيَانِ)۔ جب انسان کسی معمول کے طریقے سے خبروں تک رسائی حاصل نہ کر سکے تو اس کے لئے دوسرے احساسات کو استعمال کرتا ہے تاکہ حادثہ کا اندازہ لگا سکے، خواب بھی اس مقصد کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر دو نوجوان کہ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ کے گھر مشروبات پر مامور تھا اور دوسرا باورچی خانے کا کنٹرولر، دشمنوں کی چغلی اور بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں قید تھے، ایک روز یوسف (علیہ السلام) کے پاس آئے، دونوں نے اپنا گزشتہ شب کا خواب سنا یا جو کہ ان کے لئے عجیب تھا، ایک نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ شراب بنانے کے لئے انگور نچوڑ رہا ہوں (قَالَ أَخَذَهُمَا إِنِّي أُرَانِي أُعْصِرُ خَمْرًا)۔

دوسرے نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے کچھ روٹیاں سر پر اٹھا رکھی ہیں اور آسمان کے پرندے آتے ہیں اور ان میں سے کھاتے ہیں (وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أُرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ)۔

اس کے بعد انہوں نے مزید کہا: ہمیں ہمارے خواب کی تعبیر بتاؤ، کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم نیکو کاروں میں سے ہو (نَبِينًا يَتَأْوِيلُهُ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ)۔

یہ کہ ان دونوں جوانوں کو کیسے معلوم ہوا کہ یوسف (علیہ السلام) تعبیر کو اب کے بارے میں اتنا وسیع علم رکھتے ہیں، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) نے خود سے قید خانے میں قیدیوں سے اپنا تعارف کرایا تھا کہ وہ تعبیر خواب کے بارے میں وسیع علم رکھتے ہیں۔

بعض دیگر نے کہا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) کی ملکوٹی صفات نشاندہی کرتی تھیں کہ وہ ایک عام آدمی نہیں ہے بلکہ آگاہ اور صاحب فکر و بینش انسان ہے، اسی سے انہوں نے سمجھا کہ ایسا انسان تعبیر خواب کے بارے میں درپیش مشکل کو حل کر سکتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے قید خانے میں آتے ہی اپنا نیک اطوار، حسن اخلاق اور قیدیوں کی دلجوئی، خدمت اور بیماروں کی عیادت سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ ایک نیک اور گرہ کشا انسان ہیں، اسی لئے قیدی مشکلات میں انہیں کہ پناہ لیتے تھے اور ان سے مدد مانگتے تھے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ یہاں قرآن نے لفظ ”عبد“ یا ”برده“ کی بجائے لفظ ”فتی“ (جوان) استعمال کیا ہے جو کہ ایک قسم کا احترام ہے، ایک حدیث میں ہے : لا یقولون احدکم عبدی وامتی ولاکن فتای وقتاتی ۔ تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میرا گلام اور میری کنیز بلکہ کہو میرا جوان (لڑکا یا لڑکی)۔ (۱) (یہ اس لئے تھا کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لئے جو دقیقہ پرگرام بنایا ہے اس تدریجی آزادی کے دور میں بھی گلام پر قسم کی تحقیر و تذلیل سے محفوظ رہے)۔

جملہ ”انی اعصر خمر“ (میں شراب نچوڑ رہا ہوں)، یا اس بنا پر ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ شراب بنانے کے لئے انگور نچوڑ رہا تھا یا وہ انگور جو خم میں تھا شراب ہوشکا تھا اسے وہ صاف کرنے کے لئے اور شراب بنانے کے لئے باہر نکال کر نچوڑ رہا تھا یا یہ کہ انگور نچوڑ رہا تھا تاکہ کہ انگور کا پانی بادشاہ کو دے، بغیر شراب بنائے ہوئے کیسے دے دیتا لیکن چونکہ یہ انگور شراب میں تبدیل ہونے کے قابل ہے اس لئے اس کے لئے لفظ ”خمر“ استعمال کیا گیا ہے ۔

”انی ارانی“ (میں دیکھ رہا ہوں)، یہ جملہ حالیہ ہے حالانکہ قانداً اسے کہنا چاہیئے تھا کہ ”میں نے خواب میں دیکھا ہے“ یعنی بیان کرتے ہوئے وہ اپنے تئیں خواب فرض کرتا ہے اور اس حالت کی تصویر کشی کرتے ہوئے اسے بیان کرتا ہے ۔ بہر حال وہ یوسف (علیہ السلام) کہ جو قیسیوں کی ہدایت اور راہنمائی کو کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے انہوں نے ان قیدیوں کی طرف سے تعبیر۔ خواب کے لئے رجوع کرنے کو غنیمت جانا اور اس بہانے سے ایسے اہم حقائق بیان کئے جو ان کی تعبیر خواب سے متعلق اپنی آگاہی کے بارے میں کہ جو ان دو قیدیوں کے لئے بہت اہمیت رکھتے تھے، اور تمام انسانوں کے لئے راستہ کھولنے والے تھے، آپ (علیہ السلام) نے پہلے تو ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے ان سے کہا: تمہارے کھانے کا راشن آنے سے پہلے میں تمہیں خواب کی تعبیر سے آگاہ کر دوں گا (قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا)۔ اس طرح آپ نے انہیں اطمینان دلایا کہ کھانا آنے سے پہلے وہ اپنا مقصود پالیں گے ۔ اس جملے کی تفسیر کے بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمال ذکر کئے ہیں ۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے کہا کہ میں حکم پروردگار سے کچھ اسرار سے آگاہ ہوں اور نہ صرف تمہارے خواب کی تعبیر بتاؤں گا بلکہ میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تمہارے لئے آج کونسی اور کس قسم کی غذا لائی جائے گی اور میں اس کی خصوصیات بھی بتا سکتا ہوں، اس بناء پر ”تاویل“ سے یہاں مراد ”غذا کی خصوصیات“ ہیں (البتہ اس معنی میں ”تاویل“ کا استعمال بہت کم ہوا ہے خصوصاً گزشتہ جملے میں یہ لفظ تعبیر خوبکے معنی میں ہے) ۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی مراد یہ تھی کہ تم جس قسم کا طعام خواب میں دیکھو میں تم سے اس کی تعبیر بیان کر سکتا ہوں، لیکن یہ احتمال ”قبل ان یاتیکما“ کے جملے سے مناسبت نہیں رکھتا ۔ اس بناء پر مذکورہ جملے کی بہترین تفسیر وہی ہے جو ہم نے ابتدائے سخن میں پیش کی تھی ۔ اسکے بعد با ایمان اور خدا پرست یوسف (علیہ السلام) کہ جن کے وجود کی گہرائیوں میں توحید پوری وسعت سے جڑ پکڑ چکی تھی، نے یہ واضح کرنے کے لئے کہ امر الہی کے بغیر کوئی چیز حقیقت کا روپ اختیار نہیں کرتی، اپنی بات کو اسی طرح سے جاری رکھا : تعبیر خواب کے متعلق میرا یہ علم و دانش ان امور میں سے ہے کہ جن کی تعلیم میرے پروردگار نے دی ہے (ذَلِكُمْ مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي)۔

نیز اس بناء پر کہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ خدا کوئی چیز بغیر کسی بنیاد کے بخش دیتا ہے، آپ (علیہ السلام) نے مزید فرمایا: میں نے ان لوگوں کے دین کو ترک کر رکھا ہے کہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے منکر ہیں اور اس نور ایمان اور تقویٰ نے مجھے اس نعمت کے لائق بنایا ہے (إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ)۔ اس قوم و ملت سے مسر کے بُت پرست لوگ یا کنعان کے بُت پرست لوگ مراد ہیں ۔

مجھے ایسے عقائد سے دور ہی ہونا چاہیئے کیونکہ یہ انسان کی پاک فطرت کے خلاف ہیں، علاوہ ازیں میں نے ایسے خاندان میں پرورش پائی ہے کہ جو وحی و نبوت کا خاندان ہے، ”میں نے اپنے آباء و اجداد اور بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی پیروی کی ہے (اتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ)

شاید پہلا موقع تھا کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے قیدیوں سے اپنا تعارف کروایا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ وحی و نبوت کے گہرانے سے ہیں اور دیگر بہت سے قیدیوں کی طرح کہ جو طاغوتی نظاموں میں قید ہوتے ہیں، بے گناہ زندان میں ڈالے گئے ہیں ۔

انہوں نے مزید کہا: ”، ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ کسی چیز کو خدا کا شریک قرار دیں“ کیونکہ ہمارا خاندان توحید ہے، بُت شکن ابراہیم کا خاندان ہے

(وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نُنْشِرَكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ)، اور یہ ہم پر اور تمام لوگوں پر خدا کی نعمات میں سے ہے (ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ)۔

لہذا یہ خیال نہ کرنا کہ خدا کا یہ فضل اور محبت صرف ہم خانوادہ نبوت کے شامل حال ہوتی ہے بلکہ یہ ایسی نعمت ہے جو عام ہے اور تمام بندگانِ خدا کے شامل حال ہے کہ جو ان کی روح کے اندر ایک فطرت کے عنوان سے ودیعت کی گئی ہے اور یہ انبیاء کی رہبری و ہدایت کے ذریعے کمال حاصل ہوتی ہے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ”کثر انسان ان خدائی نعمات کی شکر گزاری نہیں کرتے“ وہ راہ توحید سے منحرف ہوجاتے ہیں (وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں حضرت اسحاق (علیہ السلام) کا نام حضرت یوسف (علیہ السلام) کے ”آباء“ کے زمرے میں آیا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں حضرت یوسف (علیہ السلام) حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے بیٹے ہیں اور حضرت یعقوب (علیہ السلام) حضرت اسحاق (علیہ السلام) کے فرزند ہیں، یہ اس لئے ہے کہ لفظ ”اب“ کا طلاق ”جد“ پر بھی ہوتا ہے۔

.....

۱۔ مجمع البیان، ج ۵، ص ۲۳۲۔

#### تفسیر نمونہ جلد 09

۳۵ ثُمَّ بَدَأَ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيْسَجْنُهُ حَتَّىٰ حِينٍ۔  
 ۳۶ وَدَخَلَ مَعَهُ السَّجْنَ فَتَيَانِ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أُحْمَلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ نَبْنُنًا بِنَأْوِيلِهِ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ۔  
 ۳۷ قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَأْتُكُمَا بِنَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ذَلِكَمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ۔  
 ۳۸ وَاتَّبَعَتْ مَلَّةٌ أَبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ۔

ترجمہ

۳۵۔ جب (وہ یوسف کی پاکیزگی کی) نشانیوں دیکھ چکے تو انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اسے ایک مدت تک قید خانے میں رکھیں۔

۳۶۔ اور دونوں جوان اور اس کے ساتھ قید خانے میں داخل ہوئے ام میں سے ایک نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ شراب کے لئے (انگور) نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں روٹیاں اپنے سر پر اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے ان میں سے کھا رہے ہیں، ہمیں ان کی تعبیر بتاؤ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم نیکو کاروں میں سے ہو۔  
 ۳۷۔ یوسف نے کیا: اس سے پہلے کہ تمہارے کھانے کا راشن تم تک پہنچے میں تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر سے آگاہ کر دوں گا، یہ وہ علم ہے کہ جس کی تعلیم میرے پروردگار نے مجھے دی ہے، میں نے ان لوگوں کے دین کو ترک کر رکھا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (اسی لئے میں ایسی نعمت کے لائق ہوا ہوں)  
 ۳۸۔ میں نے اپنے آباء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی پیروی کی ہے، ہمارے لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ کسی کو خدا کا شریک قرار دیں، یہ خدا کا ہم لوگوں پر فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزاری نہیں کرتے۔

قید خانہ یا مرکزِ تربیت

جس وقت حضرت یوسف (علیہ السلام) نے گزشتہ گفتگو کے بعد ان قیدیوں کے دلوں کو حقیقتِ توحید قبول کرنے کے لیے آمادہ کر لیا تو ان کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہا: اے میرے قیدی ساتھیو! کیا منتشر خدا اور متفرق معبود بہتر ہیں یا یگانہ و یکتا اور قہار اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا خدا (يَا صَاحِبِي السَّجْنِ أَرَبَابٌ مُتَفَرَّقُونَ خَيْرٌ أَمْ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ)۔ گویا یوسف (علیہ السلام) انہیں سمجھانا چاہتے تھے کہ کیوں تم فقط عالمِ خواب میں آزادی کو دیکھتے ہو بیداری میں کیوں نہیں دیکھتے، آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا اس کا سبب تمہارا انتشار، تفرقہ بازی اور نفاق نہیں کہ جس کا سرچشمہ شرک، بت پرستی اور اربابِ متفرق ہیں جن کی وجہ سے ظالم طاغوت تم پر غالب آگئے ہیں۔ تم لوگ پرچمِ توحید کے تلے کیوں جمع نہیں ہوتے اور ”اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ“ کا دامن پرستش کیوں نہیں تھامتے تاکہ ان خود غرض ستمگروں کو اپنے معاشرے سے نکال باہر کرو کہ جو تمہیں بے گناہ اور صرف الزام کی بنیاد پر قید میں ڈال دیتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے مزید کہا: یہ غیر خدا معبود تم نے بنا رکھے ہیں ان کی حیثیت اسماءِ بلاسمیٰ کے کچھ نہیں کہ جنہیں تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے خدا کا نام دے رکھا ہے (مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءَ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ)۔

”یہ ایسے امور ہیں کہ جن کے لیے خدا نے کوئی دلیل و مدرک نازل نہیں فرمایا“ بلکہ یہ تمہارے کمزور ذہن کی پیداوار ہیں (مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ)۔

”جان لو کہ حکومتِ خدا کے علاوہ کسی کے لیے نہیں ہے“ اور اسی لیے تمہیں ان بتوں، طاغوتوں اور فرعونوں کی تعظیم کے لیے سر نہیں جھکانا چاہیے (إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ)۔ انہوں نے مزید تاکید کے لیے اضافہ کیا: خدانے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو (أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ)۔ ”یہ بے مستحکم و مستقیم دین“ کہ جس میں کسی قسم کا کوئی پیچ و خم نہیں (ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ)۔ یعنی توحید ہر لحاظ سے۔ عبادت، معاشرے پر حکومت، ثقافت اور ہر چیز میں مستحکم اور مستقیم دین ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ لوگ ہی آگاہی نہیں رکھتے اور اسی عدمِ آگاہی کے باعث شرک کی بھول بھلیوں میں سرگردان ہیں اور اپنے آپ کو غیرِ اللہ کی حکومت کے سپرد کر دیتے ہیں اور اس طرح انہیں کیسی کیسی سختیوں، قید و بند اور بختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے (وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ)۔

اپنے دو قیدی ساتھیوں کو ربربری و ارشاد اور انہیں حقیقتِ توحید کی طرف مختلف پہلوؤں کے حوالے سے دعوت دینے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے خواب کی تعبیر بیان کی کیونکہ وہ دونوں اسی مقصد کے لیے آپ کے پاس آئے تھے اور آپ نے بھی انہیں قول دیا تھا کہ انہیں ان کے خوابوں کی تعبیر بتائیں گے لیکن آپ نے موقعِ غنیمت جانا اور توحید کے بارے میں اور شرک کے خلاف واضح اور زندہ دلائل کے ساتھ گفتگو کی۔

اس کے بعد آپ نے ان دو قیدی ساتھیوں کی طرف رُخ کر کے کہا: اے میرے قیدی ساتھیو! تم میں سے ایک آزاد ہو جائے گا اور اپنے ”ارباب“ کو شراب پلانے پر مامور ہوگا (يَا صَاحِبِي السَّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا) لیکن دوسرا سولی پر لٹکایا جائے گا اور اتنی دیر تک اس کی لاش لٹکائی جائے گی کہ آسمانی پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے (وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصَلَّبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ)۔

ان دونوں مذکورہ خوابوں کی مناسبت سے اگر چہ اجمالاً واضح تھا کہ ان میں سے کون آزاد ہوگا اور کون سولی پر لٹکایا جائے گا لیکن حضرت یوسف (علیہ السلام) نے نہ چاہا کہ یہ ناگوار خبر اس سے زیادہ صراحت سے بیان کریں لہذا آپ (علیہ السلام) نے ”تم میں سے ایک“ کہہ کر گفتگو کی۔

اس کے بعد اپنی بات کی تائید کے لیے مزید کہا: یہ معاملہ جس کے بارے میں تم نے مجھ سے سوال کیا ہے اور مسئلہ پوچھا ہے حتمی اور قطعی ہے (قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ)۔ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ یہ خواب کی کوئی معمولی سی تعبیر نہیں ہے بلکہ ایک غیبی خبر ہے جسے میں نے الہی تعلیم سے حاصل کیا ہے لہذا اس مقام پر تردد و شک اور چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔

بہت سی تفاسیر میں اس جملے کے ذیل میں مرقوم ہے کہ جب دوسرے شخص نے یہ ناگوار خبر سنی تو وہ اپنی بات کی تکذیب کرنے لگا: میں نے جھوٹ بولا تھا، میں نے ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا تھا، میں نے مذاق کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے خواب کی تردید کر دے گا تو اس کی سرنوشت تبدیل ہو جائے گی۔ لہذا حضرت یوسف (علیہ السلام) نے ساتھ ہی یہ بات کہہ دی کہ جس چیز کے بارے میں تم نے دریافت کیا وہ ناقابلِ تغیر ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کو اپنی تعبیرِ خواب پر اس قدر یقین تھا کہ انہوں نے یہ جملہ تاکید کے طور پر کہا۔

لیکن جس وقت آپ نے محسوس کیا کہ یہ دونوں عنقریب ان سے جدا ہو جائیں گے لہذا ہوسکتا ہے کہ ان کے ذریعے آزادی کا کوئی دریچہ کھل جائے اور روشنی کی کوئی کرن پھوٹے اور جس گناہ کی آپ (علیہ السلام) کی طرف نسبت دی گئی

تھی اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کریں، ”آپ نے ان دو قیدی ساتھیوں میں سے جس کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ آزاد ہوگا اس سے فرمائش کی کہ آپ نے مالک و صاحب اختیار (بادشاہ) کے پاس میرے متعلق بات کرنا، تاکہ وہ تحقیق کرے اور میری بے گناہی ثابت ہو جائے (وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ)۔

لیکن اس فراموش کار غلام نے یوسف کا مسئلہ بالکل بھلا دیا جیسا کہ کم ظرف لوگوں کا طریقہ ہے کہ جب نعمت حاصل کر لیتے ہیں تو صاحبِ نعمت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ البتہ قرآن نے یہ بات یوں بیان کی ہے: جب وہ اپنے مالک کے پاس پہنچا تو شیطان نے اس کے دل سے یوسف کی یاد بھلا دی (فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ)۔ اور اس طرح یوسف فراموش کر دیے گئے ”اور چند سال مزید قید خانے میں رہے“ (فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ)۔

اس بارے میں کہ ”أَنسَاهُ الشَّيْطَانُ“ کی ضمیر بادشاہ کے ساقی کے لیے ہے یا حضرت یوسف (علیہ السلام) کے لئے، اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔

بہت سوں کے نزدیک یہ ضمیر یوسف (علیہ السلام) کی طرف لوٹتی ہے۔ اس احتمال کی بناء پر جملے کا معنی اس طرح ہوگا: شیطان، یادِ خدا یوسف (علیہ السلام) کے دل سے لے گیا اور اسی بناء پر وہ غیر خدا سے متوسل ہوئے۔ لیکن گزشتہ جملے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یوسف (علیہ السلام) نے اس سے فرمائش کی تھی کہ میرا تذکرہ اپنے صاحب و مالک سے کرنا، ظاہری مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ ضمیر ساقی کی طرف لوٹتی ہے۔ اور لفظ ”رب“ کا دونوں جگہ ایک ہی مفہوم ہے۔

علاوہ ازیں ”واذکر بعد امة“ (ایک مدت کے بعد اسے یاد آیا)۔ یہ جملہ بھی بعد کی چند آیات میں اس داستان کے ذیل میں ساقی کے بارے میں آیا ہے، جو نشاندهی کرتا ہے کہ بھول جانے والا وہی تھا نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام۔ البتہ زندان یا دیگر مشکلات سے نجات کے لیے ایسی کوشش عام افراد کے لیے کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے اور طبیعی اسباب سے کام لینے کے ضمن میں ہے لیکن ایسے افراد کے لیے کہ جو نمونہ ہوں اور ایمان و توحید کی بلند سطح پر فائز ہوں ان کے لیے اشکال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ شاید اسی بناء پر خدانے یوسف کے اس ”ترکِ اولیٰ“ کو نظر انداز نہیں کیا اور اس وجہ سے ان کی قید چند سال مزید جاری رہی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت میں ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: مجھے اپنے بھائی یوسف پر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے کیونکر خالق کی بجائے مخلوق کی پناہ لی اور اس سے مدد طلب کی۔ (۱)

ایک اور روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے: اس واقعے کے بعد جبرائیل یوسف (علیہ السلام) کے پاس آئے اور کہا: کس نے تمہیں سب لوگوں سے زیادہ حسین بنایا؟ کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔

کہا: کس نے تمہارے باپ کے دل میں تمہاری اس قدر محبت ڈالی؟ بولے: میرے پروردگار نے۔

کہا: کس نے قافلے کو تمہاری طرف بھیجاتا کہ وہ تمہیں کنویں سے نجات دے؟ کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔

پوچھا: کس نے اس پتھر کو (جو انہوں نے کوئیں کے اوپر سے گرایا تھا) تم سے دور رکھا؟ بولے: میرے پروردگار نے۔

پوچھا: کس نے تمہیں کنویں سے نجات دی؟ کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔

کہا: کس نے مصر کی عورتوں کے مکر و فریب سے تمہیں دور رکھا؟ کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔

اس پر جبرائیل نے کہا: تمہارا پروردگار کہہ رہا ہے کس چیز کے سبب تم اپنی حاجت مخلوق کے پاس لے گئے ہو اور میرے پاس نہیں لائے ہو۔ لہذا چاہیے کہ چند سال زندان میں رہو۔ (2)

چند اہم نکات

۱۔ قید خانہ مرکز ہدایت یا برائی کا دیستان:

دنیا میں زندان کی تاریخ بہت ہی دردناک اور غم انگیز ہے۔ بدترین مجرم اور بہترین انسان دونوں قید خانہ ہمیشہ بہترین

اصلاحی یا بدترین بری چیزیں سکھانے کا مرکز رہا ہے قید خانے میں اگر تباخہ کار اور برے لوگ ایک جگہ جمع ہوجائیں تو درحقیقت یہ برائی کی ایک بڑی سطح کی تربیت گاہ بن جاتی ہے۔ ان قید خانوں میں تخریبی منصوبوں پر تبادلہ خیالات ہوتا ہے اور مجرم اپنے تجربات ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں اور ہر مجرم دراصل اپنا خصوصی درس دوسروں تک پہنچاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ جیل سے نکل کر آزادی کے بعد پہلے سے بہتر اور زیادہ ماہرانہ انداز میں اپنے جرائم جاری رکھتے ہیں یہ لوگ آپس میں مربوط ہوکر اور نئے انداز میں اپنا کام شروع کردیتے ہیں۔ البتہ جیل کے نگران اس سلسلے میں رکھتے ہوئے کہ یہ لوگ عام طور پر باصلاحیت ہوتے ہیں تو انہیں صالح مفید اور اصلاح شدہ افراد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

رہے وہ زندان کے جن میں پاک نیک، بے گناہ، حق و آزادی کے مجاہدوں ہوتے ہیں، وہاں عقائد، علمی جہاد کے طریقوں اور اصلاحی امور کی تدریس ہوتی ہے۔ ایسے زندان راہ حق کے مجاہدوں کے لیے اچھا موقع مہیا کرتے ہیں کہ وہ آزادی کے بعد اپنی کاوشوں کو ہم آہنگ اور متشکل کرسکیں۔

حضرت یوسف کہ جو روجہ مصر جیسی ہوس باز، حیلہ گر اور ہٹ دھرم عورت کے خلاف کامیاب ہوئے تھے ان کی کوشش تھی کہ قید خانے کے ماحول کو ارشاد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کے مرکز میں بدل دیں یہاں تک کہ اپنی اور دوسروں کی آزادی کی بنیاد انہی پر و گراموں پر رکھ دیں۔

یہ سرگزشت ہمیں یہ اہم درس دیتی ہے کہ ارشاد اور تعلیم و تربیت کسی معین مرکز مثلاً مسجد و مدرسہ میں محدود و محصور نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہاں تک کہ قید خانے میں بھی اور اسیری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے کی حالت میں بھی۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کی مجموع مدت سات سال تھی لیکن بعض کا کہنا ہے کہ آپ قیدیوں کے خواب کے واقعہ سے پہلے پانچ سال قید میں رہے اور اس کے بعد بھی سات سال قید رہے یہ بہت رنج و زحمت کے سال تھے لیکن ارشاد و ہدایت اور اصلاح و تربیت کے لحاظ سے بہت پر برکت تھے۔ (3)

۲۔ جہاد نیک سولی پر لٹکانے جاتے ہیں :

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس داستان میں ہے کہ جس نے خواب میں دیکھا تھا کہ شراب کا جام بادشاہ تھما رہا ہے وہ رہا ہوگا اور جس نے دیکھا کہ روٹیوں کا طبق اس کے سر پر ہے اور فضا کے پرندے اسی میں سے کھارے ہیں وہ سولی پر لٹکا دیا گیا۔

کیا اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ فاسد اور گندے ماحول میں طاغوتی حکومتوں میں وہ لوگ آزاد ہیں جو اپنی شہوات کی راہ پر چلتے ہیں اور جو معاشرت کی خدمت، مدد اور بھوکوں کو روٹی کھلانے کی کوشش کرتے ہیں وہ زندگی کا حق نہیں رکھتے، ایسے لوگوں کا انجام موت ہے۔

جس معاشرے پر خراب اور فاسد نظام حکمران ہو اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے اور ایسے معاشرے میں اچھے اور برے لوگوں کی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔

۳۔ آزادی کا عظیم درس:

ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے قیدیوں کو جو سب سے بالا درس دیا ہے وہ توحید پرستی کا درس ہے۔ وہی درس کہ جس کا خلاصہ حریت و آزادی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ ”ارباب متفرقون“ منتشر مقاصد اور مختلف معبود، تفرقہ اور پراگندگی کا سرچشمہ ہیں اور جب تک تفرقہ اور انتشار موجود ہے طاغوت اور جابر افراد لوگوں پر مسلط ہیں گے لہذا آپ (علیہ السلام) نے ان کی جڑ کاٹنے کا حکم دیا اور اس کے لیے توحید کی شمشیر بڑاں سے کام لینے کے لیے کہا تا کہ آزادی کو صرف خواب میں نہ دیکھے رہیں بلکہ عالم بیداری میں دیکھیں۔

لیکن جابر اور ستمگر لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوتے ہیں اگرچہ وہ کم ہوتے ہیں مگر تفرقہ بازی اور نفاق سے کام لیتے ہیں یہ لوگ ”ارباب متفرقون“ کے ذریعے معاشرے کی طاقت کو منتشر کودیتے ہیں اور اس طرح عوام کی عظیم کثرت پر حکومت کرنا ان کے لئے ممکن ہوجاتا ہے۔

جس دن قومیں توحید اور وحدت کلمہ کی طاقت سے آشنا ہوں گی اور سب لوگ ”اللہ واحد القہار“ کے پرچم تلے جمع ہوں گے اور اپنی عظیم قوت کا ادراک کرلیں گے وہ دن جابروں اور ستمگروں کی نابودی کا دن ہوگا، یہ درس ہمارے آج کے لئے، ہمارے کل کے لئے تمام انسانی معاشروں کے لئے اور پوری تاریخ کے سب انسانوں کے لئے بہت اہم ہے۔

خصوصاً اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ یوسف (علیہ السلام) کہتے ہیں حکومت مخصوص ہے خدا کے لئے ”إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ“ اور اس کے بعد تالکید کرتے ہیں کہ پرسنش، خضوع اور تسلیم بھی صرف اسی کے حکم کے سامنے ہونا چاہیے (أَمْزَ الْأَ تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاهُ) پھر تاکید کرتے ہیں کہ مستقیم اور مستحکم آئین اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں (ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيُّمُ)۔

لیکن آپ (علیہ السلام) نے اس کا انجام بھی بتادیا کہ ان سب چیزوں کے باوجود افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں (وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ)۔ لہذا اگر لوگ صحیح تربیت و آگہی حاصل کریں اور ان میں حقیقتِ توحید زندہ ہو جائے تو ان کی یہ ساری مشکلات حل ہو جائیں۔

۴۔ ایک اصلاحی شعار سے سوء استفادہ:

”إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ“ قرآن کا ایک مثبت شعار ہے اور یہ تعرہ اللہ کی حکومت اور اللہ تک پہنچنے والی حکومت کے علوہ ہر حکومت کی نفی کرتا ہے، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ کے ایک طویل دور میں اس سے عجیب و غریب غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے، ان میں سے جیسا کہ ہم جانتے ہیں نہروان کے خوارج بھی تھے، یہ بہت ظاہر بین، جامد فکر، احمق اور بدسلیقہ لوگ تھے۔ جنگ صفین کے موقع پر یہ لوگ حکیمت اور تحکیم کی نفی کے لئے اس شعار سے چمٹ گئے اور کہنے لگے کہ جنگ ختم کرنے یا خلیفہ معین کرنے کے لئے حکم کا تعین گناہ ہے کیونکہ خدا کہتا ہے: ”إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ“ (حکومت و حکمیت خدا سے مخصوص ہے)۔

وہ اس واضح مسئلے سے غافل تھے یا انہوں نے اپنے آپ کو غافل بنالیا تھا کہ اگر حکمیت کا تعین پیشواؤں کی طرف سے ہو۔ وہ پیشوا کہ جن کے رببر کا حکم خدا کی طرف سے صادر ہو تو ان کا حکم بھی حکم خدا ہے کیونکہ آخر کار یہ حکم اس تک جا پہنچا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ جنگ صفین کے موقع پر حکم (اور فیصلہ کرنے والوں کا تعین) حضرت علی (علیہ السلام) کی طرف سے نہیں ہوا تھا لیکن اگر ایسا ہوتا تو ان کا حکم حکم، علی (علیہ السلام) کا حکم اور پیغمبر اکرم کا حکم پیغمبر اکرم کا حکم خدا کا حکم ہے۔

اصولی طور پر کیا خدا براہ راست انسانی معاشرے پر حکومت اور قضاوت کرتا ہے؟ کیا اس کے لئے اس کے علاوہ کوئی صورت ہے کہ نوع انسانی میں سے کچھ افراد۔ البتہ فرمان خدا سے اس امر کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں؟ لیکن خوارج نے اس واضح حقیقت کی طرف توجہ کیے بغیر اصلاً حضرت علی (علیہ السلام) پر واقعہ حکمیت اور تحکیم کے بارے اعتراض کیا، یہاں تک کہ اسے معاذ اللہ آپ (علیہ السلام) کے اسلام سے انحراف کی دلیل سمجھا، افسوس ہے۔ اس خود خواہی، جہالت اور جمود پر۔

ایسے اصلاحی پروگرام جب جاہل و نادان افراد کے ہاتھ جا پڑیں تو بدترین تباہ کن وسائل میں بدل جاتے ہیں۔ آج بھی وہ گروہ کہ در حقیقت خوارج کی نفسیات رکھتے ہیں اور جہالت اور ہٹ دھرمی میں اس سے کم نہیں مندرجہ بالا آیت کو مجتہدین کی تقلید کی نفی یا ان سے صلاحیتِ حکومت کی نفی پر دلیل سمجھتے ہیں۔ لیکن ان سب کا جواب مندرجہ بالا سطور میں دیا جا چکا ہے۔

.....

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ مجمع البیان، ج ۵ ص ۲۳۵۔

۳۔ مزید وضاحت کے لئے تفسیر المنار، قرطبی، میزان اور تفسیر کبیر کی طرف رجوع کریں۔

غیر خدا کی طرف توجہ

توحید کا خلاصہ اور معنی طرف یہ نہیں کہ خدا یگانہ و یکتا ہے بلکہ توحید پرستی کو انسان کے تمام پہلوؤں میں عملی صورت اختیار کرنا چاہیے اور اس کی روشن ترین نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ موحد انسان غیر خدا پر بھروسہ نہیں کرتا اور اس کے غیر کی پناہ نہیں لیتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عالم اسباب کی پرواہ نہیں کرتا اور زندگی میں وسیلے اور سبب سے کام نہیں لیتا بلکہ میں کہتا ہوں کہ تاثیر حقیقی کو سبب میں نہیں سمجھتا بلکہ تمام اسباب کا سرا ”مسبب الاسباب“ کے ہاتھ میں جانتا ہے، دوسرے لفظوں میں اسباب کے لئے استقلال کا قائل نہیں ہے اور ان سب کو ذاتِ پاک پروردگار کا پڑتو سمجھتا ہے، ہوسکتا ہے اس عظیم



حقیقت سے عدم واقفیت عام لوگوں کے بارے چشم پوشی کے قابل ہو لیکن اولیائے حق کے لئے اس بنیاد سے سرمو بے توجہی مستوجب سزا ہے، اگرچہ اس کی حیثیت ترکِ اولیٰ سے زیادہ نہیں ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ اس سے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی لحظہ بھر کی بے توجہی سے ان کی قید کی مدت طویل ہوگئی تاکہ حادثہ کی بھٹی میں وہ زیادہ پختہ اور آبدیدہ ہو جائیں اور طاقت اور طاغوتوں کے خلاف جہاد کے لئے زیادہ ہوجائیں اور جان لیں کہ اس راستے میں اللہ کی قوت و طاقت پر بھروسہ کرنا ہے اور ان محروم اور ستم رسیدہ لوگوں پر بھروسہ کرنا ہے جو اللہ کی راہ میں قدم اٹھاتے اور یہ اس راہ کے تمام راہبوں اور سچے مجاہدین کے لئے ایک عظیم درس ہے کہ جو ایک شیطان کی سرکوبی کے لئے اپنے اندر دوسرے یطمان کی محبت کو داخل نہیں ہونے دیتے، وہ مشرق و مغرب کی طرف نہیں جھکتے اور صراطِ مستقیم کہ جو امتِ وسط کی شاہراہ ہے اس کے علاوہ کسی راستے پر قدم نہیں رکھتے۔

### تفسیر نمونہ جلد 09

۴۳ وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعٌ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنَّ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ

۴۴ قَالُوا أَضْغَاتٌ أَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالَمِينَ

۴۵ وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِي

۴۶ يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ

۴۷ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ

۴۸ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَحْصِنُونَ

۴۹ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ

ترجمہ

۴۳۔ بادشاہ نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں انہیں سات دہلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک شدہ خوشے ہیں (اور خشک شدہ خوشے سبز خوشوں پر لپٹے ہوئے ہیں اور انہیں ختم کر دیا ہے) اے سردار! اگر تم خواب کی تعبیر کرسکتے ہو تو میرے خواب کے بارے میں کوئی نقطہ نظر پیش کرو۔

۴۴۔ انہوں نے کہا یہ تو خواب پریشان ہیں اور ہم اس قسم کی خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔

۴۵۔ ان دو افراد میں سے ایک جسے نجات مل گئی تھی اسے ایک مدت کے بعد یاد آیا، کہنے لگا: میں تمہیں اس کی تعبیر بتاؤں گا، مجھے (اس قیدی جو ان کے پاس ہے) بھیج دو۔

۴۶۔ یوسف! اے بہت سچے! اس خواب کے بارے میں رائے دو کہ سات موٹی تازی گائیں انہیں ساتھ دہلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور ساتھ خشک شدہ خوشے ہیں، تاکہ میں لوگوں کے پاس لوٹ جاؤں اور وہ آگاہ ہوں۔

۴۷۔ اس نے کہا: سات سال تک خوب محنت سے کاشت کاری کرو اور جو کچھ کاٹو اس میں سے تھوڑی سی مقدار کھا لو اور باقی کو خوشوں میں رہنے دو (اور ذخیرہ کرلو)۔

۴۸۔ اس کے بعد سات سال سخت (خشکی اور قحط کے) آئیں گے کہ جو کچھ تم نے ان کے لئے ذخیرہ کیا ہوگا اسے کھالیں گے مگر قدرِ قلیل کہ جو تم (بیج کے لئے) بچاؤ گے پاؤ گے۔

۴۹۔ اس کے بعد ایک سال آئے گا کہ لوگوں کو خوب بارش نصیب ہوگی اور اس سال (رس پھل اور روغن دار دانے) پائیں

گے۔

بادشاہ مصر کا خواب

حضرت یوسف علیہ السلام سات برس تک قید خانے میں تنگی و سختی میں ایک فراموش شدہ انسان کی طرح رہے، وہ خود سازی، قیدیوں کو ارشاد و ہدایت، بیماروں کی عیادت اور دردمندوں کی دلجوئی میں مصروف رہے، یہاں تک کہ ایک ظاہراً چھوٹا سا واقعہ رونما ہوا جس نے نہ صرف ان کی بلکہ مصر اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کی سرنوشت کو بدل کے رکھ دیا۔

بادشاہ مصر کہ جس کا نام کہا جاتا ہے کہ ولید بن ریان تھا (اور عزیر مصر اس کا وزیر تھا) نے ایک خواب دیکھا یہ ظاہراً ایک پریشان کن خواب تھا، دن چڑھا تو اس نے خواب کی تعبیر بتانے والوں میں اور اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور کہنے لگا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات کمزور سی گائیں بیناور سات موٹی تازی گائیں ہیں اور دہلی پتلی گائیں ان پر حملہ آور ہوئی ہیں اور انہیں کھا رہی ہیں، نیز سات برے بھرے اور سات خشک شدہ خوشے ہیں اور خشک شدہ خوشے سبز خوشوں پر لپٹ گئے ہیں اور انہیں ختم کر دیا ہے (وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعٌ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ)۔

اس کے بعد اس نے ان کی طرف روئے سخن کیا اور کہنے لگا: اے میرے سردار! میرے خواب کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرو اگر تم خواب کی تعبیر بتا سکتے ہو (يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنَّ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ)۔ لیکن سلطان کے حواریوں نے فوراً کہا کہ یہ خواب پریشان ہیں اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے (قَالُوا أَضْغَاثٌ أَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالَمِينَ)۔

”اضغاث“ ”ضغث“ (بروزن ”خرص“ ) کسی جمع ہے، اس کا معنی بے لکڑیوں، خشک گھاس، سبزی یا کسی اور چیز کا گھٹا۔

”احلام“ ”حلم“ پریشان اور خلط ملط خوابوں کے معنی میں ہے، یعنی مختلف چیزوں کے مختلف گھٹے لفظ ”احلام“ کو جو ”مَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالَمِينَ“ میں الف لام عہد کے ساتھ آیا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ان کا اظہار عجز حقیقتاً اس بنا پر تھا کہ چونکہ اس خواب کا حقیقی مفہوم ان پر واضح نہیں تھا لہذا انہوں نے اسے خواب پریشان قرار دیا کیونکہ ان کے نزدیک خوابوں کی دو قسمیں تھی ایک بامعنی و بامفہوم خواب کہ جو قابل تعبیر تھے اور دوسری خواب پریشان اور بے معنی خواب کہ جن کی تعبیر ان کے پاس کوئی نہ تھی ایسے خوابوں کو وہ قوت خیال کی فعالیت کا نتیجہ سمجھتے تھے جبکہ اس کے برخلاف پہلی قسم کے خوابوں کو وہ روح کے عالم غیب سے اتصال کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ اس خواب کو آئندہ کے پریشان کن حوادث کی دلیل سمجھ رہے تھے لیکن جیسا کہ بادشاہوں اور طاقتوں کے حاشیہ نشینوں کا طریقہ ہے وہ انہیں صرف وہی امور بتلاتے ہیں کہ جو شاہی مزاج کے لئے باعث انبساط ہوا اور جو چیز ان کی ”ذات مبارک“ کو مضطرب کر دے اس کا ذکر نہیں کرتے، ایسی جابر اور ظالم حکومتوں کے زوال اور بدبختی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ انہوں نے کس طرح جرئت کی شاہ مصر کے سامنے اس رائے کا اظہار کریں کہ وہ اسے خواب پریشان دیکھنے کا الزام دیں جبکہ ان حاشیہ نشینوں کا معمول یہ ہے کہ وہ ان کی ہر چھوٹی بڑی اور بے معنی حرکت کے لئے کوئی فلسفہ گھڑتے ہیں اور بڑی معنی خیز تفسیریں کرتے ہیں۔

یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اس لئے ہو کہ انہوں نے دیکھا تھا کہ بادشاہ یہ خواب دیکھ کر پریشان و مضطرب ہے اور وہ پریشانی میں حق بجانب بھی تھا کیونکہ اس نے خواب دیکھا تھا کہ کمزور اور لاغر گائیں توانا اور موٹی تازی گاؤں پر حملہ آور ہوتی ہیں اور انہیں کھا رہی ہیں اور یہی صورت خشک خوشوں کی تھی، کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کمزور لوگ اچانک اس کے ہاتھ سے حکومت چھین لیں گے، لہذا انہوں بادشاہ کے دل کا اضطراب دور کرنے کے لئے اسے خواب پریشان قرار دے دیا، یعنی پریشانی کی کوئی بات نہیں، یہ کوئی خاص معاملہ نہیں ہے، ایسے خواب کسی چیز کی دلیل نہیں ہوتے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ”اضغاث احلام“ سے ان کی مراد یہ نہ تھی کہ تیرے خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ ایک پیچیدہ سا خواب ہے مختلف امور اس میں جمع ہو گئے ہیں اور ہم تو صرف ایک قسم کے خوابوں کی تعبیر کر سکتے ہیں نہ کہ اس قسم کے خوابوں کی، لہذا انہوں نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ ممکن ہے کوئی ماہر استاد مل جائے اور وہ اس کی تعبیر بیان کر سکے البتہ انہوں نے خود اظہار عجز کیا ہے۔

اس موقع پر بادشاہ کا ساقی کہ جو چند سال قبل قید خانے سے آزاد ہوا تھا، اسے قید خانے کا خیال آیا، اُسے یاد آیا کہ یوسف اس خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہیں، اس نے بادشاہ کے حاشیہ نشینوں کی طرف رُخ کر کے کہا: میں تمہیں اس خواب کی بتا سکتا ہوں، مجھے اس کام کے ماہر استاد کے پاس بھیجو کہ جو زندان میں پڑا ہے تاکہ تمہیں بالکل صحیح خبر لاکر دوں (وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِي)- جی ہاں! اس گوشِ زندان میں ایک روشن ضمیر، صاحبِ ایمان اور پاک دل انسان زندگی کے دن گزار رہا ہے کہ جس کا دل حوادثِ آئندہ کا آئینہ ہے، وہ ہے کہ جو اس راز سے پردہ اٹھا سکتا ہے اور خواب کی تعبیر بیان کر سکتا ہے۔

لفظ ”فَأَرْسِلُونِي“ (مجھے بھیج دو) ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ قید خانے میں حضرت یوسف (علیہ السلام) سے ملاقات پر پابندی ہو اور وہ بادشاہ اور اس کے حواریوں سے اس کی اجازت لینا چاہتا ہو۔

اس کی اس بات نے محفل کی کیفیت ہی بدل دی، سب کی آنکھیں ساقی پر لگ گئیں، آخر کار اسے اجازت ملی اور حکم ملا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کام کے لئے نکل کھڑا ہو اور جلد نتیجہ پیش کرے، ساقی زندان میں آیا اور اپنے پرانے دوست یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچا، وہی دوست یوسف (علیہ السلام) کہ جس سے بڑی بے وفائی کی گئی تھی لیکن شاید وہ جانتا تھا کہ اس کی عظمت سے توقع نہیں کہ وہ دفتر شکایت کھول بیٹھے۔

اس نے حضرت یوسف (علیہ السلام) سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: یوسف! اے سر اپنا صداقت! اس خواب کے بارے میں تم کیا کہتے ہو کہ کسی نے دیکھا ہے سات لاغر گائیں موٹی تازی کو کھار رہی ہیں، نیز سات برے خوشے ہیں اور سات خشک شدہ (کہ جن میں سے دوسرا پہلے سے لپٹ گیا ہے اور اسے نابود کر دیا ہے) (يُوسُفُ أَيُّهَا الصَّادِقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ)- شاید میں اس طرح ان لوگوں کے پاس لوٹ کے جاؤں تو وہ اس خواب کے اسرار سے آگاہ ہو سکیں (لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ)۔

لفظ ”الناس“ ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ چاپلوس حاشیہ نشینوں کے ذریعے بادشاہ کا خواب اس وقت کے ایک اہم واقعے کے طور پر لوگوں میں پھیل چکا تھا اور اس پریشانی کو دربار سے عام لوگوں تک کھینچ لائے تھے۔

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام نے بغیر کسی شرط کے اور بغیر کسی صلے کے تقاضے کے فوراً خواب کی واضح اور نہایت اعلیٰ تعبیر بیان کی، اس میں آپ نے کچھ چھپائے بغیر درپیش تاریک مستقبل کے بارے میں بتایا ساتھ ہی اس کے لئے راہنمائی کردی اور ایک مرتبہ پرگرام بتادیا، آپ (علیہ السلام) نے کہا: سات سال پیہم محنت سے کاشت کاری کرو کیونکہ ان سات برسوں میں بارش خوب ہوگی لیکن جو فصل کاٹو اسے خوشوں سمیت انباروں کی صورت میں جمع کر لو سوائے کھانے کے لئے جو تھوڑی سی مقدار ضروری ہو (قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأْبًا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ)۔ (۱)

لیکن جان لو کہ ان سات برسوں کے بعد سات برس خشک سالی، بارش کی کمی اور سختی کے آئیں گے کہ جن میں صرف اس ذخیرے سے استفادہ کرنا ہوگا جو گزشتہ سالوں میں کیا ہوگا، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے (ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادًا يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ)۔

البتہ خیال رہے کہ خشکی اور قحط کے ان سات سالوں میں تمام ذخیرہ ہ شدہ گندم نہ کھا جانا بلکہ کچھ مقدار بیج کے طور پر آئندہ کاشت کے لئے رکھ چھوڑنا کیونکہ بعد کا سال اچھا ہوگا (إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَحْصِنُونَ)۔

اگر خشک سالی اور سختی کے یہ سال تم سوچے سمجھے پروگرام اور پلان کے تحت ایک ایک کر کے گزار لو تو پھر تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا خوب باران رحمت ہوگی اور لوگ اس آسمانی نعمت سے خوب بہرہ مند ہوں گے۔ (ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ)۔

اس سے نہ صرف زراعت اور اناج کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ رَس دار پھل اور روغن دار دانے بھی فراواں ہوں گے کہ لوگ جن سے رَس اور روغن حاصل کریں گے (وَفِيهِ يَعْصِرُونَ)۔

۱۔ ”دأب“ (بروزن ”مصر“) در اصل مسلسل چلتے رہنے کے معنی میں ہے اور مستقل عادت کے معنی میں بھی آیا ہے، لہذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ تم اپنی عادت کے مطابق زراعت کو زیاہرہ اہمیت دیتے ہو، اسے معمول کے مطابق جاری رکھو لیکن اسے ہاتھ روک کر استعمال کر، یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مراد یہ تھی جتنی ہوسکے زراعت میں محنت کرو کیونکہ ”دأب ودؤب“ خشکی و محنت کے معنی میں بھی آیا ہے یعنی اتنا کام کرو کہ تھک جاؤ۔

چند اہم نکات

## ۱۔ جچی تلی تعبیر:

حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بیان کی وہ کس قدر جچی تلی تھی۔ قدیمی کہانیوں میں گائے سال کا سنبل سمجھی جاتی تھی اور اس کا توانا ہونا فراوان نعمت کی دلیل ہے جبکہ لاغر ہونا مشکلات اور سختی کی دلیل ہے سات لاغر گائیں سات تونا گاؤں پر حملہ آور ہوئیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سختی کے سات سالوں میں قبل کے سالوں کا ذخائر سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور سات خشک شدہ خوشے جو سات سبز خوشوں سے لپٹ گئے تو یہ فراوانی نعمت اور خشک سالی کے دو مختلف ادوار کے لیے ایک اور دلیل تھی۔ اس میں اس نکتے کا اضافہ تھا کہ اناج کو خوشوں کی شکل میں ذخیرہ کیا جانا چاہیے تاکہ جلد خراب نہ ہو اور سات برس تک چل سکے۔

نیز یہ کہ لاغر گائیں اور خشک شدہ خوشے سات سات سالوں کے بعد نہ تھے یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان سخت سات سالوں کے بعد یہ کیفیت ختم ہو جائے گی اور فطری طور پر بیج کی فکر بھی کرنا چاہیے اور ذخیرے کا کچھ حصہ اس کے لیے محفوظ رکھنا چاہیے۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) در حقیقت کہ عام تعبیر خواب بیان کرنے والے شخص نہ تھے بلکہ ایک ربیر تھے کہ جو گوشہ زندان میں بیٹھے ایک ملک کے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کر رہے تھے اور انہیں کم از کم پندرہ برس کے لیے مختلف مراحل پر مشتمل ایک پلان دے رہے تھے اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ یہ تعبیر جو آئندہ کے لئے منصوبہ بندی اور رہنمائی پر مشتمل تھی نے جابر بادشاہ اور اس کے حواریوں کو ہلا کے رکھ دیا اور اہل مصر کے ہلاکت خیز قحط سے نجات مل گئی۔

## ۲۔ قدرت الہی کا عظیم مظہر:

یہ داستان ہمیں پھر یہ عظیم درس دیتی ہے کہ قدرت الہی اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ ہم سوچتے ہیں۔ خدا وہ ہے کہ جو ایک دور کے جابر حکمران کے ایک معمولی سے خواب کے ذریعے ایک بہت بڑی ملت کو ایک عظیم مصیبت سے نجات عطا کر دے اور ساتھ ہی ایک خاص بندے کو بھی سالہا سال کی مصیبت سے رہائی دے دے۔

اس سارے معاملے میں ضروری تھا کہ بادشاہ خواب دیکھے۔ وہ خواب بیان کرے تو ساقی موجود ہو اور یہ بھی کہ اسے قید خانے میں دیکھا ہوا اپنا خواب یاد آجائے اور آخر کار اہم واقعات رونما ہوں۔ خدا وہ ہے کہ جو ایک چھوٹے سے عظیم واقعات پیدا کر دیتا ہے۔ جی ہاں! ہمیں ایسے خدا سے دل باندھنا چاہیے۔

## ۳۔ علم تعبیر خواب۔ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا معجزہ:

اس سورہ میں متعدد خوابوں کا ذکر ہوا ہے حضرت یوسف (علیہ السلام) کا خواب اور فرعون مصر کا خواب۔ یہ تمام خواب اس بہت زیادہ اہمیت کی نشاندہی کرتے ہیں جو اس زمانے کے لوگ تعبیر خواب کو دیتے تھے۔ اصولاً اس زمانے میں علم تعبیر خواب زمانے کی پیش رفت کے علوم میں سے شمار ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس زمانے کے پیغمبر یعنی حضرت یوسف (علیہ السلام) اس علم میں درجہ کمال پر فائز تھے کہ جو دراصل ایک معجزہ شمار ہوتا تھا۔ کیا ایسا ہی نہیں کہ ہر پیغمبر کا معجزہ اپنے زمانے کے ترقی یافتہ ترین میں سے ہونا چاہیے تاکہ اس کے مقابلے میں اس زمانے کے علماء عاجز ہو کر یقین حاصل کریں کہ اس علم کا سرچشمہ علوم الہی ہے نہ کہ انسانی اور بشری۔

تفسیر نمونہ جلد 09

۵۰ وَقَالَ الْمَلِكُ انْتُونِي بِمِ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَيَّ رَيْكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النَّسُوءِ اللَّاتِي قَطَعْنَ أَيَدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ  
۵۱ قَالَ مَا خَطْبُكَ إِذْ رَأَوْتَنِّي يَوْسُفَ عَنْ نَفْسِهِ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ قَالَتْ امْرَأَةُ الْإِنَّا حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَأَوْتُهُ  
عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ  
۵۲ ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ

ترجمہ

- ۵۰۔ بادشاہ نے کہا: اسے میرے پاس لے آؤ لیکن جب اس کا فرستادہ اس (یوسف) کے پاس آیا تو اس نے کہا: اپنے صاحب کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا ماجرا کیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے بے شک میرے خدا نے مجھے ان کے مکر و فریب سے آگاہ کیا ہے۔
- ۵۱۔ (بادشاہ نے ان عورتوں کو بلوایا اور) کہا: جب تم نے یوسف کی اپنی طرف دعوت دی تھی تمہیں کیا معاملہ پیش آیا تھا۔ انہوں نے کہا: حاشَ لِلَّهِ! ہم نے اس میں کوئی عیب نہیں دیکھا۔ (اس موقع پر) زوجہ نے کہا: اس وقت حق آشکارا ہو گیا، وہ میں ہی تھی جس نے اسے اپنی طرف دعوت تھی اور وہ سچوں میں سے ہے۔
- ۵۲۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی ہے کہ تاکہ وہ جان لے کہ میں نے اس کی غیبت میں اس سے خیانت نہیں کی اور خدا خیانت کرنے والوں کی مکاری چلنے نہیں دیتا۔
- ۵۳۔ مجھے ہرگز اپنے نفس کی برأت کا اعلان نہیں کرنا کیونکہ (سرکش) نفس تو بدیوں پر اُکساتا ہے مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے، میرا پروردگار غفور ورحیم ہے۔

یوسف ہر الزام سے بری ہو گئے

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہ مصر کے خواب کی جو تعبیر بیان کی وہ اس قدر جچی تلی اور منطقی تھی کہ اس نے بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کو جذب کر لیا، بادشاہ نے دیکھا کہ ایک غیر معروف قیدی نے کسی مفاد کی توقع کے بغیر اس کے خواب کی مشکل بغیر کس بہترین طریقے سے بیان کر دی ہے اور ساتھ ہی آئندہ کے لئے نہایت چچا ٹلا پروگرام بھی پیش کر دیا ہے۔

اجمالاً اس نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی غلام قیدی نہیں ہے بلکہ غیر معلولی شخصیت ہے کہ جو کسی پر اسرار ماجرے کے باعث قید میں ڈالا گیا ہے لہذا اُسے اس کے دیدار کا شوق پیدا ہوا لیکن ایسا نہیں کہ سلطنت کا غرور ایک طرف رکھ کر وہ دیدار یوسف کے لئے چل پڑے بلکہ اس نے حکم دیا کہ ”اسے میرے پاس لے آؤ“ (وَقَالَ الْمَلِكُ اَنْتُوْنِي بِهٖ)۔ لیکن جب اس کا فرستادہ یوسف (علیہ السلام) کے پاس آیا تو بجائے اس کے یوسف (علیہ السلام) اس خوشی میں پھولے نہ سماتے کہ سالہا سال قید خانے کے گڑھے میں رہنے کے بعد اب نسیم آزادی چل رہی ہے، آپ (علیہ السلام) نے بادشاہ منفی جواب دیا اور کہا کہ میں اس وقت تک اس زندان سے باہر نہیں آؤنگا جب تک کہ تو اپنے مالک پاس جا کر اس سے یہ نہ پوچھے کہ وہ عورتیں جنہوں نے تیرے وزیر (مصر) کے محل میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، ان کا ماجرا کیا تھا (فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ اَرْجِعْ اِلَى رَبِّكَ فَاَسْأَلْهُ مَا بَالُ النَّسُوَةِ اللَّائِي فَطَعْنَ اَبْدِيْهِنَّ)۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسے ہی جیل سے رہا ہو جائیں اور بادشاہ کی طرف سے معافی کی رسوائی قبول کر لیں، وہ نہیں چاہتے تھے کہ آزادی کے بعد وہ بادشاہ کی طرف سے معاف کئے گئے ایک بار مجرم یا کم از کم ایک ملزم کی صورت میں زندگی بسر کریں، وہ چاہتے تھے کہ سب سے پہلے ان کی قید کے سبب کے بارے میں تحقیق ہو اور ان کی بے گناہی اور پاکدامنی پوری طرح ثبوت کو پہنچ جائے اور برأت کے بعد وہ سریلندی سے آزاد ہوں اور ضمناً حکومت مصر کی مشینری کی آلودگی بھی ثابت ہو جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کے وزیر کے دربار میں کیا گزرتی ہے۔

جی ہاں! وہ اپنے عز و شرف کو آزادی سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور یہی بے حریت پسندوں کا راستہ۔ یہ امر جاذب توجہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنی گفتگو میں اس قدر عظمت کا مظاہرہ کیا کہ یہاں تک تیار نہ ہوئے کہ مصر کی بیوی کا نام لین کہ جو ان پر الزام لگانے اور جیل بھینے کا اصلی عامل تھی بلکہ مجموعی طور پر زنان مصر کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا کہ جو اس ماجرا میں دخیل تھیں۔

اس کے بعد آپ (علیہ السلام) نے مزید کہا: اگرچہ اہل مصر نہ جانتیں اور یہاں تک دربار سلطنت بھی بے خبر ہو کہ منصوبہ کیا تھا اور کن افراد کی وجہ سے پیش آیا ”میرا پروردگار ان کے مکر و فریب اور منصوبہ سے آگاہ ہے“ (إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ)۔

شاہ کا خاص نمائندہ اس کے پاس لوٹ آیا اور یوسف (علیہ السلام) کی تجویز بیان کی۔ یہ تجویز کہ جس سے عالی ظرفی اور بلند نظری جھلکتی تھی، بادشاہ نے سنی تو وہ یوسف (علیہ السلام) کی بزرگواری سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ لہذا اس نے فوراً اس ماجرے میں شریک عورتوں کو بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوئیں تو ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: بتاؤ میں دیکھوں کہ جب تم نے یوسف (علیہ السلام) سے اپنی خواہش پورا کرنے کا تقاضا کیا تو اصل معاملہ کیا تھا (قَالَ مَا خَطْبُكُمْ اِذْ رَاوَدْتُنَّ

يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ) -

سچ کہنا ، حقیقت بیان کرنا کہ کیا تم نے اس میں کوئی عیب، تقصیر اور گناہ دیکھا ہے؟

ان کے خوابیدہ ضمیر اس سوال پر اچانک بیدار ہو گئے اور سب نے متفقہ طور پر یوسف (علیہ السلام) کی پاکدامنی کی گواہی دی اور کہا: منزہ ہے خدا، ہم نے یوسف (علیہ السلام) میں کوئی گناہ نہیں دیکھا ( فَلَنْ خَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ)۔ مصر کی بیوی وہاں موجود تھی۔ بادشاہ اور زنان مصر کی باتیں سن رہی تھی بغیر اس کے کہ کوئی اس سے سوال کرے، ضبط نہ کر سکی، اس نے محسوس کیا کہ اب وہ موقع آگیا ہے کہ ضمیر کی سالہا سال کی شرمندگی کی یوسف کی پاکیزگی اور اپنی گنہگاری کے اظہار سے تلافی کرے۔ خصوصاً جبکہ اس نے یوسف کی بے نظیر عظمت کو اس پیغام میں جو انہوں نے بادشاہ کو بھیجا تھا دیکھ لیا کہ پیغام میں انہوں نے اس کے بارے میں تھوڑی سی بات بھی نہیں کی اور اشارتاً صرف زنان مصر کے بارے میں بات کی ہے۔ اس کے اندر گویا ایک ہلچل مچ گئی وہ چیخ اٹھی: اب حق آشکار ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے خواہش پوری کرنے کا تقاضا کیا تھا، وہ سچا ہے اور میں نے اس کے بارے میں اگر کوئی بات کی ہے تو وہ جھوٹ تھی، بالکل جھوٹ تھی (قَالَتْ امْرَأَةُ الْاَلَانَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاودَتْهُ عَن نَّفْسِهِ وَاِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ)۔ زوجہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: میں نے یہ صریح اعتراف اس بناء پر کیا ہے تاکہ یوسف کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے بارے میں خیانت نہیں کی (ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّي لَمْ اُخْنِ بِالْغَيْبِ)۔

کیونکہ اتنی مدت میں اور اس سے حاصل ہونے والے تجربات کے بعد میں نے سمجھ لیا ہے کہ خدا خیانت کرنے والوں کے مکر و فریب کو چلنے نہیں دیتا (وَأَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْغٰيِبِيْنَ)۔ (اگر چہ یہ جملہ مصر کی بیوی کا ہے، جیسا کہ ظاہر عبارت کا تقاضا ہے تو) در حقیقت اس نے یوسف کی پاکیزگی اور اپنی گنہگاری کے صریح اعتراف کے لیے دو دلیلیں قائم کیں:

پہلی یہ کہ اس کا ضمیر اور احتمالاً یوسف (علیہ السلام) سے اس باقی ماندہ لگاؤ اسے اجازت نہیں دیتا کہ حق کی اب وہ اس سے زیادہ پردہ پوشی کرے اور عدم موجودگی میں اس پاکدامنی نوجوان سے خیانت کرے اور دوسری یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ اور درس عبرت حاصل کرنے کے بعد یہ حقیقت اس پر واضح ہو گئی کہ خدا پاک اور نیک لوگوں کا حامی و مددگار ہے اور کبھی بھی خیانت کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیتا اور اسی لیے محلوں کی پُر خواب زندگی کے پردے آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے اور وہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے لگی۔ خصوصاً عشق میں شکست نے اس کے افسانوی غرور پر جو ضرب لگائی اس سے اس کی نگاہ حقیقت اور کھل گئی۔ اس حالت میں تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس طرح کا صریح اعتراف کرے۔

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: میں ہرگز اپنے نفس کی برأت کا اعلان نہیں کرتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ نفس امارہ مجھے برائیوں کا حکم دیتا ہے (وَمَا اَبْرءُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَآمٰرَةٌ بِالسُّوْءِ)۔ ”مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے“ اور اس کی حفاظت اور نصرت و مدد کے باعث بچ جاؤں (اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ)۔ بہر حال اس گناہ پر میں اس سے عفو و بخشش کی امید رکھتی ہوں ”کیونکہ میرا پروردگار غفور و رحیم ہے“ (اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ)۔

بعض مفسرین نے آخری دو آیتوں کو حضرت یوسف (علیہ السلام) کی گفتگو سمجھا ہے اور کہا ہے کہ یہ دونوں آیتیں در حقیقت اس پیغام کا آخری حصہ ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے فرستادہ شخص کے ذریعے اسے بھیجا اور وہ ان آیات کا معنی یہ کرتے ہیں: اگر میں مصر کی عورتوں کے بارے میں تحقیق کا تقاضا کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ (یا اس کا وزیر عزیز مصر) جان لے کہ میں نے زوجہ عزیز کے معاملے میں اس سے کوئی خیانت نہیں کی اور خدا خیانت کرنے والوں کا مکر و فریب چلنے نہیں دیتا اس کے باوجود میں اپنی برأت کا اعلان نہیں کرتا کیونکہ نفس سرکش تو انسان کو برائی کا حکم دیتا ہے مگر یہ کہ خدا رحم کرے کیونکہ میرا پروردگار غفور و رحیم ہے۔ ظاہراً اس مخالف ظاہر تفسیر کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے زوجہ مصر کی اس قدر دانش و معرفت کو قبول نہیں کرنا چاہا کہ وہ ایسے مخلصانہ لہجے میں بات کرے کہ جو عبرت آموزی اور بیداری کی حکایت کرے، حالانکہ بعید نہیں کہ انسان کی زندگی میں جب اس کا پاؤں کسی پتھر سے ٹھوکر کھائے تو اس میں بیداری، احساس گناہ اور ندامت کی ایسی کیفیت پیدا ہو جائے۔ خصوصاً جبکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عشق مجازی میں شکست انسان پر عشق حقیقی (عشق الہی) کا راستہ کھول دیتی ہے۔

اور آج کے علم نفسیات (تصدید) کی تعبیر میں ”شدید جذبات جب ملامت سے دوچار ہوتے ہیں تو اوپر کی طرف اٹھتے ہیں اور ختم ہونے بغیر اعلیٰ ترین شکل کے بارے میں منقول ہیں وہ بھی اس عبرت آموزی اور بیداری کی دلیل ہیں“۔ علاوہ ازیں ان دو آیات کو حضرت یوسف (علیہ السلام) سے مربوط کرنا اس قدر بعید اور خلاف ظاہر ہے کہ جو کسی بھی

ادبی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ کیونکہ:  
 اولاً ”نلک“ کہ جو زوجہ ہی کی گفتگو ہے اور اسے کلام یوسف سے نتھی کرنا بہات ہی عجیب ہے کہ جو گزشتہ آیات میں  
 فاصلے پر آیا ہے۔  
 ثانیاً اگر یہ آیات کلام یوسف ہوں تو اس میں ایک طرح کا تضاد پیدا ہوگا کیونکہ ایک طرف تو یوسف کہتے ہیں کہ میں نے  
 کسر سے کوئی خیانت نہیں کی اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو بری نہیں کرتا نفس سرکش برائیوں کا  
 حکم دیتا ہے۔ ایسی بات تو وہی شخص کہہ سکتا ہے جس سے کوئی لغزش سرزد ہوئی ہو اگر چہ وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو  
 جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت یوسف سے کوئی لغزش سرزد نہیں ہوئی۔  
 ثالثاً اگر مراد یہ ہے کہ عزیز مصر جان لے کہ وہ بے گناہ ہیں تو وہ تو شروع ہی میں (شاہد کی گواہی کے بعد) اس حقیقت  
 کو جان چکا تھا اور اگر مراد یہ ہے کہ ”میں نے شاہ سے خیانت نہیں کی“ تو اس معاملے کا شاہ سے کوئی رابطہ نہیں تھا  
 اور یہ عذر پیش کرنا کہ وزیر کی بیوی سے خیانت جابر بادشاہ سے خیانت ہے تو ایک کمزور اور مہمل عذر معلوم ہوتا  
 ہے خصوصاً جبکہ درباری لوگ عام طور پر ان مسائل کی پابندی نہیں کرتے۔  
 خلاصہ یہ کہ آیات کا ربط نشاندہی کرتا ہے کہ یہ تمام باتیں مصر کی بیوی نے ہی کی تھیں کہ جو کچھ عبرت حاصل کر چکی  
 تھی اور تھوڑی بہت بیدار ہو چکی تھی لہذا اس نے ان حقائق کا اعتراف کر لیا۔

چند اہم نکات

۱۔ پاکیزگی اور دشمن کا اعتراف:

واقعہ یوسف کے اس حصے میں ہم نے دیکھا ہے کہ آخر کار ان کے بب سے بڑے دشمن نے ان کی پاکیزگی کا اعتراف  
 کر لیا اور اپنی گنہگاری اور ان کی بیگناہی کا بھی اعتراف کر لیا۔ یہ ہے تقویٰ، پاکبازی اور گناہ سے پرہیز کا انجام اور یہ  
 ہے اس فرمان کا مفہوم کہ:

جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے خدا اس کے لیے راہ کشائش کھول دیتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے کہ جہاں سے  
 اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔ (طلاق۔ ۲-۳)  
 یعنی۔ تو پاک رہ اور پاکیزگی کی راہ اختیار کر، استقامت دکھا، خدا اجازت نہیں دے گا کہ نا پاک لوگ تیری حیثیت کو  
 برباد کر سکیں۔

۲۔ کبھی شکست بھی بیداری کا سبب بن جاتی ہے:

کبھی ناکامیاں بھی بیداری کا سبب بن جاتی ہیں بلکہ بہت سے مواقع پر ظاہراً شکست ہوتی ہے لیکن در حقیقت وہ ایک طرح  
 کی معنوی کامیابی شمار ہوتی ہے۔ ایسی ہی ناکامیاں انسان کی بیداری کا سبب بن جاتی ہیں اور غرور و غفلت کے پردوں  
 کو چاک کر دیتی ہیں اور انسان کی زندگی میں احساس کی بیداری کی بنیاد بن جاتی ہیں۔  
 مصر می بیوی (کہ جس کا نام ”زلیخا“ یا ”راعیل“ تھا) اگر چہ اپنے معاملے میں بدترین ناکامیوں میں مبتلا ہوئی لیکن گناہ  
 کے اس راستے پر اس کی یہ ناکامیاں اس کے متنبہ اور بیدار ہونے کا باعث بن گئیں۔ اس کا خوابیدہ ضمیر بیدار ہو گیا اور  
 وہ اپنے برے کردار پر پشیمان ہوئی اور اس نے درگاہ الہی کی طرف رخ کر لیا۔ احادیث میں جو واقعہ حضرت یوسف (علیہ  
 السلام) سے اس کی ملاقات کے بارے میں ہے، جبکہ یوسف مصر ہو گئے، وہ بھی اس دعویٰ کی دلیل ہے۔ لکھا ہے کہ  
 زلیخا نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی طرف روئے سخن کر کے کہا:  
 الحمد لله الذی جعل البعید ملوکاً بطاعتہ و جعل الملوک عبیداً بمعصیتہ  
 ”حمد ہے اس خدا کی جس نے غلاموں کو اپنی اطاعت کی بنا پر بادشاہ بنادیا اور بادشاہوں کو اپنی نافرمانی کے باعث غلام  
 بنادیا۔“

اس حدیث کے آخر میں ہے کہ آخر کار حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ (۱)  
 وہ لوگ خوش بخت ہیں جو ناکامیوں سے فتح حاصل کر لیتے ہیں اور اپنے اشتباہات اور غلطیوں سے زندگی کی صحیح راہ  
 تلاش کر لیتے ہیں اور سیاہ بختیوں میں نیک بختی کو پالتے ہیں۔  
 البتہ سب لوگ شکست پر ایسے رد عمل کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ کم ظرف لوگ شکست کے موقع پر یاس و ناامیدی کی اتھاہ  
 گہرائیوں میں جا پڑتے ہیں اور بعض اوقات وہ خودکشی تک جا پہنچتے ہیں جو کہ کامل شکست ہے لیکن وہ لوگ کہ جو

کچھ ظرف کے حامل ہوتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ ناکامی کو اپنی کامیابی کا زینہ قرار دیں۔

۳۔ شرفِ انسانی ظاہری آزادی سے بہتر ہے:

ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نہ صرف اپنی پاکدامنی کی حفاظت کے لیے قید خانے میں گئے بلکہ اعلانِ آزادی کے بعد بھی قید خانہ چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے یہاں تک کہ بادشاہ کا نمائندہ خالی ہاتھ لوٹ گیا اس لیے کہ پہلے مصر کی عورتوں سے یوسف کے بارے میں کافی تحقیق کی جائے اور اس کے بے گناہی ثابت ہو جائے تاکہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ قید خانے سے آزاد ہوں نہ کہ ایک آلودہ مجرم، بے حیثیت انسان اور شاہ کے معاف کیے ہوئے شخص کے طور پر کہ جو خود ایک عظیم ننگ و عار ہے۔ اور یہ تمام گزشتہ، آج کے اور کل کے انسانوں کے لیے ایک عظیم درس ہے۔

۴۔ نفسِ سرکش:

علماء اخلاق نے نفس (انسانی جذبات، میلانات اور احساسات) کو تین مراحل میں تقسیم کیا ہے کہ جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔

پہلا ”نفسِ امارہ“، نفسِ سرکش ہے کہ جو انسان کو گناہ کی ترغیب دیتا ہے اور اسے ہر طرف کھینچتا ہے اس لیے اسے ”امارہ“ کہتے ہیں۔ اس مرحلے میں ابھی عقل و ایمان اتنا قوی نہیں ہوتا کہ نفسِ سرکش کو لگام دے سکے بلکہ اکثر اوقات اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے یا اس سے دست و گریبان ہو تو نفسِ سرکش اسے پٹخ دیتا ہے اور شکست دے دیتا ہے۔

اسی مرحلے کی طرف مذکورہ بالا آیات میں زوجہ مصر کی گفتگو میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہی انسان کی تمام تر بدبختیوں کا سرچشمہ ہے۔

دوسرا ”نفسِ لوامہ“ ہے۔ اس مرحلے پر انسان تعلیم و تربیت اور مجاہدہ سے پہنچتا ہے۔ اس مرحلے میں ہو سکتا ہے انسان بعض اوقات غرائز اور جذبات کے طغیان کے نتیجے میں غلیظیوں اور گناہوں کا مرتکب ہو لیکن فوراً پشیمان ہوجاتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت شروع کر دیتا ہے اور اس طرح ممکن ہے وہ گناہ کی تلافی کا عزم کرے اور قلب و روح کو آپ توبہ سے پاک کر لے۔ دوسرے لفظوں میں عقل اور نفس کے مقابلے میں کبھی عقل کامیاب ہوجاتی ہے اور کبھی نفس۔ بہر حال عقل و ایمان کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔

البتہ اس مرحلے تک پہنچنے کے لیے جہادِ اکبر ضروری ہے۔ اس مرحلے میں کافی ریاضت، مکتبِ استاد میں تربیت، ارشادِ الہی اور سنتِ ائمہ سے الہام لینا لازمی ہے۔

اس مرحلے کی قرآن مجید نے سورہ قیامت میں قسم کھائی ہے کہ جو اس کی عظمت کی دلیل ہے:

قسم ہے روز قیامت کی اور سرزنش کرنے والے نفس کی۔

تیسرا ”نفسِ مطمئنہ“ ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جس تک انسان قلب و روح کی صفائی، تہذیب اور کامل تربیت کے بعد پہنچتا ہے۔ اس میں سرکش غرائز رام ہوجاتے ہیں اور ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور عقل و ایمان کے مقابلے کی تب نہیں رکھتیں۔ یہی سکون و اطمینان کا مرحلہ ہے ایسا سکون و اطمینان کہ جو عظیم بحرِ اوقیانوس پر حکومت کرتا ہے وہ سمندر کہ سخت طافانوں پر بھی جن کی جبین پر شکن نہیں پڑتی۔

یہ انبیاء اولیاء اور ان کے سچے پیروکاروں کا مقام ہے۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے مردانِ خدا کے مکتب میں ایمان و تقویٰ کا درس حاصل کیا ہے، سالہا سال تہذیبِ نفس کی ہے اور جہادِ اکبر کے آخری مرحلے تک آپہنچے ہیں۔ اسی مرحلے کی طرف قرآن مجید نے سورہ فجر میں اشارہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اے مطمئن و باسکون نفس اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ کہ تو بھی اس سے خوش اور وہ بھی تجھ سے راضی ہے اور میرے خاص بندوں کے زمرے میں داخل ہوجا اور میری جنت میں قدم رکھ۔

پروردگار! ہماری مدد فرما کہ ہم تیرے قرآن کی نورانی آیات کے زیر سایہ ”نفسِ امارہ“ سے ”نفسِ لوامہ“ اور اس سے ”نفسِ مطمئنہ“ کی طرف ارتقا کریں۔ اور ایک مطمئن اور پر سکون روح پیدا کریں کہ جسے طوفانِ حوادث متزلزل و مضطرب نہ کرسکے اور ہم دشمنوں کے مقابلے میں قوی تر ہوں، دنیا کی رنگینیوں سے بے اعتناء ہوں اور سختیوں میں صابر و بردبار ہوں۔



بار الہا اب جبکہ ہمارے اسلامی انقلاب کو ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ گزر رہا ہے متاسفانہ ہمارے فوجیوں میں اختلاف کی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہیں۔ ایسی نشانیاں کہ جنہوں نے اسلام کے تمام شیدائیوں، انقلاب کے فدائیوں اور شہداء کے خون کے پاسداروں کو پریشان کر رکھا ہے۔ (2)

خداوندا! ہم سب کو ایسی عقل عطا فرما کہ ہم سرکش ہوا وپوس پر کامیاب ہوں اور اگر ہم غلطی پر ہیں تو توفیق و ہدایت کے روشن چراغ سے ہماری راہ کو منور فرما۔  
الہی! ہم نے یہاں تک کا راستہ اپنے قدموں سے طے نہیں کیا بلکہ ہر مرحلے میں تمہارا رہبر و رہنما تھا۔ اپنا لطف و کرم ہم سے دور کر اور اگر تیری ان سب نعمتوں کی ناشکری تیری سزا کے استحقاق کا موجب بنی ہے تو اس سے پہلے کہ ہم سزا و عذاب میں گرفتار ہوں، ہمیں بیدار فرما۔

آمین یا رب العالمین

.....

۱۔ سفینہ، ج ۱، ص ۵۵۴

2۔ فوج میں جس اختلاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ سابق صدر ایران بنی صدر کا پیدا کردہ تھا جو اس کی معزولی کے بعد دور ہو گیا۔ (مترجم)